یا علیؑ یا عظیمؑ

شیران مضامیں کو کہاں بند کروں | کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلّاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن | کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

حیاتِ دبیرؒ

مسمّے باسم تاریخی

۱۳ ھ ۳۰

سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ

مؤلفہ

جناب سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اہل کار دربار کوٹہ (راجپوتانہ)

جس کو

مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب لاہور لوہاری منڈی سے ۱۹۱۳ء میں

مطبع سٹیوک سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

قیمت فی جلد .... ڈمی کاغذ ۳ .... سیرامپوری ۱۲

میں اپنی اِس ناچیز تالیف کو محسن اہل کمال

حامی علومِ و فنون عالی جناب مسٹر نواب حامد علی خاں

صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دامِ اقبالہ کے

نام نامی پر اُن کی اجازت سے لے کر معنون کرتا ہوں +

مؤلف حقیر ثابت

۲ ماہ رمضان سنہ ۱۳۳۰ھ

مطابق ۱۶ اگست سنہ ۱۹۱۲ع

مقام ریاست کوٹہ (راجپوتانہ)

یا علیُّ یا عظیمُ

شیران مضامیں کو کہاں بند کروں | کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلّاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن | کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

حیات دبیرؒ

اسم تاریخی سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ
۱۳۳۰ھ

یعنی

خلاق معانی فرزدق ثانی ہمسر و ہم عصر قاآنی ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ جامع کمالات حضرت میرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم مشہور مرثیہ گو کی مفصّل سوانح عمری اور اُن کے زمانے میں گلزار لکھنؤ کا علم و فضل کی آبیاری سے سر سبز ہونا اُن کا فطری شاعر اور جمیع اصناف سخن پر قادر و کامل ہونا اُن کی غیر معمولی طبّاعی و حافظہ و اخلاقی فضائل کے حالات اور ہندوستان کے مستند علما و شعرا و اہل کمال کی محققانہ رایوں کا اقتباس اور عرب و فارس و ہند کے بعض مستند و مشہور شعرا کے کلام سے اُن کے کلام کا مقابلہ اور ایک محققانہ علمی مضمون عالیجناب مسٹر حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ کا جس میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کے طرز کلام سے مرزا صاحب کے رنگ کلام کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اُن کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام سے مختلف اقسام کے نمونے اور اُنکی قلمی تحریر کا عکس اور اُن کے صدہا تلامذہ کے مختصر حالات و مختصر نمونہ کلام اور بعض اہل کمال کے (کتاب پر) ریویوز (تقریظیں) اور تاریخیں

مؤلفہ

جناب سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اہل کار دربار کوٹہ (راجپوتانہ)

جس کو

مولوی غلام عبّاس صاحب تاجر کتب لاہور لوہاری منڈی نے فاضل مؤلف کی اجازت سے پہلی مرتبہ مطبع سیوک سٹیم پریس لاہور میں باہتمام ماسٹر آتما رام مالک چھپوا کر شایع کیا

تعداد جلد ۱۰۰۰ ۱۳۳۱ھ قیمت فی جلد ... کاغذ ... سیر امپیری ...

فہرست مضامین دیباچہ حیات دبیرؒ موسُوم باسم تاریخی

۱۳۰۳
سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ

فہرست مضامین کتاب حیات دبیرؒ

نمبر جلد	نمبر مرثیہ	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۸	۱	۳۰۵ تا ۳۲۶	تفصیح و سلیس کلام دبیر رح - نمبر ۱ تا ۱۶ - تلوار کے ہاتھ صفائی کے ساتھ - دو پہلوانوں سے لڑائی - ہیبت و اضطرار - جناب سیدہؑ کا حضور صلعم کے سوگ میں جو حال تھا اُس کا مرقع - کمال غم کی تصویر ہے - جگر خراش بین - امام حسین کا ہتیار باندھنا - تصویر واقعہ تاج - حضرت عباسؑ علم لے کر خیمہ سے نکلتے ہیں - قتل پسران مسلمؑ - بدحواسی لشکر کی تصویر - عمر سعد کا جاسوس سے حال امام حسینؑ پوچھنا - دس سوالوں کا جواب ایک مصرع میں - فوج یزید کی طیاری جنگ - لشکر امام حسینؑ کا رن پر چڑھنا - علی اکبرؑ کی مرگ شباب - علی اصغرؑ جھولے میں بے ہوش - ننھے بچوں کی پیاری عادتیں - ماں کی مامتا اور وہم - رخصت علی اصغرؑ - علی اصغرؑ کی شہادت کی تصویر -
۸	۲	۳۲۷ تا ۳۴۸	نمبر ۱۷ تا ۵۴ - حضرت عباسؑ کی تلوار کے وار - عون و محمدؑ کی بہادرانہ موت کی تصویر - شمر دو علم لیکر عون و محمدؑ کے بہکانے کو آتا ہے - زعفر جن - لاشہ امام حسینؑ - امام حسینؑ کا پیدا ہونا - حضور صلعم کا زبان چسانا - امام حسینؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لاتے ہیں - علی اکبرؑ کے بعد گھر کی پریشانی - بین - جنگ احد میں خبر قتل حضور صلعم مشہور ہونا - دعبل مداح کا انجام بخیر - یزید کا جاہلانہ فخر - خدا کی شان - امام حسینؑ کے ساتھ ایک ۴ سالہ لڑکی خیمہ سے نکلی - امام حسینؑ کا جوان فرزند کی لاش اٹھانے کو جانا - نثر سے زیادہ سلیس نظم - نئی شان کا سراپا - مناجات امام حسینؑ - مصائب پنجتن پاک - ماں قیدخانہ میں علی اصغرؑ کو یاد کرتی ہیں - حسنینؑ کے پاس پوشاک نہیں -

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العلمین - والصلوٰۃ والسلام علی محمد خاتم النبیین وتمام عدۃ المرسلین وعلی الہ الطیبین الطاہرین - واصحابہ المنتجبین[1] +

ناظرین حیات دبیر!! (۱) دبیر کون بزرگوار تھے؟ (۲) اور کتاب حیات دبیر کیا چیز ہے؟

ان دونوں سوالوں کا جواب شافی تو یہ کتاب (خود زبان حال سے) دیگی - مَیں آپ سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مَیں نے یہ کتاب کیوں اور کیونکر لکھی - اسی کے ضمن میں شاید سوالات نمبر ۱ و ۲ کا بھی کچھ جواب مل جائے +

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا - کہ شعر و سخن سے میری طبیعت کو ابتدا ہی سے لگاؤ تھا[2] - اور اس کے ساتھ ہی بچپن ہی سے مرثیہ پڑھنے کا شوق ہوا - اکثر حکیم کا بیٹا حکیم اور عالم کا لخت جگر عالم اور کاریگر کا فرزند کاریگر ہوتا ہے - مَیں نے آنکھ کھول کر اپنے نانا میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی مرحوم کو مرثیہ پڑھتے ہوئے دیکھا - مَیں اِدھر مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں مولوی میر صفدر شاہ صاحب مرحوم سے اردو و فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا - اُدھر فرصت کے وقت نانا مرحوم مجھ کو مرثیہ پڑھنا سکھاتے تھے - مَیں جب عروض تو خاک نہیں جانتا تھا - مگر جو مصرع ناموزوں ہوتا تھا - وہ خود بخود دل پر کھٹک جاتا تھا - البتہ عین یاہ ایسے حروف گرنے کی مجھے خبر نہ ہوتی تھی +

نانا مرحوم مرزا دبیر مغفور کے شاگرد رشید تھے - بارہ تیرہ برس کی عمر سے اُن کے شاگرد ہوئے -

---

[1] یہ کلمات تبرکاً دعائے صحیفہ کاملہ (یوم الثلثاء) سے اخذ کئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] ۱۵ رجب سنہ ۱۲۷۸ ہجری روز جمعہ کی میری پیدائش ہے - نظیر حسن تاریخی نام ہے - عروض و قافیہ سے بھی میرا سال ولادت نکلتا ہے - یہ قدرتی شعر و سخن کے تعلق طبعی کا شاعرانہ استدلال و ثبوت ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

اور ہمیشہ ہر بڑی مجلس اور ہر معرکے میں اُن کے ساتھ رہے - وہ گویا مرزا صاحب کی زندہ تاریخ تھے - اور مرزا صاحب کے گویا مددگار تھے - اسی مناسبت سے مرزا صاحب نے اُن کا تخلص ظہیر (مددگار) رکھا تھا +

اگرچہ اُن کے والد ماجد میر فتح علی مرحوم زمانہ شاہی (لکھنؤ) میں رسالدار اور وہ خود نائب رسالدار تھے - مگر مرثیہ پڑھنے کا اُن کو ایسا شوق تھا - کہ عمر بھر گویا یہی کام کیا کئے +

مجھے اُنہوں نے دس برس کی عمر میں ہی جب میں غلط سلط اردو لکھ اور پڑھ لیتا تھا - مرثیہ پڑھنا سکھایا اُنہوں نے میر ضمیر مرحوم (جو مرثیہ میں اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کے بھی موجد تھے اور جن کو اُنہوں نے برسوں خوب سُنا تھا) کے طرز مرثیہ خوانی میں کچھ تبدیلیں کر کے ایک طرز خاص بنانے کا ایجاد کیا تھا - اگرچہ وہ سلام اکثر اور مرثیہ کمتر کہتے بھی تھے - مگر خاص کر مرثیہ پڑھنے پر (اُنہوں نے) سخت محنت کی تھی - اکثر خود فرمایا کرتے تھے - کہ میرے ساتھ کے پڑھنے والوں میں فقط ایک میر شرف الدین مرحوم تھے - جو محض بین ۱۵ حد ۲۵ بند مجلس میں پڑھتے تھے - اور بین لاجواب پڑھتے تھے - سراپا - لڑائی وغیرہ وہ نہیں پڑھتے تھے - اور میں ان سب مقامات (مرثیہ) کو پڑھتا تھا - میرے بعد کے (مرزا صاحب کے) شاگردوں میں میرزا مُغل مرحوم اچھے پڑھنے والے تھے - جنہوں نے میرے طرز کی پیروی کی - اور خوب خوب پڑھے - خود مرزا صاحب کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کی تعلیم نہیں دیتے تھے - اس لئے اس خاندان میں جو کوئی شاگرد ہوتا تھا - وہ انہیں کے پاس مرثیہ پڑھنے کو آتا تھا - اور وہ سکھاتے تھے - خود ہر روز تنہائی میں ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھتے تھے - بعض مصرع کو بیس بیس مرتبہ مختلف طرز - اُتار چڑھاؤ سے پڑھتے تھے - جب جا کر اُن کو اطمینان ہوتا تھا - اور شاگردوں کو سامنے بٹھلا کر سکھاتے تھے +

المختصر چند روز مشق کے بعد اُن کی پیش خوانی میں (مجالس عزا میں) میں نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا - مگر اُسی مجلس میں جاتا تھا - جو میرے درس کے وقت نہ ہوتی تھی - نانا مرحوم کے ہمرکاب اُن مجلسوں میں بھی اکثر جاتا تھا - جن میں جناب مرزا صاحب یا جناب میر صاحب یا میر مونس مرحوم یا میر انس مغفور یا آغا عشق میر دریا اور کوئی اعلےٰ درجہ کا ذاکر پڑھتا تھا - کہ نانا مرحوم اور ان سب صاحب کمالوں سے بھی راہ و رسم و محبت تھی - اثنائے مرثیہ خوانی میں یہ سب صاحب اُن کی طرف (خاص طور پر) متوجہ اور اُن سے

طالب داد ہوتے تھے۔ اس سبب سے ہر کامل کو سننے کا مجھے اچھا موقع ملتا تھا+ (مَیں نے علاوہ مدرسہ ایمانیہ کے (بعد کو) بعض علمائے فرنگی محل (مولوی امان الحق صاحب و مولوی لمعان الحق صاحب) اور مولوی آقا محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد و محدث لکھنؤ اور مولوی سیّد علی نقی صاحب داعی پوری مرحوم مدرس کیننگ کالج سے بھی کچھ پڑھا) یہاں تک کہ سنہ ۱۲۹۱ھ و سنہ ۱۲۹۲ھ میں میر و مرزا نے (تین چار مہینے کے اندر اندر) انتقال فرمایا۔ میری عمر اُس وقت چودہ ۱۴ برس کی تھی۔ اب اُدھر میر نفیس مرحوم اِدھر جناب مرزا اوج مدظلہ کے پڑھنے کی دھوم دھام کی مجلسیں شروع ہوئیں۔ کبھی کبھی جناب میر انس و میر مونس و میر عشق مرحومین بھی پڑھتے تھے۔ کربلائے معلّے سے جناب تعشق مغفور نے بھی آکر پڑھنا شروع کیا۔ اُن کو بھی سُنا۔ جناب میر وحید (مرحوم) نے بھی خوب خوب مرثئے کہے اور پڑھے +

اِدھر ٹکسال (لکھنؤ) میں سیر محمد صاحب سلیس مرحوم نے کچھ مجلسوں میں میر انیس صاحب کے بعض محفوظ وغیر تعیمی مرثئے پڑھنا شروع کئے۔ ان کے پڑھنے میں، صورت میں، آواز میں میر صاحب کی مشابہت تامّہ تھی۔ اور خوب پڑھتے تھے +

بہر حال اِن تمام اہل کمال کو مَیں سُنتا تھا۔ اور اِن رنگا رنگ خوشبودار پھولوں کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہُوا جاتا تھا۔ اور موت گویا زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ (المؤلف) ؎

بہت رنگ و بو پہ نہ اتراؤ پھولو   نہیں دیر لگتی خزاں آتے آتے

چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ سر سبز گلزار لکھنؤ میں یکا یک پت جھڑ شروع ہُوئی۔ اور بجز حضرت اوج مدظلہ کے آگے پیچھے یہ سب بزرگوار باغ جنت میں چل بسے۔ خدا جناب ممدوح کو سلامت رکھے۔ کہ اب ان کا دم بہت غنیمت ہے +

مَیں سنہ ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ سے بھرت پور میں پہنچا۔ یہاں سے محسن اہل علم عالم علوم مشرقی و مغربی حاجی ڈپٹی سیّد جعفر حسین صاحب جعفری پہرسری (اللندنی) دام مجدہ و اقبالہ کے ہمرکاب کوٹہ آیا۔ اور جناب ممدوح کی وجہ سے ریاست میں نوکر ہُوا۔ جس سلسلہ کا اب تک پابند ہُوں + سنہ ۱۸۸۸ء سے مَیں نے مستقل طور پر غزل کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور جب پیام یار وغیرہ کسی گلدستہ میں غزل بھیجتا تھا۔ تو

مؤلف اور ریاست کوٹہ

جناب منشی امیر مینائی

جناب منشی امیر مینائی کی خدمت عالی میں بھجوا دیتا تھا۔ بعض ابتدائی غزلیں اُن کی نظر سے گذریں اور اصلاح کے بعد چھپیں۔ ادھر جو سلام وغیرہ کہے۔ وہ جناب مرزا اوج مدظلہ کو دکھائے۔ عروض میں اپنے طور پر کتابیں دیکھ دیکھ کر کچھ مہارت پیدا کرلی۔ اور پھر جب (۱۸۹۳ء میں) عتبات عالیات (کربلا و نجف وغیرہ) کی زیارت سے مشرف ہُوا۔ تو اُن پاک زمینوں کے اثر سے مسلسل مرثئے کہنا شروع کئے۔ الحمدللہ کہ اب ایک معقول ذخیرہ مرثیوں کا ہوگیا ہے۔ جس کی ایک جلد چھپ سکتی ہے۔ اسی کو مَیں توشۂ آخرت سمجھتا ہُوں۔ ابتدا میں جب مَیں غزل و سلام کہتا تھا اور مرثیہ پڑھتا تھا۔ اور غور کرتا تھا۔ تو غزل سے مرثیہ گوئی کو بہت زیادہ مشکل پاتا تھا۔ دل میں سوچتا تھا۔ کہ یا اللہ یہ مرثیہ گویوں نے کیا قصور کیا ہے۔ جو تذکرہ لکھنے والے ان کے حالات و کلام یا تو لکھتے ہی نہیں۔ یا لکھتے ہیں تو برائے نام۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا ہے۔ جو کوئی کہہ سکے۔ کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے"۔ آخر بر وفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات دیکھا۔ سبحان اللہ۔ آزاد کی نثر۔ اور اُس کا حسن بیان۔ اور پھر دہلی کی ٹکسالی زبان دل نے مزے اُٹھائے۔ (لمؤلفہ) ؎

آب حیات و جناب آزاد مرحوم

حق یہ ہے نثر لکھنے میں آزاد فرد تھا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت آزاد نے خیر اور مرثیہ گویوں ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر وغیرہم کا ذکر خیر تو بالاجمال کیا تھا۔ لیکن دبیرؔ و انیسؔ کے حالات ذرا شرح و بسط سے لکھے تھے۔ مگر آب حیات میں حالات میرزا صاحب کو جو دیکھا۔ تو اکثر خلاف واقع پایا۔ گو بعض اہل دہلی مقیم کوٹہ (میر محبوب علی مرحوم سابق سررشتہ دار جسٹس بیٹی آبو وغیرہ) کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء اپنے گھر کی مجلسوں میں جناب آزاد مرحوم جناب میر صاحب ہی کے مرثئے پڑھا کرتے تھے۔ مگر آزاد ایسے آزاد خیال بزرگ سے ہرگز یہ اُمید نہیں ہوسکتی تھی۔ کہ وہ جان بوجھ کر میر صاحب کے طرفدار ہونیکے سبب سے مرزا صاحب کے حالات بھی غلط لکھیں۔ آخر اہل علم ہیں۔ دل میں سوچا۔ کہ اس میں کوئی لم ہے۔ حضرت آزاد (مرحوم) کو مَیں نے کوٹہ سے خط لکھ کر آگاہ کیا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے جو حالات مَیں نے بزرگوں (اہل لکھنؤ) سے سُنے ہیں (کہ جن میں سے بعض حضرات ابتک زندہ ہیں)۔ اکثر یہ حالات مندرجہ آب حیات اُن کے بالکل برخلاف۔ اور اس لئے

غلط ہیں - اُن مرحوم نے مجھے جواب دیا - کہ جن صاحب سے حالات دبیرؔ کو خط لکھ کر میں نے پُوچھا - اُنھوں نے (اہل لکھنؤ وغیرہ میں سے) کوئی جواب ہی نہیں دیا - خیر غزل گو شعرا کے تو کچھ حالات ملک سے ملے بھی مگر مرثیہ گویوں کا تو کوئی حال ہی نہیں بتاتا - میں نے جو کچھ سُنا - لکھ دیا - مگر مجھے اس کی صحت پر نہ بھروسہ ہے نہ اصرار - تم صحیح حالات لکھ بھیجو - میں شکریہ کے ساتھ آئندہ (ایڈیشن میں) چھپنے پر وہ حالات لکھ دونگا -
اب میں اس فکر میں تھا - کہ رخصت لیکر لکھنؤ جاؤں - تو معمر آدمیوں سے مزید صحت کر کے صحیح حالات جناب آزاد کو لکھ بھیجوں - اُس زمانے میں کوٹہ سے ریل سو میل سے زیادہ دور تھی - برسوں کے بعد جانا ہوتا تھا - کئی برس کے بعد جو میں لکھنؤ گیا - تو معلوم ہؤا - کہ حضرت آزاد اب آزاد نہیں رہے - پابند جنون ہو گئے -
ادھر خود جناب نانا صاحب (مرحوم) نے ایک مختصر رسالہ (تنقید آب حیات) چھپوا کر ملک میں مشتہر کر دیا تھا - میں نے دل میں سوچا - کہ یہ کام تو خیر ہو گیا - مگر آزاد مرحوم نے آب حیات میں تمام مرثیہ گویوں کے حالات نہیں لکھے - اور میرؔ و مرزاؔ - کے معاصرین اور بعد کے شعراء اہل بیتؑ کا تو گویا نام ہی نہیں ہے - لاؤ تم ایک تذکرہ مرثیہ گویوں کا لکھ ڈالو - لکھنؤ میں کچھ لوگوں کے حالات بزرگوں سے دریافت کر کے لکھ بھی لئے اور جو مرثیہ گو زندہ تھے - اُن سے حالات ملنے کی کوشش کی - بعض اخباروں میں خطوط بھی بھیجے - اکثر نے تو اس کو صدائے بے ہنگام سمجھ کر جواب ہی نہ دیا (چھاپنا تو درکنار) - بعض نے اُس کو اشتہارات کے ذیل میں قرار دیکر دام مانگے - بعض نے چھپوا بھی دیا - مگر پھر بھی کسی نے حالات یا منتخب کلام کسی کا (بجز دو تین صاحبوں کے) نہیں بھیجا - میں بھی "عرفت ربّی بفسخ العزائم"* پڑھ کر چپ ہو گیا - جو مصالح اُس وقت فراہم کیا تھا - وہ یُونہی پڑا رہا - مگر جب کبھی کوئی اس قسم کی کتاب (جس میں مرثیہ گویوں کا کچھ تذکرہ ہوتا تھا) یا کسی شاعر کی لائف دیکھتا تھا - دل میں جوش سا اُٹھتا تھا - کہ مرثیہ گو شاعروں کے کمال سے ملک کو آگاہ کیا جائے - پھر سوڈا واٹر کی طرح وہ جوش فرو ہو جاتا تھا - یہاں تک کہ شمس العلما جناب مولوی شبلی صاحب کی کتاب موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ کا میں نے نام سُنا - دل میں کہا - نام تو بہت موزوں ہے - غالباً کتاب بھی ایسی ہی ہو گی - کچھ عرصے کے

---

* میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا - یہ ارشاد جناب امیرؑ کا ہے - پورا جملہ نہج البلاغہ میں یوں ہے عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَحَلِّ الْعُقُوْدِ - میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے اور عقدوں کے کھلنے سے پہچان لیا ۱۲ مؤلف حقیر

بعد کتاب جو دیکھی۔ تو حیران رہ گیا۔ بہت افسوس ہُوا۔ کہ ایسے مشہور بزرگ اور ایسی ایسی غلط سلط باتیں لکھیں
اب دل نے کہا۔ کہ تھوڑا تھوڑا اسی کتاب کا جواب بطور ریویو (تقریظ) لکھو۔ اور کچھ لکھا بھی۔ مگر پھر لکھنؤ کے
بعض خطوط سے معلوم ہُوا۔ کہ لکھنؤ میں ہی اور بعض شعرا موازنہ کی رد لکھ رہے ہیں۔ مَیں یہ شعر پڑھ کر چپ ہو گیا۔

چو کائے بے فضول من بر آید   مرا در وے سخن گفتن نشاید

اُسی دوران میں بعض احباب نے اصرار فرمایا۔ کہ جناب مرزا صاحب مرحوم کی تو سوانح عمری (لائف) لکھ۔
میر صاحب کے حالات میں تو خیر "حیات انیس" "واقعات انیس" کچھ لکھی بھی گئیں۔ لیکن ادھر بالکل صفر ہے۔
مَیں نے حامی بھر لی۔ کہ دل چاہ رہا تھا۔ شمس الضحیٰ (فارسی) مرزا صاحب کے حالات میں ایک پرانی کتاب شاہی
زمانے کی مولوی میر صفدر حسین صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی مطبوعہ میرے پاس تھی۔ مگر وہ کوئی دوست نما راہزن
ایسے لے گئے تھے۔ کہ رسید بھی نہ دی تھی۔ پھر شمس الضحیٰ دوبارہ لکھنؤ سے منگوائی۔ اور جو حالات تذکرہ
مرثیہ گویاں کی شروع ترتیب کے وقت لکھ رہے تھے۔ اُن کو نکالا۔ ادھر جو جو کتابیں ردّ الموازنہ میر
افضل علی صاحب ضو سلمہ اللہ و تردید موازنہ مؤلفہ جناب شیخ محمد جان صاحب عروج فیض آبادی و حیات انیس
و واقعات انیس و ردّ واقعات انیس اور بعض اخبار اور پرچے نکلتے گئے۔ وہ سب منگائے۔ بہت سی
کتابیں منگائیں (کہ یہاں کوٹہ میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں) تین مرتبہ رخصت لے کر لکھنؤ گیا۔ وہاں
لوگوں سے حالات پوچھے۔ سیکڑوں اصحاب و احباب کو خطوط لکھے۔ اخباروں کو جدا خط لکھے۔ اور یہ سب
اِس لئے کیا۔ کہ مرزا صاحب کی عکسی یا قلمی تصویر اور زیادہ حال اور اُن کے شاگردوں کے کچھ حالات و
کلام ملے۔ مگر اکثر اخبار کے اڈیٹروں نے تو جواب ہی نہ دیا۔ بعض نے اُس کو تجارتی اشتہار قرار دے کر
اُجرت مانگی۔ ہاں اڈیٹر صاحب اثنا عشری نے اس کو پبلک (خلائق) کا کام سمجھ کر چھپوا دیا۔ جن کا
مَیں شکر گذار ہوں۔ پھر مَیں اس فکر میں ہوا۔ کہ کوئی صاحب وجاہت (بزرگ قوم) اخباروں میں خطوط
چھپوائیں۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ اہل علم و کمال کے دلی خیر خواہ بلکہ ہمدرد مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب
بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ نے ایک جلسہ لکھنؤ میں یہ کلمہ فرمایا۔ کہ میری سب تمنائیں پوری
ہو گئیں۔ مگر ایک حسرت یہ رہی جاتی ہے۔ کہ جناب مرزا صاحب کی لائف میری زندگی میں نہیں

لکھی گئی۔ میں نے کوٹہ سے اُن کی خدمت عالی میں عریضہ بھیجا۔ کہ میں آپ سے فقط اتنی مدد چاہتا ہوں۔ کہ آپ مرزا صاحب کی تصویر لکھنؤ اور پٹنہ عظیم آباد و کلکتہ وغیرہ میں تلاش فرمائیں۔ قیمت میں دونگا۔ اور اس کی کوشش فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم کے کچھ اور حالات اور اُن کے شاگردوں کا کچھ کلام و حال مل جائے۔ جناب ممدوح نے اس مقصد کے واسطے کوشش بلیغ فرمائی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مشہور اردو اخباروں کو خطوط چھپنے کے واسطے بھیجے۔ اور اپنے پاس سے اُن صاحب کو پچاس روپے ﴿ﷲ﴾ دینے کا اشتہار دیا۔ جو مرزا صاحب کی تصویر لائیں۔ یہ خط ہندوستان کے قریباً تمام مشہور اردو اخباروں نے چھاپا۔ مگر اثر بہت تھوڑا ہوا۔ تصویر کو میں نے خطوط لکھ کر بھی بجا تلاش کیا۔ مگر نہ ملی۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر تصویر نہیں ملتی۔ تو خیر۔ اُن کے خط کا فوٹو ہی پیش کردوں۔ چنانچہ اُن کا ایک قلمی ورق جناب مرزا اوج مدظلہٗ سے منگوایا (جو بہت تلاش سے جناب مرحوم کی تصنیفات میں ملا)۔ اور اُس کا عکس (فوٹو) اس کتاب میں ملاحظہ ناظرین کے واسطے پیش کردیا ہے۔ بعض حضرات نے مرزا صاحب کے حالات اخلاق حسنہ وغیرہ اور بعض بزرگواروں نے اُن کے شاگردوں کے حالات لکھ کر مع مختصر کلام کے خود بھیجے یا دوسروں سے تاکید فرما کر بھجوائے۔ جن کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پس سب سے زیادہ جن صاحبوں نے یہ کرم فرمایا۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) میر الطاف حسین صاحب عرف نواب مُنّے صاحب رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد۔

(۲) مولوی سید محمد عسکری صاحب مینجر رسالہ شیعہ بازار بندی ضلع سارن۔

(۳) مولوی فاضل سید علی حیدر صاحب اڈیٹر اصلاح۔

(۴) مولوی سید احمد رضا صاحب جائسی (ضلع رائے بریلی) جنھوں نے قبلہ و کعبہ مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی سے سُن سُن کر حالات صحیح لکھ کر بھیجے۔

(۵) میر کرار حسین صاحب روحانی جنرل سپرنٹنڈنٹ صاحب گورکھپور و رئیس میرٹھ خلف الصدق حضرت فرقانی طاب ثراہ۔

جب محرم ۱۳۳۰ھ میں یہ کتاب ایک مرتبہ لکھی گئی۔ تو میں اس کو لیکر ڈھائی مہینہ کے واسطے لکھنؤ گیا۔

وہاں بعض اہل علم اور اور آدمیوں اور شاعروں کو اس کے اکثر مقامات سُنائے۔ اور بعض حالات کی تصحیح کی۔ بعض اور حالات بہم پہنچائے۔ اور جناب اُستاذی حضرت اوج مدظلہ سے بعض ایسے بند اور اشعار جناب مرحوم کے لئے جو ابتک محفوظ ہیں۔ اور جناب ممدوح نے کرم فرماکر وہ لعل بے بہا عنایت فرمائے۔ جس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قلم تو کیا میری زبان بھی قاصر ہے۔ اس جانفشانی سے یہ کتاب اور بعض تلامذہ دبیر مرحوم کا تذکرہ مرتب ہوگیا۔ اور جو خیال مدت سے دل کو بار بار بے چین کرتا تھا (کہ مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ لکھا جائے)۔ وہ جزوی طور پر معرض ظہور میں آیا۔ جلد اوّل میں مرزا صاحب کے ہر قسم کے کلام کے نمونے ہیں۔ اور جلد ثانی میں علاوہ رباعیوں۔ سلاموں۔ تضمینوں وغیرہ کے مسلسل حالات کے مرثیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جناب امام حسینؑ کا مدینہ منورہ سے سفر۔ پھر مکہ معظمہ میں چند روزہ قیام۔ پھر ورود کربلاء معلےٰ۔ پھر اُن کے اُن رفیقوں اور عزیزوں کے حالات و شہادت (جن کے حال میں مرزا مرحوم کے مرثیے ملے)۔ پھر خود امام حسینؑ کے حالات و شہادت۔ پھر اہلبیت اطہار کا کوفہ پھر شام تشریف لے جانا۔ اور وہاں کے حالات۔ پھر واپس کربلا ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں آنا۔ اگر اس کو آپ ایپک پویم نظم (مسلسل واقعات منظومہ) کہہ سکتے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ اردو کی شاعری پر جو اعتراض چلا آتا تھا۔ کہ ایپک پویم سے خالی ہے۔ وہ اُٹھ گیا یا ہلکا ہوگیا۔ یہ مرثئے مجالس عزا میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی دیکھ کر ناظرین حظ و لطف سخن اُٹھا سکتے ہیں۔ ہم خرما ہم ثواب +

تلامذہ حضرت دبیر

ناظرین!! آپ کہتے ہونگے۔ حضرت دبیر کی لائف میں شاگردوں کے حالات و کلام کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں اس کی وجہ عرض کردوں۔ اوّل تو اس گروہ (شعرائے اہلبیتؑ) کی حق تلفی (گویا) ہو رہی ہے * کہ عام تذکرہ نویس

* ایک اور حق تلفی بھی ہو رہی ہے۔ جس کا حال چند آدمیوں کے سوا شاید تمام اہل لکھنؤ کو بھی معلوم نہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ان شاگردوں کے بعض مرثئے یا سلام یا بند اس زمانے کے بعض مرثیہ گو شعرا اپنے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ پھر اس پر سر منبر فخر فرماتے ہیں کہ دیکھئے یہ مضمون آج تک کسی نے نہیں باندھا تھا۔ مَیں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کہ کسی پر حملہ منظور نہیں ہے۔ بقول شاعر ۔ حسینوں میں ابھی چوری گیا دل۔ میں کس کا نام لوں اپنی زباں سے۔ اس واسطے مؤلف حقیر کا یہ بھی ارادہ ہے کہ تلامذہ حضرت دبیر کے مرثیوں کی جلدیں بھی اس حیات دبیر کے طبع ہونے کے بعد چھپوادے۔ اور خود مرزا مرحوم کے صحیح منتخب کلام کی بھی ایک یا دو جلدیں چھپوائیں۔ یہ کام ذرا مشکل ہے مگر خدا مددگار ہے ++ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ان کا تذکرہ نہیں کرتے۔ میری کتاب میں درج ہو جانے کے بعد ممکن ہے۔ کہ کوئی تذکرہ نویس ان کے ذکر خیر سے بھی اپنی کتاب کو رونق بخشے۔ اور میرے بعد جو صاحب اور کسی مرثیہ گو شاعر کی لائف لکھیں۔ وہ اُس خاندان کے شاگردوں کو لکھ دیں[۱]۔ اس طرح ممکن ہے۔ کہ شعرائے اہلبیتؑ کے حالات ملک میں شائع ہوں۔ اور یہ کمی جو عام طور پر ملک میں ہے یوں پوری ہو جائے۔ دوسرے ہر اُستاد (شاعر) کی نسبت یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ ملک کو اُس سے کتنا فیض پہنچا۔ اُس کے شاگرد کیسے کیسے ہوئے۔ مثلاً جب آپ شیخ مصحفی اور میر انشا کا کلام و بیان (تذکروں میں) دیکھتے ہونگے۔ تو آپکو ضرور یہ خیال ہوتا ہوگا۔ کہ گو میر انشا کی سی روانی اور شوخی بدرجہا بڑھے مصحفی کے عام کلام میں نہیں ہے۔ مگر مصحفی سے ملک کو فیض زیادہ پہنچا۔ جس شاخ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اِس چمن کے باغبان جناب مصحفی ہی تو ہیں۔ دیکھئے اُن کے شاگردوں میں ضمیر۔ خلیق۔ آتش۔ اسیر۔ شہیدی کیسے کیسے کامل ہوئے۔ ضمیر و خلیق کے یادگار شاگرد (روشن ضمیر و خلیق) مرزا دبیر و میر انیس ہیں۔ جو ایک ایک شاعر ہزاروں کے برابر ہے۔ اور اسیر مرحوم کے فیض یافتہ بھی بڑے بڑے کامل شاعر ہوئے۔ جن میں سے جناب منشی امیر مینائی مشہور عالم ہیں۔ کیا دبیرؒ کا یہ فیض قابل یاد و تعریف نہیں ہے۔ کہ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم سے اکمل شعرا دبیر مرحوم کے خوشہ چیں ہیں۔ یعنی مرثیہ میں شاگرد ہونے کا فخر بار بار اپنے دیوان اور لاجواب مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں۔ اسی طرح حکیم[۱] قدیر الدولہ قدیر۔ شمشیر[۲] مرحوم۔ حاجی حکیم عظیم[۳] مغفور۔ مولوی ظفر مہدی[۴] صاحب مہدی۔ منشی فرزند احمد[۵] صاحب صفیر بلگرامی خان بہادر۔ میر[۶] علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی دام ظلہ و جانشین[۷] حضرت دبیر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ[۸] مدظلہ العالی بلا واسطہ شاگردوں[۹] میں ہیں اور جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے مرزا تخلص۔ اور جناب نواب بنے صاحب مشتاق مرحوم اور نواب مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جانسٹھ و

[۲] تاج العلما سید علی محمد صاحب مجتہد طاب ثراہ و مولوی میر سید علی صاحب محدث مقبول صاحب مجالس علویہ بھی مرزا مرحوم کے شاگردوں میں قابل ذکر و فخر ہیں۔ انکی نظمیں بہت کم ہیں مگر نثر میں ان جناب نے دریا بہائے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ تاج العلما (طاب ثراہ) نے عموماً اردو میں لاجواب کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان کی لاجواب کتاب چودھویں رات کا چاند اور نغمۂ داؤدی ان کے کمال پر شاہد عدل ہیں۔ ان کو زبان اردو کا سرپرست و مربی کہنا بالکل درست ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۱] مثلاً مداح آل محمد مرزا کاظم حسین صاحب محشر جناب انیس مرحوم کی لائف لکھ رہے ہیں۔ پس وہ خاندان جناب میر صاحب کے تمام شعرائے اہل بیت کا ذکر خیر فرمائیں + ۱۲ مؤلف۔

میر امیر حسین صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائی کورٹ حیدر آباد دکن و میر فراست حسین صاحب فراست و میر یونس حسین صاحب یونس زید پوری و میر طالب حسین صاحب طالب بالواسطہ شاگردوں میں کیسے کیسے کامل ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے۔ کہ دبیر مرحوم سے اور کچھ فیض و فائدہ ملک کو نہیں پہنچا (حالانکہ ایسا ماننا فرض محال ہے)۔ تو ایک یہی فیض تلمذ کیا کم ہے۔ اگر یہ اعتراض ہے۔ کہ کسی لائف لکھنے والے نے ایسے شاگردوں کے حالات نہیں لکھے تھے۔ تو مجھے آپ اس کا موجد مان لیں +

المختصر یہ طول کتاب پانچ برس کی ایسی محنت کے بعد خدا کی مدد سے طیار ہوئی۔ کہ مَیں اکثر دن میں تو سات آٹھ گھنٹے تک کچہری کا کام کرتا تھا۔ پھر گھر پر آکر اکثر ضروری و غیر ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس کتاب کی ترتیب و تحریر میں مشغول رہتا تھا۔ اس درمیان میں بعض راتیں مجھ پر ایسی گذریں۔ کہ گویا پلک سے پلک نہیں جھپکی۔ مَیں تھا اور حیاتِ دبیرؒ۔ چنانچہ یہ میرے وہ شعر گویا میری اُس حالت کی تصویر ہیں۔ ؎

دلسوز ایک شمع ہے اور اک خدا کی ذات — خلوت میں دیکھتا ہوں تجلّی کائنات

مَیں کون ہوں! کہاں ہوں؟ نہیں اس کا دھیان بھی — سنّاٹے میں زمیں بھی ہے۔ آسمان بھی

اس کی ترتیب و تالیف سے پہلے ہر سال ایک مرثیہ دو ڈھائی سو بند کا مَیں کہ لیتا تھا۔ اِس پانچ برس کے پانچ مرثئے بھی پنجتن پاک کے مقبول مدّاح (حضرت دبیرؒ) کی لائف کے نذر کئے +

یہ سب محنت مَیں نے اس واسطے کی۔ کہ مَیں اس کام کو ایک فرض انسانی سمجھتا تھا۔ ملک یا قوم یا کسی فرقے پر مَیں نے احسان نہیں کیا۔ اس لئے صاف صاف عرض کرتا ہوں۔ کہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا۔ ؎

مجھ کو شکریہ کی خواہش نہ جزا کی خواہش — شکر صد شکر نہیں دل میں عطا کی خواہش

جلد اوّل بہت طولانی ہوگئی تھی۔ اس لئے شاگردوں کے حالات اور نمونہ کلام کو جلد ثانی میں شامل کردیا ہے +

یہ کتاب عالی جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کی مدد سے مرتب ہوئی ہے۔ اور جناب ممدوح نے جنھوں اپنا قیمتی وقت اس کے فراہمی مضامین اور سُننے اور خطوط و مضمون لکھنے میں صرف فرمایا ہے۔ جس کے شکریہ سے مَیں قاصر ہوں۔ میرے آقا جناب

امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اَلثَّنَاءُ بِاَکْثَرَ مِنَ الْاِسْتِحْقَاقِ مَلَقٌ وَالتَّقْصِیْرُ عَنِ الْاِسْتِحْقَاقِ عِیٌّ وَحَسَدٌ۔ کسی کی مدح وثنا اُس کے حق سے زیادہ کرنا چاپلوسی ہے اور کمی کرنا عجز وحسد ہے۔ پس مَیں جناب موصوف کی مدح میں تقصیر کا معترف ہُوں۔ مگر یہ کمی محض میری عاجزی کی وجہ سے ہے۔ حسد سے نہیں ہے۔ مَیں نے اِس ادائے شکریہ میں اِس کتاب کو جناب ممدوح کے نام نامی پر معنون کیا۔

طبع کتاب۔ اب چھپوانیکی فکر ہُوئی۔ اس زمانے میں جس طرح مفلس آدمی علم نہیں پڑھ سکتا (کہ اسکول و کالج کے مصارف بہت ہیں)۔ اُسی طرح کتاب بھی شائع نہیں کرسکتا۔ اُنہیں (علم دوست) جناب ممدوح نے یہ سخاوت وتحریک فرمائی۔ کہ چند رئیس مل کر اس کتاب کو چھپوادیں۔ اور خود وہ چھ سو روپیہ اپنے پاس سے لگانے پر بھی آمادہ ہُوئے۔ اور جناب نواب مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالندھر نے اپنی دریادلی سے دوسو روپیہ اور جناب سید امیر حسن صاحب فروغ وکیل ہائی کورٹ ریاست حیدرآباد دکن نے سَو روپیہ سے کم رقم شریک کرنا چاہی۔ مگر مَیں نے سوچا۔ کہ کتاب بڑی ہے۔ اِس طرح تین چار سو جلدیں چھپ کر نذر احباب ہو جائینگی۔ ملک میں کمالات دبیرؒ سے عام وخاص کو آگاہ کرنے کی جو ضرورت ہے۔ وہ پُوری نہ ہوگی۔ کسی تاجر کے ذریعہ سے چھپوائیں۔ اُدھر لاہور میں جناب مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب نے مجھے خط لکھ کر خواہش ظاہر کی۔ اور اس کے عمدہ وصحیح چھپوانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ارزاں (کہیں ارزاں بعلّت نہ سمجھئیگا) بیچنے کا وعدہ فرمایا۔ اس لئے یہ کتاب ایک مرتبہ چھپوانے کے لیئے چند شرائط پر اُن کو دی گئی +

زمانہ کی رفتار

یہ بات بھی کہنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ جناب مرزا دبیر مرحوم اپنے زمانے میں یکتا اور تمام شعراء معاصرین سے اعلےٰ (شاعر ومرثیہ گو) ملک میں مانے جاتے تھے۔ اور اس کے ماننے والے عوام الناس ہی نہ تھے۔ بلکہ اکثر اہل کمال کا اس پر اتفاق تھا۔ غالب دہلوی ایسے کامل کا قول تذکرہ جلوہ خضر وسرور ریاض سے مَیں اسی کتاب میں نقل کرچکا ہُوں۔ کہ مرثیہ کہنا دبیر کا حق ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ واقعات انیس صؔ سے بھی ایسا ہی خیال

اُس زمانے کے اہلِ علم کا پایا جاتا ہے۔ اور جو تقریظ دکن ریویو کے پرچہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں ایک صاحب نے مرزا مرحوم کے ایک مرثیے پر چھپوائی ہے۔ اُس میں بھی وہ صاف لکھتے ہیں۔ کہ "اپنے زمانے میں جناب مرزا صاحب سب سے بہترین شاعر تصور کئے گئے۔ اور بڑے بڑوں نے اُس وقت اُن کے کلام کے آگے سر ڈال دیا" باایں ہمہ اب زمانے کی رفتار کو دیکھئے۔ کہ یہی مقرظ صاحب خیال فرماتے ہیں۔ کہ گویا مرزا صاحب مرحوم مرثیہ کہنا ہی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اسی ریویو (تقریظ) میں کچھ جابجا اظہار نقائص (جو اکثر غلطی کتابت طبع کے ہیں) فرمانے کے بعد کہ یہ مصرع اُن مرحوم کا ع "تائید غیب کے ہیں نمونے یہ مرثیے" لکھکر لکھتے ہیں۔ کہ "مرثیہ کی جگہ مسدس فرماتے۔ تو کسی کو (کلام و) عذر نہ ہوتا" اور پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ "یہ اُسی فیاض گھر (اہل بیت پیغمبر خدا صلعم) کا صدقہ ہے[۱]۔ کہ اِس وقت بھی انکی نظم کے متعلق ایک طرف تو یہ فرمایا جاتا ہے۔ کہ "میر (انیس) صاحب کو سب سے بہتر شاعر مان لینے پر بھی اگر کوئی مرثیہ گو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ تو وہ مرزا دبیر ہی ہو سکتے ہیں" اور دوسری طرف باوجود اس کے کہ ہم نہ اُن کی شاعری کو تسلیم کرتے (ہیں) نہ اُن کے مسدسوں کو مرثیہ کا اعلےٰ خطاب دے سکتے ہیں[۲]۔ مگر پھر بھی اُن کا بہت کچھ ادب و لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے (ہیں) اور ایک نیک دل شریف النفس

---

[۱] میں کہتا ہوں کہ بیشک سب صدقہ تو اُسی فیاض گھر کا ہے مگر اہلبیت اطہار جس طرح فیاض ہیں اُسی طرح عادل بھی ہیں مرزا مرحوم نے جس پایہ کی مدح کی تھی ویسا ہی اُن حضرات نے صلہ عطا فرمایا۔ کہ بڑے بڑے کاملوں نے انکی تیغ زبان کا لوہا مانا۔ اور بقول مقرظ صاحب "سر ڈال دیا"۔ باقی اور مداحوں کو اُتنا صلہ ملا جتنی اُن کی محنت تھی۔ کہ فیاض عادل کے در سے کوئی محروم نہیں جاتا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] اس موقع پر مخدومی خان بہادر سید علی محمد صاحب قبلہ شاد مد ظلہ کے خط مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۱ء کے چند فقرے لکھنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) "بلاشبہ کام آپنے بہت اچھا کیا۔ کہ جنت مکان جناب مرزا دبیر مغفور کی سوانح عمری لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا مجھکو یقین ہے کہ آپ خوب لکھینگے اور تحقیق سے لکھینگے"۔ (۲) "مَیں جناب مرزا دبیر مغفور کی خدمت میں حاضر رہا ہوں۔ لکھنؤ میں جناب مرحوم کا مہمان رہا ہوں۔ بیشک مَیں نے ۱۲۷۶ھ ہجری میں جناب مرزا صاحب سے ایک مرثیہ اور ایک فارسی مثنوی پر اصلاح لی ہے۔ اور مَیں اُن کو اپنا اور اس فن کا اُستاد جانتا ہوں"۔ (۳) "خود جناب مرزا صاحب جانتے تھے کہ مَیں میر انیس کا طرز پسند کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے علاوہ شاگردی اُستادی کے مرزا صاحب پر اعتبار کر کے میرے بزرگ اور کامل الفن صاحب اخلاق حمیدہ اور مومن کامل

انسان ماننے کے ساتھ اُن کی بزرگوئی کے معترف بھی ہیں۔ والسلام"۔ اب میں کہتا ہوں۔ اور بقول مشیر مرحوم ع "ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کچھ مجھکو ڈر نہیں"۔ کہ اگر مرزا دبیر ہی مرثیہ گو نہ تھے۔ تو پھر ہندوستان بھر میں اُن کے زمانے میں کوئی صاحب مرثیہ گو نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اصل مرثیت (بزم) میں اور بزرگوار مرزا مرحوم کو نہیں پہنچتے۔ اور جناب معترض اسی (مرثیت) میں اُن کو ناقص خیال فرماتے ہیں۔ اس موقع پر ایک لطیفہ و واقعہ شیخ الرئیس بوعلی سینا (حکیم کامل) کا یاد آگیا۔ شیخ کو کسی شخص نے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔ اُس کے جواب میں شیخ نے یہ رباعی کہی ؎

لطیفہ

کفر چو من گزاف آساں نبود	محکم تر از ایمان من ایماں نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر	پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

مرزا صاحب کی مقبولیت کے باب میں مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا یہ قول بھی میں لکھنا چاہتا ہوں (کہ جو انہوں نے اپنے مقدمہ دیوان کے صفحہ ۵ پر زیب قلم فرمایا ہے)۔ "(لارڈ بائرن کی طرح) لکھنؤ میں میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی تقریباً ایسی ہی قبولیت حاصل کی تھی۔ جو لوگ میر انیس کو پسند کرتے تھے۔ وہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جہاں تک ہو سکتا تھا میر انیس کی تقلید کرتے تھے۔ اور جو فریق مرزا دبیر کا طرفدار تھا۔ وہ ہر ایک بات میں اُن کی پیروی کرتا تھا۔ مگر لارڈ بائرن اور اُن دونوں صاحبوں کی قبولیت میں اتنا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) تھے۔ میں اُنکی مخالفت کیونکر کرتا اور کس منہ سے کر سکتا ہوں۔ ہاں ۳۵ برس ہوئے۔ کہ جناب مرزا صاحب کے بعض نادان دوستوں نے مجھے کچھ ایسا پریشان کر دیا کہ جوش جوانی میں میں از خود رفتہ ہو گیا۔ تو وطن میں بعض بیکار کمیٹی میرے قلم سے ایسے نکلے کہ میں شرمندہ ہوں۔ اور اُنکی روح پر فتوح سے معافی کا خواستگار۔ اُس کے بعد آج تک حاشا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایۃً خواہ صراحتاً نکلا ہو۔ خدا جانے مرزا اوج صاحب کو کس نے کہدیا کہ دکن ریویو میں میرا ایسا تحریر نکلی ہے۔ چنانچہ میں نے خود اُن سے پوچھا اور اُنکی تسکین کر دی۔ اور حق یوں ہے۔ کہ میں کچھ بھی واقف نہیں کہ یہ تحریریں کیسی اور کب چھپیں"۔ (۴) "مولوی شبلی (صاحب) کے موازنہ میں بھی علمی غلطیاں اور مرزا صاحب کی شان میں سخت زبانیاں بے انتہا ہیں۔ میں نے خود مولوی شبلی (صاحب) کے روبرو انکو متنبہ کیا لیکن بیرازکمان جستہ ہے۔ یہ ہے حقیقت حال جسکو میں نے بلا کم و کاست آپکی خدمت میں عرض کر دیا"۔ یہ چند فقرے اس غرض سے میں نے لکھ دئے ہیں۔ کہ بعض مرزا صاحب مرحوم کے مقلد جناب شاد مدظلہ کے اشارے سے ایسی تقریظیں نکلنا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ اُن کا دامن کمال ایسے دھبوں سے پاک ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فرق ہے۔ کہ لارڈ بائرن کی عظمت اہل انگلستان کے دل میں صرف اس وجہ سے تھی۔ کہ وہ اُس کو اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے اُس کو یکساں عزیز رکھتے تھے۔ بخلاف انیس و دبیر کے کہ اُن کی عظمت محض ایک مذہبی شاعر ہونیکی وجہ سے تھی۔ اور اسی لئے اُن کی بڑائی اور بزرگی جیسی کہ عموماً ایک فرقے کے دل میں تھی۔ ویسی عام طور پر دوسرے فرقے کے دل میں نہ تھی۔ یہ امتیاز یعنی قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے" یہ ارشاد جناب حالی کا ایک حد تک درست ہے۔ مگر میں اس میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ابتدا میں حضرت مرزا دبیر کی اور پھر جب جناب میر انیس کی شہرت ہوئی۔ تو اُن کی بھی عظمت تمام اہل علم کے دل میں تھی (خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں)۔ لکھنؤ میں اُن کی عظمت سُنی۔ اور ہندو اہل علم بھی اسی طرح کرتے تھے جیسے شیعہ۔ اور محض مذہبی شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اخلاق حسنہ کا سکھانے والا بھی اُن کو جانتے تھے۔ میرے علم و خیال میں پہلے تعصب کا امتیاز ور کبھی نہ تھا (جتنا اب ہے)۔ چنانچہ مرزا صاحب کے شاگردوں میں بھی بعض روشن خیال سنت و جماعت و صوفی حضرات اور بعض ذی علم کائستھ کشمیری پنڈت۔ کھتری وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ارشاد جناب ممدوح کا کہ "یہ امتیاز قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے" صحیح ہے۔ اور میں کہتا ہوں۔ کہ جو جوں روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کے آپس کے میل جول میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ تعصب بڑھتا جاتا ہے۔ تجربہ اس کا شاہد ہے۔ مگر علوم جدیدہ کا اس میں قصور نہیں ہے۔ ہمارا ہی قصور ہے۔ علم کا قصور ہوتا۔ تو یورپ میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ ہمارا مٹانے والا ایک مذہبی تعصب ہی نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی اُس کے کئی سگے سوتیلے (زبردست) بھائی ہیں۔ جن کے نام قومی تعصب۔ مقامی تعصب۔ خیالی تعصب وغیرہ وغیرہ ہیں +

قومی۔ مقامی
خیالی تعصب

ایک صاحب علم مسلمان جن کو سخن فہمی کا دعوےٰ ہے۔ گلزار نسیم ایسی شاداب و سرسبز مثنوی کی اس لئے تعریف نہیں فرماتے۔ کہ وہ ایک ہندو کی تصنیف ہے* یا ایک دہلی کا باشندہ یا مقلّد اُن

---

* اس باب میں جو رائے عالی جناب مسٹر ہیرالال صاحب شہد اکبر آبادی دام اقبالہ کی اُن کی تقریظ میں ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیے + ۱۲ مؤلف حقیر

میں اس لئے عیب نکالتا ہے۔ کہ وہ ایک لکھنؤ والے کی مثنوی ہے۔ یا ایک دہلی کے طرز تغزل کا دلدادہ
عالم و شاعر جہاں عاشقانہ رنگ غزل کی پسندیدگی بیان کرتا ہے۔ وہاں شعرائے دہلی کے ساتھ ایک
بھی لکھنوی شاعر کا۔ یہاں تک کہ حضرتِ آتش مرحوم کا (جن کے کلام میں بقول حضرت غالب مرحوم
بیشتر نیشتر ہیں) جناب مومن دہلوی و جناب غالب کے ساتھ نام نہیں لیتا۔ اسی طرح ایک
عالم شاعر اشعار کی خوبیاں بیان فرما کے چھانٹ چھانٹ کر دہلی والوں کے اشعار نظیر میں تحریر فرماتے
ہیں۔ اور اگر ڈگر کوئی شعر کسی لکھنؤ کے شاعر کا بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب شعر کی برائیاں
بیان کر کے (برے اشعار) نظیر میں پیش کرتے ہیں تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اکثر اشعار شعرائے لکھنؤ کے زیب قلم فرماتے
ہیں۔ اور ایک دو شعر کسی دہلوی شاعر کے بھی مصلحتاً ملا دیتے ہیں جس شخص کو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ یا اس کے
بزرگ دہلی کے تھے۔ اُسکو اپنا باعث فخر سمجھ کر طرح طرح سے بڑھاتے ہیں۔ اور جسکو غیر سمجھتے ہیں۔ اُسکو
گھٹانے کی کوشش فرماتے ہیں +

اسی طرح ایک لکھنؤ والا دہلی والوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ ایک شیعہ سخن سنج ایک سُنّی شاعر کی
(کمال کی) اس لئے تردید کرتا ہے۔ اور اُس کے کمال کو مٹانا چاہتا ہے کہ وہ سُنّی ہے۔ اسی طرح ایک سُنّی
سخن فہم شیعہ شاعر کی تنقیص (شیعہ ہونے کی وجہ سے) کرتا ہے +

ایک شخص نے جو ایک شاعر کو اکمل سمجھ لیا ہے۔ تو اب وہ اُس کے مدمقابل و معاصر شاعر کے کلام کو دیکھتا
ہی نہیں۔ حالانکہ جس رنگ خاص کی وجہ سے شاعر اول الذکر کو اُس نے پسند کیا ہے۔ اُس رنگ کے اشعار بھی اُس
کے مدمقابل کے یہاں موجود ہیں ف۱ +

ف۱ اس زمانے کے بعض اہل علم ایک کم علم شاعر کو ذی علم شاعر پر کھلم کھلا ترجیح دیتے ہیں۔ اُنکی دلیل یہ ہے کہ بڑے بڑے شاعر
اکثر کم علم ہوئے ہیں شاعری فطری شے ہے علم کی محتاج نہیں۔ ثبوت میں شکسپیر کو پیش کرتے ہیں۔ مگر اُنکو شاید یہ علم نہیں کہ جو ڈرامہ اور
ناول شکسپیر سے منسوب ہیں۔ اُنکی نسبت خود اعلےٰ طبقہ اہل یورپ کی یہ رائے ہے کہ وہ شکسپیر کے نہیں ہیں۔ بلکہ لارڈ بیکن کے ہیں۔ جو
اُنہوں نے شکسپیر کے نام سے شائع کئے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ لارڈ بیکن کو جن کے علم و فضل کی ایک عالم میں دھوم تھی۔
اطمینان کلی نہ تھا۔ کہ پبلک اُن ڈراموں کے انداز کو پسند کریگی اور اُس اعلےٰ نظر سے دیکھیگی۔ کہ جو ایک عالم متبحر کی تصنیف کیلئے

مختصر یہ کہ آج کل اردو شاعری کے سمندر میں عجب طوفان برپا ہے۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے کلام کی بھی بعض بعض بزرگ اب ایسے ایسے خیالات و وجوہ سے قدر نہیں کرتے[۲] اور اُن کے حالات و کلام سے بھی اکثر ناواقف ہیں۔ تماشا یہ ہے۔ کہ ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں۔ کہ جن کے بزرگ مرزا صاحب کے فدائی یا شاگرد تھے۔ اب یہ مرزا کے مٹانے یا گھٹانے یا کم سے کم منبر کمال پر ایک زینہ نیچے بٹھانے کی کوشش میں ہیں +

اگر بلا تعصب کسی شخص کی یہ رائے ہے۔ کہ وہ اس اس بات میں اپنے کسی معاصر سے کم تھے۔ تو مضائقہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اصناف سخن میں ایک شاعر کا کمزور ہونا اور بعض میں دوسرے کا ممکن ہے۔ جناب امیر[ع] سے کسی نے سوال کیا۔ کہ سب سے بڑھا ہوا شاعر کون ہے۔ فرمایا[۳] چوگان بازی کے گھوڑوں کی ایک ہی دستہ کی طرح جماعت شعرا نہیں چلتی ہے۔ تاکہ چوگان لے جانے کے وقت ان کا اعلےٰ درجہ پہچان لیا جائے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵ نمبر ۱) ضروری ہے۔ لارڈ بیکن نے اپنے ایک خط میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام اصناف سخن میں میرا کلام ہے۔ وہ اصحاب جن کو علمی تحقیقات کا شوق ہے۔ اس مناظرے کے متعلق لٹریچر کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایسے اہل علم خیال نہیں فرماتے۔ کہ جب شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ اور قدرت جب ایک ایسے شخص کو یہ نعمت بخشے۔ جو بڑا ہو کر عالم بھی ہو۔ تو کیا قدرت وہ نعمت اُس شخص سے اس جرم میں چھین لیگی۔ کہ تو عالم ہے۔ جو لوگ فطرتی شاعر ہیں اور فاضل جید بھی۔ تو اُنکی شاعری پر علم سے صیقل ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ جن کو قدرت شاعر پیدا کرتی ہے۔ وہ بے علمی کی وجہ سے دُنیا کو اپنے خداداد فیض سے بہرہ مند نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ کے مشہور شاعر گرے نے ایک دیہاتی قبرستان کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے۔ کہ اس میں بہت ایسے کامل گڑے ہوئے ہیں۔ جن کو موقع ملتا۔ تو ملٹن اور کرامل کی طرح مشہور ہوتے۔ ایسے اصحاب ملک الشعرا انگلینڈ لارڈ ٹینیسن اور ملٹن اور کالی داس (شاعر حکیم ہند) کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ جو فطری شاعر اور عالم متبحر تھے۔ یہی حال مرزا دبیر مرحوم کا بھی ہے۔ کہ وہ فطری شاعر اور عالم علوم معقول و منقول تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] علم و فضل جو آدمی کیواسطے باعث فخر ہے وہ دبیر کیلیئے ایسے جہالت پرستوں نے عیب قرار دیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] اصل عبارت نہج البلاغہ صفحہ ۵۲۰ مطبوعہ مصر۔ سُئِلَ مَنْ اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ۔ فَقَالَ ع۔ اِنَّ الْقَوْمَ لَمْ یَجْرُوْا فِی حَلْبَۃٍ تُعْرَفُ الْغَایَۃُ عِنْدَ قَصَبَتِھَا۔ فَاِنْ کَانَ وَلَابُدَّ فَالْمَلِکُ الضِّلِّیْلُ۔ یُرِیْدُ اِمْرَءَ الْقَیْسِ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(مطلب یہ ہے۔ کہ ہر ایک کا رنگ جُدا روش جُدا ہے۔ پھر کیونکر کسی ایک ہی کو بہمہ وجوہ کامل کہا جا سکے) ہاں اگر
ترجیح دینا ہی ضرور ہے۔ تو بادشاہ گمراہ (امراء القیس) کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ وہ اکثر
رنگوں میں اچھا کہتا ہے +

بعض بزرگوار جہاں اُن کے اور معاصرین اہل کمال کا ذکر خیر فرماتے ہیں۔ وہاں مرزا مرحوم کا نام بھی
نہیں لیتے۔ واقعی مرزا نے ایسا ہی قصور بلکہ جُرم کیا ہے شیخ سعدی رح نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

کس نیاموخت علم تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

مَیں کسی کا نام نہ لونگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کا مَیں نے بیان کیا ہے۔ وہ اکثر ملک کے فیض رساں اہل قلم سمجھے
جاتے ہیں۔ اور اُن سے خلائق کو فیض پہنچا ہے۔ اور انشاء اللہ اور بھی فائدہ پہنچیگا۔ ان میں بعض میرے بزرگوں
کے ملنے والے اور اُن کے کمال کے معترف و مداح بھی بدرجہ کمال ہیں۔ اور مَیں نے باوصف اختلاف رائے کے
ایسے کاملوں کو بہت ادب سے یاد کیا ہے۔ اور اُنکی سخن فہمی و کمال کی مدح کی ہے۔ اور یہی میرا شیوہ ہے۔ اور
میرے نزدیک اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کامل کی تنقیص کرنا اچھا نہیں ہے۔ بایں ہمہ (۲) جہاں ایسے
ایسے بزرگوار ہیں۔ وہیں ملک میں ایسے عالی دماغ اہل علم بھی ہیں۔ جن کے واسطے کوئی تعصّب (مذہبی۔ قومی۔
خیالی۔ مقامی) سنگ راہ نہیں ہے۔ وہ یہ کہکر کہ ع "متاع نیک ہر دکان کہ باشد" دل سے اچھے مال کے گاہک
اور خُذ ما صفا و دع ما کدر* کے عامل ہیں۔ اور اس ارشاد فیض بنیاد جناب امیرؑ پر (فانظر الیٰ ما قال و
لا تنظر الیٰ من قال۔ یہ دیکھ کہ کیا کہا ہے۔ یہ نہ دیکھ کہ کس نے کہا ہے) پورا پورا عمل کرتے ہیں۔ ایسے ہی سخن
فہموں سے قدر و انصاف کی زیادہ امید ہے۔ (۳) تیسرا دہ گروہ سخن سنجوں کا ہے۔ جو آج بھی مرزا صاحب کو تمام
ملک یا اُن کے تمام معاصرین سے بہتر سمجھتا ہے۔ اور اپنے دعوے کی تائید میں مرزا مرحوم کا ہر رنگ میں کلام پیش کرتا ہے
جس کو دیکھ کر سامع منصف کو کمالات دبیر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر ایک نقل یاد آگئی۔ مرزا محمد صاحب طاب ثراہ
مغفور مجھ سے ناقل تھے۔ کہ ایک روز بزیر رئیس لکھنؤ جناب ناظم آغا علی خاں عرف آغائی صاحب مرحوم کی صحبت میں
حاضر تھا۔ کہ ایک رئیس لکھنؤ جناب میر انیس صاحب کے فدائی تشریف لائے۔ جو مرزا مرحوم کا کلام سُننا گویا گناہ اخلاقی سمجھتے

حکایت

* جو صاف و عمدہ ہو۔ وہ لے لے۔ جو خراب ہو۔ وہ چھوڑ دے + ۱۲ مؤلف حقیر

تھے۔ آغائی صاحب مرزا مرحوم کے فدائی اور اُن کے کلام کے دل سے شیدا تھے۔ اُن رئیس نے باتوں باتوں میں جہاں میر صاحب مرحوم کے کلام کی اور تعریف کی۔ وہیں یہ بھی فرمایا۔ کہ میر صاحب کا ہر شعر دُوسروں سے ممتاز ہے۔ ویسا فصیح وسلیس کلام دُوسرا کوئی شاعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ ایسے بیش بہا جواہر ہیں۔ جو تمام دُنیا کے جواہرات سے اعلےٰ اور الگ نظر آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آغائی صاحب کسی ضرورت سے اندر کے درجہ میں اُٹھ کر گئے۔ مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میں بھی وہیں پہنچا۔ تنہائی میں فرمایا۔ کہ یہ بزرگوار بڑی شیخی بگھارتے ہیں۔ کہ میں میر صاحب کے کلام کو پرکھتا ہُوں۔ میں ابھی تم سے فرمائش کرونگا۔ کہ میر صاحب کا کچھ کلام پڑھو۔ تم کسی مرزا صاحب کے مرثئے کے سلیس وفصیح وعام فہم چند بند پڑھ دینا۔ دیکھوں ان کا دعوے کہاں تک قابل قبول ہے۔ مَیں نے کہا بہت بہتر۔ پھر وہ بھی آکر مجمع مذکورہ میں بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ کے بعد میں بھی آبیٹھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ناظم صاحب بولے۔ جناب نوّاب صاحب! ! میں آپکی کچھ دعوت کرنا چاہتا ہُوں۔ فرمایا۔ کیا؟ میری طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ یہ صاحب جناب میر صاحب کا کلام پڑھتے ہیں۔ اُن کے اکثر چوٹی کے بند انکو زبانی یاد ہیں۔ کہئے تو کچھ اُن کا کلام فصیح ولطیف سنواؤں۔ فرمایا۔ بسم اللہ ضرور پڑھوائیے نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ مَیں نے چند سلیس و فصیح بند پڑھے۔ وہ وجد کرنے لگے۔ بار بار فرماتے تھے۔ دیکھئے جناب ناظم صاحب! ! میں نہ کہتا تھا۔ یہ فصاحت یہ شیرینی کسی دُوسرے شاعر کے کلام میں کب ہے۔ اور خطا معاف۔ جناب مرزا صاحب گو مضمون آفرین ہیں۔ مگر یہ بات اُن میں کہاں۔ یہ بندش کی صفائی۔ یہ زبان کی لطافت۔ یہ حسن بیان انیس کا حصّہ ہے۔ ناظم صاحب بڑی دیر تک اُنکی لن ترانیاں چُپ چاپ سُنا کئے۔ آخر الامر جب وہ بہت تعریف فرما چکے۔ تو (آغائی صاحب) بولے۔ جناب نواب صاحب۔ دبیر جامع اصناف سخن ہے۔ اُس کے یہاں جہاں بلاغت ومضمون آفرینی کے ڈھیر لگے ہُوئے ہیں۔ وہیں ان باتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ ہر رنگ میں کہتا ہے۔ فرمایا۔ اچھا اب اُن کے بھی چند بند ایسے فصیح وسلیس سنوا دیجئے۔ تو میں مان لُونگا۔ آغائی صاحب ہنسے۔ اور فرمایا۔ کہ جناب یہ دبیر ہی کا فصیح وسلیس کلام تھا۔ آپ تو اُنکا کلام نہ دیکھتے ہیں نہ سُننا چاہتے ہیں۔ وہ بزرگوار چُپ ہو گئے۔ پھر اور کچھ باتیں شروع ہو گئیں۔ خود مجھ کو بھی بعض ایسے سخن سنجوں سے کام پڑا ہے۔ مَیں نے دبیرؒ وانیسؒ کے مرثیوں سے بند چھانٹ چھانٹ کے ایک مرثیہ مرتب کر لیا ہے۔ جس میں دو چار بند میر صاحب کے پھر دو ایک بند مرزا صاحب کے

لکھے ہیں۔ کہیں چار مصرع میر صاحب کے اور ٹیپ مرزا صاحب کی ہے۔ جب ایسے کوئی صاحب مل جاتے ہیں اور ایک کے کلام سے رغبت اور دوسرے سے نفرت ظاہر فرماتے ہیں۔ اور یہ دعوے کرتے ہیں۔ کہ میں کسی ایک کے کلام کو خوب پرکھتا ہوں۔ تو میں وہ مرثیہ پیش کر کے عرض کرتا ہوں۔ بتائیے۔ یہ کس کا کلام ہے۔ اوّل تو اسی میں اُن سے غلطی ہو جاتی ہے۔ کہ کسی ایک کا کلام (تمام مرثئے کو) بتا دیتے ہیں۔ پھر جب میں صاف کہہ دیتا ہوں۔ کہ اس میں دونوں بزرگوں کے بند مخلوط ہیں۔ اب بتائیے۔ کونسا بند میر صاحب کا اور کونسا مرزا صاحب کا ہے۔ تو ایک کے بند کو دوسرے کا بتا دیتے ہیں۔ بڑے بڑے مدّعیان سخن شناسی کی قلعی ایسے موقع پر کھل جاتی ہے +

اس لکھنے سے میری یہ غرض نہیں ہے۔ کہ میر و مرزا کے کلام میں مابہ الامتیاز الفاظ اور بندشیں نہیں ہیں۔ ہیں مگر خاص خاص۔ ایک مرثیہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ کر سخن شناس ضرور غور و فکر کے بعد پہچان لیگا۔ کہ یہ مرزا کا مرثیہ ہے یا میر کا۔ یا اور کسی کا۔ مگر نہ ہر ایک کا کام ہے۔ نہ ہر بند و ہر بیت کی پہچان آسان ہے +

بعض دبیر و انیس کے ایسے فدائی بھی دیکھے گئے۔ کہ جبتک وہ مرثیہ سنکر یہ سمجھتے رہے۔ کہ یہ ہمارے ممدوح (دبیر یا انیس) یا اُن کے خاندان کی تصنیف ہے مجلس میں تعریف کرتے رہے۔ اور جب کسی کے کہنے یا کسی قرینے سے یہ ثابت ہوا۔ کہ دوسرے خاندان کا یا دوسرے بزرگوار کا کلام ہے۔ ایسے چُپ ہو گئے۔ کہ گویا تعصب نے گلا گھونٹ دیا۔ ہر شخص کو خدا ایسے تعصب سے بچائے۔ عجب رنگ چھایا ہوا ہے۔ (المؤلفہ) ؎

ہر ایک رنگ کو ہم بار بار دیکھتے ہیں خزاں میں بھی تری شیدا بہار دیکھتے ہیں

اس موقع پر یہ لکھنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ بعض انگریزی خوانوں کے خیالات ملک میں پھیلنے کی وجہ سے قلزم شاعری اردو میں اور بھی کئی طوفان آج کل اٹھ رہے ہیں۔ جو غالباً موسم کی طرح شاعری کے رنگ کو کچھ نہ کچھ ضرور بدل دینگے۔ بعض حضرات تشبیہات و استعارات کو ہی مخرّب شاعری فرماتے ہیں۔ بعض (مبالغہ کے ساتھ) مبالغہ مقبول کی بھی مذمت کرتے ہیں۔ کچھ اہل علم ایسے بھی ہیں۔ جو تمام صنائع و بدائع کو (چاہے وہ کتنی ہی بیساختہ نظم ہوں) شاعری کے چہرے پر بدنما داغ دھبے سمجھتے ہیں۔ بعض اس کو بدعت شاعری قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی رائے ہے۔ کہ اردو کی شاعری جو ڈرامہ سے آج خالی نظر آتی ہے۔ اُس کے اسباب بھی

تشبیہات وصنائع وبدائع وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ حضرات یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں۔ کہ بھاشا
میں ڈراما اعلےٰ درجہ کا ہے۔ مَیں عرض کرتا ہوں۔ کہ اگر ڈرامہ نویسی کو ان چیزوں نے (اردو میں) روکا۔ تو بھاشا میں
کیوں نہیں یہ سنگ راہ ہوئیں۔ کیونکہ جس طرح اردو نے فارسی وعربی کا دودھ پی پی کر ہوش سنبھالا ہے۔ بھاشا
سنسکرت کی گود میں پلی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ سنسکرت میں جس کثرت سے تشبیہات واستعارات
وصنائع وبدائع ومبالغے ہیں۔ شاید کسی دوسری زبان میں ہوں۔ مَیں نے اِس کتاب میں جا بجا یہی ثابت کیا ہے
کہ ان صنائع وبدائع ومبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جنکو کروڑوں آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں مثلاً
بائبل شریف اور قرآن مجید اور وید۔ اور صنائع وبدائع کے باب میں جو جو آیت جس جس صنعت میں تھی۔ وہ بھی
(اُس صنعت کی تعریف کے ساتھ) مختصر المعانی وغیرہ کتب معانی وبیان سے لکھتا چلا گیا ہوں۔ اگر بالفرض آج
یہ چیزیں یورپ میں بُری سمجھی جاتی ہیں۔ تو کچھ پروا نہیں۔ ذرا صبر کیجئے سنسکرت۔ عربی۔ فارسی وغیرہ کی کتابیں وہاں
جب زیادہ ترجمہ ہو جائینگی۔ تو ممکن نہیں۔ کہ یورپ کو اپنے رنگ پر کچھ نہ کچھ نہ لے آئیں۔ پھر آئندہ وہاں بھی صنائع
وبدائع وغیرہ کے مینہ برسینگے۔ یہ بھی عرض کردوں۔ کہ شاعر کا کام محض ڈرامہ لکھنا ہی نہیں ہے۔ اقسام سخن میں
سے (ڈرامہ) بھی ایک قسم لطیف ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ اردو کی شاعری (ڈرامہ نویسی سے) زیادہ تر قافیہ
وردیف ودیگر قیود نظم کے سبب سے محروم رہی ہے۔ تو شاید یہ کچھ بیجا نہ ہوگا بیشک بڑی بڑی ردیفیں اور مشکل قافئے
کبھی کبھی بڑے بڑے شاعروں کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ اردو کے شاعروں نے قافیہ کو وہ وسعت بھی نہ دی۔
جو ایرانیوں تک نے بخشی تھی۔ مثلاً قریب المخرج حروف کا قافیہ یا ایسا قافیہ جیسا کہ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ ؎

کہ اے شاہ آفاق گستر بعدل ــــ اگر من نماندم تو مانی بفضل

عدل فضل کا قافیہ اگر کوئی اردو کا شاعر باندھ دے (حالانکہ حرف روی لام ہے)۔ تو ہر شخص گردن دبانے
کو موجود ہے۔ اگر ردیف نہ لائیں۔ تو سامعین اُس شعر کو لنڈورا کہتے ہیں۔ حالانکہ ردیف جب تک بے تکلف
نہ آجائے۔ شاعر کو میری رائے میں ہرگز نہ لانا چاہئے۔ اِس باب میں براہ راست عرب کی تقلید کرنا چاہئے۔
جہاں ردیف شعر میں نہیں ہوتی۔ اونٹ پر دو برابر برابر بیٹھنے والوں کو (عرب) ردیف کہتے ہیں۔ مولوی
خواجہ حالی مدظلہ العالی کے دیوان میں حجاز۔ نماز کے قافیوں میں شاذ کا قافیہ دیکھ کر مَیں اس قدر خوش ہوا۔ کہ

بیان نہیں کرسکتا۔ اسی ڈرامہ و ایپک پوئم کی خاطر سے یورپین شعرا نے قافیہ کی قید سے بعض اقسام نظم کو آزاد کردیا۔ جس نظم کو بلینک ورس کہتے ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ اردو کا مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز نہیں ہے۔ جو ہم مرثیہ گو شاعر کو ڈرامہ کی قیود سے باہر ہوتا ہُوا دیکھ کر یہ الزام دیں۔ کہ وہ ملک کی بدمذاقی یا اور کسی سبب سے بہک گیا۔ مرثیہ اردو تمام اصناف سخن کا جامع ہے۔ ایک ایسا خوشنما باغ ہے۔ جس میں گلاب۔ سیوتی۔ کیوڑہ۔ جوہی۔ چنبیلی۔ بیلہ۔ چاندنی۔ نیلوفر۔ لالہ وغیرہ وغیرہ کے بیشمار خوشبو دار خوش رنگ پھول نظر آتے ہیں۔ اور خوش ذائقہ و خوشبودار پھل بھی موجود ہیں۔ مرثیہ میں کہیں غزل کی شان ہے۔ کہیں قصیدے کی آن بان ہے۔ کہیں مثنوی کا تسلسل۔ کہیں ترکیب بند و ترجیع بند کی ایسی ترکیب ہے۔ کہیں کہیں ڈرامہ کا بھی لطف کسی واقعہ کے بیان میں آجاتا ہے۔ اتنی ردیف۔ قافیہ وغیرہ وغیرہ کی قیدوں پر یہ شعراء اہلبیت کمال کرتے ہیں۔ کہ بعض جگہ ایسا سماں دکھا دیتے ہیں۔ کہ آنکھوں کو نہیں دل کو حیرت ہوجاتی ہے (جیسا کہ مَیں اُوپر مفصل عرض کرچکا ہوں) + مرزا مرحوم کا کلام ہر رنگ میں ہے۔ اس لئے ایسے دلکش پھولوں کی بھی (اُن کے باغ نظم میں) کمی نہیں ہے۔ اُن کا کلام ڈرامٹک خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ آپ کو اس کے کچھ نمونے تو جلد اوّل حیات دبیر میں ملینگے۔ باقی اکثر جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیگا۔ جو لکھی ہُوئی رکھی ہے۔ فقط چھپنے کی دیر ہے۔ مَیں نے مرزا صاحب کا دقیق سے دقیق اور سلیس سے سلیس کلام اس کتاب میں جمع کردیا ہے۔ بعض صاحب جو یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا تمام کلام دقیق ہوتا ہے۔ یہ خیال اُنہیں لوگوں کا ہے۔ جنہوں نے سب کلام اُن کا نہیں دیکھا۔ بلاغت۔ فصاحت۔ سلاست۔ متانت سب مرزا مرحوم کے کلام میں اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔ جب وہ سلیس نظم کہنے پر آتے ہیں۔ تو پھر ایسا بے تکلف اور بیساختہ کلام موزون فرماتے ہیں۔ کہ جس کو دیکھکر دُوسرے شاعر تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔ یہ تو اُس مرثئے کی شان تھی۔ جس کے موجد جناب میر ضمیر مرحوم اور مقلد اور اُس کو معراج کمال پر پہنچانے والے دبیرؔ و انیسؔ تھے۔ مگر فی زماننا جہاں اور چیزوں میں تغیر ہُوا۔ مرثیہ گوئی نے بھی کچھ پلٹا کھایا ہے۔ کچھ تو علمائے اعلام کی ہدایتوں کا اثر ہُوا۔ کہ جنہوں نے زیادہ مضامین خیالی اور بے اصل روایتوں کے بیان کرنیکی سخت ممانعت فرمائی۔ کچھ علوم جدیدہ نے خلاف عقل و عادت مبالغوں کو روکا۔ اور اب بجائے اُس رعایت لفظی کے جو بھری ہُوئی ہو مضامین عالی کی طرف

مرثیہ طرز دبیر

زیادہ توجہ ہوئی۔ صنائع و بدائع بھی اب وہی زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ جو بے تکلف ہوں۔ اور بے تکلف صنائع و بدائع نظم کرنا ہر شاعر کا کام بھی نہیں ہے۔ اس لئے اب یہ چیزیں مرثیہ طرز جدید میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ حقیر بھی اپنی تصنیف (مرثیہ) میں ان اکثر باتوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ گو میں کیا اور میرا کلام کیا +

اس موقع پر یہ بھی عرض کردوں۔ کہ حضرت دبیر کا ایک فیض تلمذ یہ بھی ہے۔ کہ فی زمانہ جن شعرائے اہلبیت نے مرثیہ کو خلعت تجدید بخشا۔ وہ بھی میرے علم میں مرزا صاحب کے شاگرد ہی ہیں۔ اور وہ بزرگوار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے مرثیوں میں اصل روایات و واقعات نظم فرمائے۔ اور بجائے رعایت لفظی کے مؤثر الفاظ لانے کو مقدم سمجھا۔ جناب موصوف کے مرثیوں میں فلسفیانہ مضامین کے ساتھ عرب کی شاعری کی وہ شان نظر آتی ہے۔ جس کے خوشہ چین آج اہل یورپ بھی ہیں۔ اخلاق حسنہ کی نئی شان سے (مرثیوں میں) مدح و ثنا در بد اخلاقیوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ اہلبیت اطہارؑ کے درجات عالیہ کا ہر مقام پر (اپنے والد ماجد مرحوم کی طرح) لحاظ رکھا ہے۔ بیجا مبالغوں سے کلام کو بہت بچایا ہے۔ اس طرف کے اکثر مرثیوں میں احادیث و سیر کے مضامین بعینہ اردو میں بلا تکلف نظم فرمائے ہیں۔ یہ زبان اردو پر انتہائی قدرت کا ثبوت ہے۔ ایک مرثیہ میں جہاں حضرت مسلم بن عقیل کے سفر کی تصویر کھینچی ہے۔ وہاں بالکل عرب کا وہ جنگل دکھا دیا ہے۔ جسمیں کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں نظر آرہے ہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو یہ نیچرل نظم ہے (یہ نہیں کہ باغ تو عرب کا دکھانا مقصود ہے۔ مگر پھول اُس میں جوہی اور بیلے کے دکھا رہے ہیں۔ جس کا اُس سرزمین پر نام بھی نہیں ہے)۔ اسی طرح سیکڑوں جدتیں فرمائی ہیں۔ جو اُن کے مرثیوں کے تتبع سے تعلق رکھتی ہیں۔ کمال یہ ہے۔ کہ ایسی پابندیوں کے ساتھ دنیا بھر کی اعلےٰ درجہ کی شاعری موجود ہے + (۲) جناب حکیم مولوی نفیر حسین صاحب عظیم مرحوم کے مرثیوں میں پابندی روایت کی اعلےٰ شان نظر آتی ہے + (۳) خان بہادر جناب مولوی سید علی محمد صاحب شاد (عظیم آبادی) مدظلہ نے (جن کو جناب مرزا صاحب مرحوم کی شاگردی پر فخر ہے۔ اور جنہوں نے باوصف کئی انقلابوں اور کئی دوستوں کی تحریک و ترغیب کے کسی دوسرے (صاحب کمال) کی شاگردی نہیں قبول کی۔ اور جو اس حقیر کو ایک سرفراز نامہ حال میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "مجھ کو میرا کانشنس بالکل صلاح نہیں دیتا۔ کہ میں ذرا بھی (مرزا صاحب کی) شاگردی کی حد سے تجاوز کروں۔ آپ بے تکلف یہ لکھ دیں۔ کہ مجھکو

اُنہیں کا فیض ہے"۔ ایک دُوسرے سرفراز نامہ میں زیب قلم فرماتے ہیں۔ کہ "مَیں اب واقعی یہ چاہتا ہُوں۔ کہ جناب مرزا صاحب مغفور کا خاک پا ہو کر کتاب میں جگہ پاؤں" کہ اپنے مرثیوں میں امور مذکورہ وغیرہ کی رعایت فرمائی ہے۔ مَیں مناسب سمجھتا ہُوں۔ کہ اِس موقع پر کچھ اُن کی نظم و نثر لکھ دوں۔ جو حقیر کے اصرار بلیغ پر اُنہوں نے عنایت فرمائی ہے (مفصل حال اور مفصل کلام جناب ممدوح کا آپ دُوسری جلد حیات دبیر میں ملاحظہ فرمائینگے۔ انشاءاللہ) +

ماخوذ سرفراز نامہ جناب شاد مدظلہ مورخہ ۲۱ رجنوری ۱۹۱۳ء سے

مَیں ہرگز اس کا مدعی نہیں ہُوں۔ کہ میرے مقابلہ میں کوئی نہیں ہے۔ لاحول ولاقوۃ الخ۔ بات یہ ہے کہ جو طرز مرثیہ گوئی کی میر ضمیر مغفور نے نکالی تھی۔ اُس کو مرزا دبیرؒ اور میر انیسؒ اوج کمال پر پہنچا گئے غیر ممکن ہے۔ کہ کوئی اُس حد تک پہنچ سکے۔ بجز اس کے کہ وہی باتیں اندک تغیر کے ساتھ پھر نظم کی جائیں جن کو سُنتے سُنتے پُرانے لوگ تو اُکتا گئے۔ اور نئے لوگ اصلیت کے جویا اور یورپ کا انداز شاعری پسند کرنیوالے کثرت سے پیدا ہونے لگے۔ اب وہ چبائے ہُوئے اور اُگلے ہُوئے نوالے کب پسند ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے اب آنکھیں اور ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ صحیح روایتوں سے تجاوز نہ ہو۔ اور کربلا کے واقعہ کی اخلاقی حالت میں ذرا بھی فرق نہ آئے" +

(۲) یہ جدّت نہایت ہی مشکل ہے۔ برسوں چاہیئے۔ کہ فلسفہ کی مختلف کتابوں اور یورپ والوں کے انداز بیان پر غور کرے۔ مختلف مذاہب کی کتابوں پر نظر ہو۔ اور کیا کیا عرض کروں۔ کہ کتنی معلومات اور کتنے درائج ہیں۔ ان پر عبور پیدا کر لینا آسان تھوڑا ہی ہے۔ باوجود ان سب کے یہ دیکھنا۔ کہ یہ فلسفیانہ و اخلاقی مضامین اس طریقے سے ادا ہوں۔ کہ اردو زبان کی شاعری کا مذاق قائم رہے +

(۳) غالباً شروع شروع لوگ نئے طریقے کو دیکھ کر سخت بھبانک ہونگے۔ مگر پٹنہ کے سمجھدار تو شائد ہی پُرانے انداز کو پسند کریں +

(۴) بہرحال میرا تو اب زمانہ آخر ہو چکا۔ اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ کوتاہی نہیں کی۔ اب قوم جانے اور قوم کے با فہم جانیں۔ ع یاد آئیگی تمہیں میری وفا میرے بعد +

(۵) میں نے ایک مرثئے میں حدود مرثیہ کو تمہید میں نظم کرکے پڑھا جس کے بعض بند آپ کے سننے اور کتاب میں داخل کرنیکے قابل ہیں۔ دوسرے کاغذ پر لکھ کر حاضر کرتا ہوں +

(۶) حسب عادت تین بجے شب کو اُٹھا جلد جلد سب کاموں سے فارغ ہوکر صرف نماز صبح پر کفایت کی اور یہ سب بند اور یہ خط آپکو لکھا غنیمت ہے کہ مزاج درست ہے +

(۷) شائقین دُور و نزدیک سے خدا جانے کس قدر اصرار کرتے ہیں مگر بخدا میں ایک مصرع بھی کسی کو نہیں لکھتا۔ خدا جانے آپنے کیا اعجاز کیا۔ کہ میں اس محنت پر قادر ہو رہا ہوں* +

(۸) جلد اوّل حیات دبیر میں جہاں آپ نئے طریقے کی مرثیہ گوئی کو تحریر فرمائیں ان کو ضرور داخل کریں جو ممکن ہے۔ کہ مرثیہ گویوں کو فائدہ پہنچے +

نظم جناب شاد مدظلہ

اے خضر شوق راہ حقیقت بتا مجھے	منزل پہ جو پہنچ گئے اُن سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بُو سے وہ ساغر پلا مجھے	جویا ہے جس کی رُوح وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقع صدق و صفا کہیں	وہ مرثیہ سُنا۔ جسے سب مرثیا کہیں
باتیں ہوں اِس طرح کی سمجھے اُسے زباں پسند	سُن کر جنہیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سُنا کئے ہیں جسے وہ کہاں۔ پسند	اب اہل بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوق سخن میں ذائقہ طبع کھو نہ جائے	اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے
یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام	جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیت کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معانی کا انتظام	نظروں میں ہوں تُلے ہُوئے سب موقع و مقام
تصنیف شعر کے لئے لازم شعور ہے	تقلید بے محل سے کنارا ضرور ہے

*نوٹ: یہ سب جناب شاد مدظلہ کی محبت و عنایت ہے۔ ورنہ میں کیا میرا عرض کرنا کیا۔ اس پیرانہ سالی میں یہ تکلیف شاد گوارا فرما کر کلام و حالات دیگر کتاب کی عزت بڑھائی ہے۔ جلد ثانی میں جناب ممدوح کے حالات و کلام پڑھ کر ناظرین بہت شاد ہونگے جناب شاد عجب باکمال شخص ہیں۔ خدا عمر میں برکت مع صحت عنایت فرمائے + مؤلف حقیر۔

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر
اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی ہنر
آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

(شاعرانہ مبالغہ)

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام
آسان سمجھ لیا ہے زمانے نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنعت میں داخل ہے لا کلام
لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مد نگاہ درد و غم جاں گزا رہے
گلدستۂ سخن نہ بنے ۔ مرثیہ ۔ رہے

(تشبیب)

مضموں نہ ہوں رکیک نہ الفاظ ہوں دقیق
تا ہو نہ جائے سنتے ہی سنتے ۔ دلوں کو ضیق
اعلیٰ ہو فکر شعر ۔ خیالات ہوں عمیق
لفظیں ہوں پُر اثر کہ دلوں کو کریں رقیق
مضموں وہ چُست ہو کہ مزہ صبح و شام دے
خلوت میں اک لئیق مصاحب کا کام دے

(مضامین والفاظ)

جب دشت ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار
مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار
بے آب خشک ہو گیا زہرا کا لالہ زار
بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار
باقی نہ جان تھی نہ لہو جسم زار میں
کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں *

(بہار)

ہے یہ بیان واقعہ شاہ خاص و عام
جانے نہ پائے ہاتھ سے سر رشتۂ کلام
اس ضمن میں شراب ولا کا گر آئے نام
بے جا کبھی نہ جام کے اوپر لنڈھائے جام
قطرے سے جو اس شراب کے ہوں خوں ناب ہوں
ساغر تو آنکھ میں ہو پر آنکھیں پُر آب ہوں

(ساقی نامہ)

ہے جن امور کا فن اخلاق میں جواز
ہے مرثیوں میں اُن صفتوں کا فقط مجاز
لازم ہے عامیانہ مضامیں سے احتراز
سننے کے ساتھ تاکہ ہوں سامع کے دل گداز
افسانہ مصائب شاہ زماں ہے یہ
اتنا رہے لحاظ کہ کس کا بیاں ہے یہ

(اخلاقی مضامین و عامیانہ مضامین)

* حقیر کے خیال میں اگر خالی بہار مرثیہ میں نظم ہو۔ تو محل اعتراض ہے۔ اور اگر اسکے ساتھ ساتھ مرثیت کے گوشے اور غم و الم کے کنائے اشارے بھی ہوں تو پھر وہ بہار بہار مرثیت ہے۔ اُستاد جو اہل سخن کی رائے ہو (حقیر نے جس مرثیہ میں بہار کہی ہے مرثیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا)۔ اور غور سے دیکھئے۔ تو خود اس بند حضرت استاد مدظلہ میں مرثیت کی بہار ہے۔ عجب مؤثر بند ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس طرح سے ہو حال شہ کربلا رقم
رکھے بہت سنبھال کے اس راہ میں قدم
تابع رہے خیال عقیدت نیوش کے
ماخوذ ہو صحیح روایت سے یک قلم
عاقل پل صراط سے سمجھے اسے نہ کم
آئے فریب میں نہ طبیعت کے جوش کے

ظاہر ہر ایک شے کا ہے ایک۔ ایک ہی بطوں
سمجھے کہ ہم ہیں کوئی صداقت ہیں رہ نموں
جان آتی ہے کلام میں معنی نغز سے
حاوی رہیں ہر اک پہ خیالات ذوفنوں
لفاظیوں سے باطن شے کا کرے نہ خوں
کس کام کا وہ پوست جو خالی ہو مغز سے

مضموں نہ آئیں وہ جو ہیں اخلاق سے بعید
یہ شاعری خزینۂ باطن کی ہے کلید
حقاً یہ کام اہل ریاضت کا کام ہے
ہر طرح جن کی منع میں تاکید ہے شدید
لازم ہیں اس کی حفظ میں بھی کوششیں مزید
نا اہل کو تو ہاتھ لگانا حرام ہے

عشق حقیقی

شاعر کے دل میں عشق کا جب تک نہ ہو گذر
اے عشق جلوہ گاہ ہے تیری بتا کدھر
حاصل جو سر میں کیف۔ تو دل کو سرور ہو
ہے مثل سرو نخل ریاض اُس کا بے ثمر
آنکھیں کہاں سے لاؤں جو آ جائے تو نظر
تو روشنی دکھا۔ تو اندھیرا یہ دور ہو

یہ تو مرزا صاحب کی مقبولیت اور مرثیہ سابق وحال کی بحث تھی۔ اب اس لائف (سوانح عمری) کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بعض بزرگوار ایسے بھی ملے۔ جو سوانح عمری لکھنا بے سود فرماتے ہیں۔ لکھنؤ میں مجھ سے ایک میرے دوست (شیعہ اور دبیرئے) نے فرمایا۔ کہ تم نے پانچ برس تک ناحق حیات دبیر لکھنے میں اپنا وقت ضائع کیا۔ کیا مرزا صاحب کے کمال سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ خود اُن کا کلام اُن کی لائف اور اُن کے کمالات کا مظہر و کاشف ہے۔ میں نے بجا و درست کہکر ٹال دیا۔ اسی طرح اور بھی چند شیعوں اور دبیریوں کو میں نے اپنی رائے کا مخالف پایا۔ مگر کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کی۔ اور یہی سمجھ لیا۔ کہ یہ بزرگ ابھی تک لائف کی ضرورت و نتائج سے بیخبر ہیں۔ اور اسی سبب سے اس کتاب میں مجھے ایسے روشن خیالوں سے بہت کم مدد ملی۔ مگر جہاں لکھنؤ میں ایسے ایسے حضرات (ضرورت زمانہ سے بیخبر) ستھے۔ وہاں بعض ایسے علم دوست

بھی ہے جنھوں نے میری محنت کی قدر کی۔ حالات بتانے میں مدد دی۔ کلمات تحسین و آفرین سے میرا دل بڑھایا۔ اور علاوہ شیعوں کے مجھے اکثر اہل سنت و جماعت اور اہل ہنود (حامیان علم و کمال) نے بھی مدد دی۔ جن میں سے مسٹر ہیرالال صاحب سود بی اے سب جج کوٹہ و منشی ہیرالال صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی جوڈیشل سکریٹری محکمۂ عالیہ خاص ریاست کوٹہ خاص طور پر قابل بیان و ادائے شکریہ ہیں۔ بعض میرے احباب نے میرے واسطے ایسی کتابیں مہیا فرمائیں جن کی اس کتاب کی تالیف میں بہت ضرورت تھی۔ ایسے قدردانوں میں جناب میر محمود حسن صاحب ثاقب دہلوی مقیم و وکیل درجۂ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ خاص طور پر قابل مدح ہیں۔ جن کے کتب خانہ سے بھی مجھے مدد ملی۔ اور جنہوں نے محض حیات دبیر کی تالیف کے واسطے بہت سی کتابیں خود خرید فرما کے مجھے دیں۔ اُن کے بعد قابل ذکر جناب حکیم سید احمد حسن صاحب مقیم کوٹہ مینیجر مطابق الشفا و طبیب ریاست سرمور ناہن و حکیم مولوی مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ اور مولوی سید نظیر حسن صاحب سخا دہلوی مشنری اسلام و فوٹوگراف مقیم ریاست جے پور ہیں۔ میں ان تمام صاحبوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں +

یہ بات بھی افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں۔ کہ جہاں ایسے ایسے صاحبوں نے مدد دی۔ وہیں بعض اہل علم نے میرے متواتر خطوں کا جواب ہی نہیں دیا۔ اور محض اظہار رائے سے بھی دریغ فرمایا۔ بعض صاحبوں نے جو حالات اُنکو زمانہ شاہی اودھ کے (مرزا صاحب کے متعلق) معلوم تھے۔ باوصف پوچھنے اور درخواست کرنے کے نہ بتائے۔ بعض صاحبوں نے شاگرد حضرت دبیر ہو کر اپنے حالات دینے سے بھی بخل فرمایا۔ اور جو نظر عنایت پہلے سے فرماتے تھے۔ اُس میں بھی کمی کی +

بعض ہمارے ہم مشرب جو اس تالیف کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ اُنکو یہ نعمت (کلام دبیرؔ) مجالس عزا میں اکثر حاصل ہوتی رہتی ہے۔ غالباً اِس بنا پر وہ ایسی کتاب کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔ بعض (اہل علم) سُنی اور ہنود جو اس کے مشتاق و قدرشناس زیادہ ہیں۔ اُسکی وجہ شاید یہ صحیح ہو۔ کہ وہ ضرورت زمانہ سے واقف ہیں۔ اور وہ اہل علم ہیں علم و کمال کی قدر فرماتے ہیں۔ اور ایسے کلام سُننے کا کم اتفاق ہوتا ہے + یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ شمس العلما مولوی شبلی صاحب کے بیجا اعتراضوں اور سالز امول کے جواب بھی میں نے مہذب و مؤدب الفاظ میں دئے۔ اور اُنکی سخت کلامی کا جواب بھی سخت الفاظ میں حتی الامکان میں نے نہیں دیا۔ میں مولوی صاحب کی کتاب کی اور بعض مقامات کی بھی تردید کرتا۔ مگر مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ دو مستقل کتابیں اور بھی اُنکی تردید میں اسی زمانے میں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک تو میرے اُستاد بھائی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس جھابن کی (المیزان) ہے۔ جو علی گڈھ میں چھپ رہی ہے۔ دُوسری جناب سیّد

موازنۂ مولوی شبلی صاحب

خود الفقار حسین خاں صاحب جونپوری کی کتاب ہے۔ کہ وہ بھی شاید عنقریب چھپے[1]۔ پس میں نے سوچا۔ کہ ضروری جوابات مولوی صاحب کو مَیں نے دے دئے ہیں۔ جو صاحب اس سے زیادہ مشرح اور سب لزامات کے جوابات دیکھنا چاہینگے۔ وہ اُن کتابوں میں ملاحظہ فرمالینگے۔ اور ان دونوں صاحبوں کو مجھ سے زیادہ فرصت بھی ہے۔ اور لیاقت بھی[2] ہے +

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب کو مَیں نے اُن بیجا اعتراضوں کے بھی جواب دئے ہیں۔ جو انھوں نے میر صاحب پر فرماکر اُن کے کمالات کو (جس کے وہ زبان سے معترف ہیں) مٹانا چاہا ہے۔ کیونکہ مَیں کمالات میر صاحب مرحوم کا بھی دل سے معترف ہوں۔ اور ہرگز اُن کی تنقیص بیجا کا روادار نہیں۔ البتہ عبدالغفور صاحب نساخ بنگالی کی کتاب انتخاب نقص کے اعتراضوں کا جواب مَیں نے نہیں دیا۔ اور اس وجہ سے بے ضرورت سمجھا۔ کہ اس کا جواب شافی تطہیر الاوساخ جناب مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم لکھنوی نے وقت پر دے کر سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں مطبع شعلہ طور کانپور میں چھپوا دیا ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اب مَیں اُن سے بہتر جواب نہیں لکھ سکتا +

اور جن غلط مرثیوں مصنفہ مرزا صاحب (مطبوعہ مطبع منشی نولکشور صاحب) کی بنا پر وہ اعتراضات تھے۔ وہ مرثئے بھی اب دفتر ماتم میں کچھ صحیح چھپ چکے ہیں۔ لہٰذا اب اُن کی تردید بیجا اصل اور طول لاطائل سمجھی گئی +

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ مَیں ایک انسان ہوں (جس کا لازمہ سہو و نسیان مشہور ہے)۔ پھر اُس پر طرہ یہ کہ بہت ہی کم استعداد ہوں۔ اور جو حالات مَیں نے سُنے یا شمس الضحےٰ وغیرہ میں دیکھے۔ وہی لکھ دئے۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ مجھ سے غلطی نہ ہو۔ جو صاحب میری کتاب کی کسی غلطی پر مطلع ہوں۔ براہ کرم مجھے آگاہ فرمائیں۔ اگر اعتراض صحیح ہوگا تو شکریہ کے ساتھ صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کرونگا۔ اور انشاء اللہ زندہ رہا۔ تو دُوسری مرتبہ کتاب چھپنے پر درستی کردونگا۔ اور (ایراد) بے بیجا و محض غلط ہوگا۔ تو جواب دُونگا۔

[1] علاوہ ان کے میری کتاب ملاحظہ کرنے کے بعد جناب حکیم احمد حسن صاحب سابق اڈیٹر الشفا مقیم کوٹلے نے بھی ایک مبسوط و بکار آمد مضمون اگست سنہ ۱۹۱۲ء کے روزانہ پیسہ اخبار کے دو پرچوں میں (موازنہ مولوی شبلی صاحب کے خلاف) چھپوا دیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] سُنا ہے کہ جناب صدر الافاضل (ممتاز الافاضل) مولوی سید سبط حسن صاحب قبلہ ادیب و محدث مقبول نے بھی موازنہ کا لا جواب جواب تحریر فرمایا ہے۔ مگر میں اب تک اُس کی زیارت سے مشرف نہیں ہُوا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور ناقابل ہوگا۔ تو پھر سکوت اختیار کرونگا۔ اور آیۂ کریمہ وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا*پڑھکر

معترض کو دُور سے ہی سلام کرلونگا۔ اِس موقع پر جناب سید انشاء مرحوم کا شعر یاد آگیا ۔ ؎

جب اُن نے گالی دی جُھک کر سلام میں نے کیا
جو پُوچھے تو بڑا آج کام میں نے کیا

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ اس کتاب میں بعض بعض واقعے کئی مقامات پر لکھ دئے ہیں ممکن تھا۔ کہ
دُوسری جگہ صرف حوالہ دے دیا جاتا۔ مگر میں نے اِس خیال سے کہ بڑی کتاب ہے (اور زمانے کی رفتار
یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ کتاب کو اخباروں کی طرح ایسی سرسری نگاہ سے لوگ دیکھتے ہیں۔ کہ واقعات
مابعد دیکھتے دیکھتے اکثر واقعہ اوّل الذکر خیال سے اُتر جاتا ہے) دوبارہ یا سہ بارہ ایک
واقعہ کو لکھکر ناظرین کو ورق لوٹنے اور ڈھونڈنے کی تکلیف سے بچایا ہے +

یہ بات بھی عام انشاپردازی زمانہ حال کے خلاف ہے۔ کہ اکثر اہل کمال کے نام یا تخلّص کے ساتھ
میں نے جابجا الفاظ جناب ۔ صاحب ۔ مرحوم ۔ مغفور ۔ قبلہ ۔ بارک اللہ رمسہ ۔ طاب ثراہ وغیرہ وغیرہ
لکھے ہیں۔ مگر یہ میری طرز تحریر ہے (میں نے اہل کمال کا نام اپنی عادت کے موافق ادب سے لیا ہے) ناظرین
کی نگاہ کو جو ایسے الفاظ کے پڑھنے میں کچھ تکلیف ہو۔ تو معاف فرمائیں +

اِس کتاب کے بعض مقامات پر یہ اعتراض بھی شاید بعض ناظرین فرمائیں۔ کہ بہت سی باتیں ایسی لکھ دی
ہیں۔ جن کا براہ راست حیات دبیر سے تعلق نہیں ہے ۔ مگر میں نے اسکی ضرورت سمجھی کہ جو بعض شعرا اِس زمانے
میں بغیر اصلاح اُستاد نیچرل یا قومی نظمیں کہتے ہیں۔ اُن کو وہ رموز و نکات شاعری بتادُوں۔ جو مجھے معلوم ہیں۔
اور حیات دبیر کی بدولت یہ فائدہ و فیض اُن لوگوں کو پہنچے ۔ جو اِس سے پہلے اُن باتوں سے واقف نہ ہوں +

اچھا اب ایک اور بات بھی سُن لیجئے ۔ ؎

مجھے ڈر ہے خود بیں نہ ہوجائے ثابت
بہت اپنے عیب و ہنر دیکھتا ہے

(یہ بھی کہدوں۔ کہ) جس شان سے میں نے صاف صاف کمالات دبیر مرحوم کا اس کتاب میں اظہار کیا ہے۔
اُسی طرح اُن کے نقصوں اور کمزوریوں کا بیان نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں کسی کمزوری کو باریک پیرایہ میں قبول کیا

*جب اُن سے جاہلوں نے خطاب کیا۔ تو اُنہوں نے کہدیا۔ سلام + ۱۲ مؤلف حقیر

ہے۔ ایک آزاد طبیعت کتاب دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ ایک رُخ تصویر کا اچھا ہے دُوسرا ایسا نہیں مگر اس کی وجہ بھی عرض کردوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب میں مرزا مرحوم کی کمزوریاں صاف صاف لکھتا۔ تو زمانے کی رفتار کے موافق اُن کے تمام معاصرین شعرا کی کمزوریاں بھی دکھاتا۔ تاکہ معلوم ہو جاتا کہ مرزا مرحوم کی کمزوریاں دُوسروں سے کم ہیں یا زیادہ۔ اِس صورت میں اُن تمام شعرا کی جو اُن اُستادوں کے شاگرد یا مقلد یا فدائی ہیں دلشکنی ہوتی۔ اور ملک بھر میں شعر و سخن کی ایک جنگ چھڑ جاتی۔ میرے نزدیک ابھی ہمارا ملک اس قسم کے نقائص اہل کمال سُننے کے لئے طیار نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں۔ پس یہ کام آئندہ نسلوں کے واسطے چھوڑ دیا ہے۔ اب رہی حسن اخلاق کی کمزوری۔ اِس باب میں مَیں نے سخت کوشش کی۔ اور اکثر جناب میر انیس مرحوم کے فدائیوں سے بھی حالات پُوچھے۔ مگر کسی نے بجز اوصاف حمیدہ کے مرزا صاحب کی بُرائی نہیں[2] بیان کی +

اِس کتاب کا نام حیات دبیر اور تاریخی نام سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ ہے۔ جس کے عدد سال تالیف کتاب سنہ ۱۳۳۰ھ (پُورے پُورے) نکلتے ہیں +

اچھا ناظرین!! خدا حافظ۔ اب کتاب کی سیر اور نامہ سیاہ ثابت کو دعائے خیر سے یاد فرمائیے +

۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۰ھ کو یہ دیباچہ لکھا تھا۔ مگر پھر اس میں کچھ کمی بیشی کی گئی۔ اور آج ۱۷ صفر سنہ ۱۳۳۱ھ کو اِس کام سے حقیر فارغ ہوا۔ اللّٰہ بس باقی ہوس + خاکسار بے بضاعت افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی سررشتہ دار عدالت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ ۔ و آخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین +

---

[1] مرزا مرحوم کے مختلف قلمی مرثیوں میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔ ایک قلمی مرثیہ کو دیکھ کر کسی مصرع یا الفاظ پر کوئی اعتراض سوجھتا ہے مگر جب دُوسرے شخص کا لکھا ہوا وہی مرثیہ دیکھا جاتا ہے تو وہ مصرع یا الفاظ ہی تبدیل نظر آتا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ کاتبوں نے بہت کچھ تصرف کیا اپنی عقل ناقص سے کام لیا ہے پس بہ سبب ایسا ہی دیر ہو جائیگی یا کم ہو جائیگی منتخب و صحیح کلام مرزا مرحوم کا چھپ نہ جائیگا جس کا ارادہ ہے انشاء اللہ اور شائع نہ ہو اس وقت تک جو اصلی عیوب یا عیوب شاعری معلوم ہونگے ان کا ظاہر کرنا نا مناسب ہوگا ۱۲ مولف

[2] ایسی صورت میں مَیں مجبور تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ بداخلاقیوں کے قصے اپنے دل سے گڑھ کر انکی طرف منسوب کر دیتا مگر میں اسکو خلاف ایمان سمجھتا ہوں اس لئے ایسا نہیں کر سکتا۔ اب چاہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ مرزا صاحب کو فرشتہ بنا دیا ہے۔ چاہے کتاب کا ایک رُخ خراب سمجھیں + ۱۲ مولف حقیر۔

ایک مختصر سی فہرست اسما بھی اس موقع پر لکھنا چاہتا ہوں جس سے اُن صاحبوں کو اس کتاب کی نظم (مرثیہ وغیرہ) پڑھنے میں مدد ملے۔ جو ان حالات سے ناواقف ہوں۔ کہ مرثیوں میں بار بار یہ نام آتے ہیں +

نمبر	نام	کیفیت
۱	اصغرؑ یا علی اصغرؑ	امام حسینؑ کے اُس دودھ پیتے ہوئے بچے کا نام ہے جسکو ایک لشکری فوج یزید حرملہ ابن کاہل اسدی نے امام حسینؑ کی گود میں تیر مار کر قتل کیا +
۲	اکبرؑ یا علی اکبرؑ	اُن شاہزادہ کا اسم قدسی ہے جو امام حسینؑ کے سب سے بڑے یا منجھلے فرزند اور سر سے پاؤں تک جناب محمد مصطفیٰ صلعم سے صورت اور عادات و خلاق و گفتگو میں مشابہ تھے۔ انکی عمر کم سے کم ۱۸ برس زیادہ سے زیادہ پچیس سال راویوں نے لکھی ہے +
۳	بانوؑ یا شہر بانوؑ	جہاں کہیں مرثیہ میں شہر بانو یا بانو آتا ہے زوجہ جناب امام حسینؑ سے مراد ہوتی ہے۔ یہ شاہزادی نوشیروان عادل کی نسل سے تھیں۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ معرکہ کربلا سنہ ۶۱ھ میں موجود بھی تھیں یا اس سے پہلے انتقال فرما گئی تھیں مرثیہ گویوں نے اور ازدواج امام حسینؑ جناب رباب مادر علی اصغرؑ و سکینہ و لیلے مادر علی اکبر کا بھی جہاں بیان ہے وہاں انکو بھی (اکثر) لفظ بانو سے تعبیر کیا ہے۔ گویا بانو کے اصلی معنی لئے ہیں۔ کہ امیر قوم کی زوجہ کو بانو کہتے ہیں +
۴	باقرؑ	امام حسینؑ کے پوتے جو معرکہ کربلا میں پانچ برس کے تھے +
۵	حُرؓ	حُر کے لفظی معنی آزاد کے ہیں یہ آزاد جوانمرد (کوفی) لشکر یزید میں تھا اور ایک ہزار یا پانچ ہزار آدمیوں کا افسر تھا۔ مگر اُس سب جاہ و حشمت کو چھوڑ کر اکیلا (یا اپنے بیٹے اور بھائی اور غلام سمیت) امام حسینؑ کے پاس چلا آیا پھر حضرتؑ کی طرف سے لشکر یزید سے داد جوانمردی دیکر لڑا بہت سے دشمن قتل کرکے شہید ہوگیا حر ابن یزید ریاحی ان بزرگوار حر کا نام نامی ہے +
۶	حبیبؓ یا حبیب ابن مظاہرؓ	یہ ایک مرد ضعیف اصحاب خاص جناب سرور کائنات صلعم سے (۳۵ سال عمر کے) معرکہ کربلا میں تھے۔ امام حسینؑ کی مدد کی۔ اور بہتیروں کو قتل کرکے شہید ہوگئے +
۷	جناب زینبؑ	امام حسینؑ کی حقیقی بہن ہیں جو معرکہ کربلا میں موجود تھیں اُن کے شوہر عبداللہ ابن جعفر طیارؓ تھے +
۸	حضرت عباسؑ	یہ امیر المومنینؑ کے فرزند ارجمند ہیں جنہوں نے امام حسینؑ سے ایسی محبت کا برتاؤ کیا جس کا نظیر تاریخ عالم میں نظر نہیں آتا۔ یہ لشکر امام حسینؑ کے علمدار تھے اور شجاعت میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے +
۹	عونؑ و محمدؑ	جناب عبداللہ ابن جعفر طیارؓ کے فرزند ہیں جناب زینبؑ کے بھی فرزند مشہور ہیں۔ اکثر مرثیہ گویوں نے بپسران زینبؑ انکو نظم کیا ہے +

نمبر	نام	کیفیت
۱۰	عونؓ و جعفرؓ	جناب امیرؑ کے فرزند حضرت عباسؑ کے ماں جائے بھائی ہیں +
۱۱	عثمان رضؓ	یہ بھی جناب امیرؑ کے فرزند ہیں۔ معرکہ کربلا میں شہید ہوئے ہیں +
۱۲	عبدؓ اللہ	" " " " "
۱۳	حضرت سکینہؑ	صحیح لفظ سُکَینہ بضم اول و فتح ثانی ہے۔ مگر تمام شعرا اردو نے بفتح اول و کسر ثانی مدینہ کے وزن قافیہ پر استعمال فرمایا ہے۔ یہ جناب امام حسینؑ کی ایک صاحبزادی تھیں۔ اور جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال فرمایا۔ انکا نام قابل اطمینان تحقیق نہ ہو سکا۔ بعض علماء عصر کے نزدیک انکا نام زینب ہے۔ اور شام میں جو روضہ جناب زینبؑ مشہور ہے وہ یہی زینبؑ بنت الحسینؑ ہیں۔ بہرحال شعراء اہلبیتؑ (اردو) نے اُن صاحبزادی کا بھی جہاں کہیں ذکر فرمایا ہے اُنکا نام بھی سکینہ لکھا ہے
۱۴	شیریں رضؓ	گو روایت بہت ضعیف ہے مگر مشہور یہ ہے (اور اسی کو تمام مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہے) کہ یہ جناب شہربانو مادر امام زین العابدینؑ کی کنیز تھیں۔ اور انکو جناب شہربانوؑ نے امام حسینؑ کے اشارے سے آزاد فرما دیا تھا۔ انھوں نے راہ شام میں ایک مقام پر سکونت اختیار کی تھی جب اہل بیتؑ اطہار شام کو مع سرہائے شہدا و امام زین العابدینؑ جا رہے تھے۔ تو انھوں نے اپنی شاہزادی کی خدمت میں آکر زیارت و خدمت کی تھی۔ اور ان کے گھر میں سر امام حسینؑ رہا تھا +
۱۵	جناب سید سجادؑ یا حضرت عابدؑ	امام زین العابدینؑ چوتھے امام ہیں۔ جو بروایت مشہور امام حسینؑ کے فرزند اکبر تھے۔ معرکہ کربلا میں بیمار تھے۔ یہ اسیر ہو کر شام کو تشریف لیگئے تھے +
۱۶	صغرٰیؑ یا فاطمہ صغرٰیؑ	یہ بھی امام حسینؑ کی صاحبزادی مشہور ہیں۔ اور گو یہ روایت ضعیف و غریب ہے۔ مگر مشہور ہے۔ کہ ان کو علالت کی وجہ سے امام حسینؑ نے مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا۔ تمام مرثیہ گویوں نے اس روایت کو یُوں ہی نظم کیا ہے +
۱۷	جناب کلثومؑ	یہ بھی جناب امام حسینؑ کی حقیقی (جناب زینبؑ سے چھوٹی) بہن تھیں۔ یہ عبید اللہ ابن جعفر طیارؑ کی زوجہ اور معرکہ کربلا میں اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھیں +

باسمہٖ سُبحانہٗ

ولہ الحمدُ والرّجُوعُ الیہ

والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ محمدؐ وآلہ الطّاہرینؑ

باب اوّل شجرۂ خاندان وحالات بزرگان حضرت دبیر

شجرۂ خاندان

ملا ہاشم شیرازی نثّار برادر عینی ملا اہلی شیرازی صاحبِ مثنوی سحر حلال۔

مرزا محمدؐ رفیع متخلص بہ رفیع

مرزا غلام محمدؐ

مرزا غلام حسین المتولد سنہ ۱۱۹۰ھ گیارہ سو نوّے ہجری بمقام شہر دہلی

۱ دختر جو میر ببر علی بجنوری کو منسوب ہوئیں متولدہ دہلی

- ۱ دختر زوجہ میر حسن علی مرحوم
- ۲ دختر زوجہ مرزا علی حسن مرحوم مترجم انگلش
- ۳ میر بسم اللہ
- ۴ میر فضل حسین
  - میر محمد صولت
  - دختر زوجہ حکیم آغا حسین سلمہ اللہ

۲ دختر جنکی ولادت بھی شہر دہلی کی ہے حکیم میر محمد حسین تحریز تخلص کو منسوب ہوئیں۔ لاولد رہیں

۳ مرزا غلام محمد نظیر۔ ولادت دہلی۔ وفات سنہ ۱۲۹۱ھ

- ۱ مرزا محمد عباس سفیر مرحوم
  - میر حیدر حسین
- ۲ محمد تقی
- ۳ محمد کاظم
- ۴ یک دختر

۴ **مرزا سلامت علی دبیر مرحوم**

المتولد ۱۱ رجمادی الاول سنہ ۱۲۱۸ھ بارہ سو اٹھارہ ہجری بمقام دہلی۔ محلہ بلّی ماراں

المتوفی۔ ۳۰ رمحرم سنہ ۱۲۹۲ھ بارہ سو بانوے ہجری

مدفن شہر لکھنؤ۔ محلہ نخاس جدید اپنے مکان میں دفن ہیں۔ اب یہ گلی کوچۂ دبیر کہلاتی ہے ۔

مرزا سلامت علی دبیر رحمہ اللہ

۱

دختر

جو میر بادشاہ علی مرحوم بقا پسر میر وزیر علی صبا مغفور کو منسوب ہوئیں

۲

مرزا محمد جعفر صاحب اوج مدظلہ

المتولد ۱۸ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ

۳

مرزا محمد ہادی حسین عطارد مرحوم

المتولد ۵ شعبان ۱۲۷۲ھ

المتوفی ۲۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ

(اوج کی اولاد)

۱ — مرزا محمد طاہر رفیع سلمہ

ملازم دربار رامپور

مرزا محمد ذاکر عرف آغن صاحب متخلص ذاکر جن کی والدہ دختر عطارد مرحوم ہیں

۲ — دختر جو نواب حسن علی خاں عرف اچھے صاحب سلمہ کو منسوب ہیں یہ نسل مالک اشتر اور خاندان بہو بیگم صاحبہ و نواب حیدر بیگ خاں مرحوم سے ہیں۔ سوزخوانی میں میر بندہ حسین صاحب مرحوم کے شاگرد اور کامل ہیں

نواب مرزا محمد مہدی علی خاں عرف کجن صاحب المتولد شب نیمہ شعبان

(عطارد کی اولاد)

۱ — مرزا عبد الحسین شفیع عرف ابو صاحب ملازم دربار رامپور

۲ — دختر جو مرزا محمد طاہر کو منسوب ہیں (والدہ آغن صاحب سلمہ)

حالات بزرگانِ مرزا صاحب

شجرۂ خاندان میں اُوپر لکھ چکا ہوں۔ اُس کے ملاحظہ سے واضح ہوگا۔ کہ مرزا صاحب کے جدِ اعلےٰ ملا ہاشم شیرازی ہیں۔ جو ملا اہلی کے حقیقی بھائی تھے۔ جس طرح ملا اہلی نظم میں یکتائے زماں تھے۔ ملا ہاشم نثر میں وحید دوراں تھے۔ ملا اہلی کے حالات کتاب مستطاب مجالس المومنین مصنفۂ قاضی سید نوراللہ شوستری شہید ثالث علیہ الرحمہ سے (جن کا مزار مقدس اکبرآباد آگرہ میں زیارت گاہ مومنین ہے) معلوم ہوسکتے ہیں شہید ثالث رح نے ملا اہلی کا ذکر اُن شعرائے کاملین میں کیا ہے۔ جو ائمۂ اطہارؑ کے مشہور مداح ہیں۔ مَیں بہت مختصر اُن کے حالات لکھتا ہوں۔ کہ میری کتاب طولانی نہ ہو جائے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ملا اہلی شعرا و فضلا میں مشہور اور فقر و مسکنت اور بے التفاتی اہل دنیا میں معروف ہیں۔ اکثر شاعروں سے مہارت فن شعر کے سبب سے امتیاز رکھتے تھے۔ ہر وقت شعر کہتے تھے۔ ایسی مثنوی سحرِ حلال کہی ہے۔ کہ ہر شعر میں دو قافیہ ہیں۔ اور ہر شعر دو بحروں میں پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کی عقل حیران ہے۔ سلمان ساوجی کے مشہور قصیدۂ صنعتی کے جواب میں ایک قصیدہ میر علی شیر کے نام پر کہا۔ اُس میں چند صنعتیں قصیدۂ سلمان سے بھی زیادہ ہیں۔ خود میر علی شیر نے دادِ انصاف دے کر کہا۔ کہ سلمان سے بہتر کہا ہے۔ اہلی کا دیوان غزل مسلّم اربابِ نظر ہے۔ شعر سعدی کی چاشنی اُن کے کلام میں ہے۔ اس کے بعد چند مشہور قصائد اہلی کے مطلع لکھ کر تحریر فرمایا ہے۔ کہ ان سے ولایت شاہ ولایت اور خلوص نیت ملا اہلی علیہ الرحمہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک انکی یہ رباعی بھی ان کے حسن عقیدت پر دلیل ہے۔

(رباعی اہلی)

یارب سگ کوئے مقبلی ساز مرا + آئینہ زعشق منجلی ساز مرا

فصل اوّل ملا اہلی رح کا حال

اقبال جہاں مرا جوے نیست قبول + مقبول محمدؐ و علیؑ ساز مرا

تیسرے مصرع سے یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ طبیعت میں مال دُنیا سے کس قدر تنفر تھا۔ ملا اہلی نے بڑھاپے میں بمقام شیراز سنہ نو سو بیالیس ۹۴۲ ہجری میں وفات پائی۔ مُلّا میرک نے جو اُن کی تاریخ وفات کہی ہے۔ وہ یہ ہے:۔

قطعۂ تاریخ وفات اہلی رحمہ اللہ علیہ

درمیان شعراؤ فضلا + پیر باصدق وصفا بود اہلی

رفت با مہر علیؑ از عالم + پیرو آل عبا بود اہلی

سال فوتش زخرد جستم وگفت + بادشاہ شعرا بود اہلی

اور تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی مدح لکھ کر اتنا زیادہ لکھا ہے۔ کہ اُن کا مرقد شیراز میں خواجہ شمس الدین حافظ شیراز کے پہلو میں ہے۔ حقیر (ثابت) نے اس موقع پر عرض کیا ہے

طبع حافظ سے نہ کم تھی طبع اہلی شعر میں + مر کے بھی پہلو نشیں ہیں حافظ شیراز کے

اور مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔ کہ وہ خواجہ حافظ و مرزا نظام دست غیب کے پاس ایک ہی مقبرہ میں دفن ہیں۔ اور سنگ مزار پر یہ غزل کندہ ہے

جانم بروز واقعہ پہلوے او کنید + او قبلۂ من ست زخم سوے او کنید

مؤلف حقیر کہتا ہے۔ کہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے۔ کہ جس طرح مُلّا اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال ایرانیوں میں لاجواب مانی جاتی ہے۔ اور صنائع و بدائع و بلاغت کی جان ہے۔ اُسی طرح صفائی بندش وحسن بیان ولطف زبان میں میر حسن مرحوم کی مثنوی ہندوستانیوں میں بے مثل مانی جاتی ہے یہ اور عجیب و غریب حسن اتفاق ہے۔ کہ اس

---

[1] اس تذکرہ میں بھی اہلی کی بہت کچھ مدح و ثنا لکھی ہے۔ مگر میں نے طول کے خوف سے زیادہ لکھنا غیر ضروری سمجھا ۱۲ ثابت

مثنوی اردو کا نام بھی اُس سے ملتا جلتا ہُوا سحر البیان ہے۔ ان دو سحر بیان (اہلی و حسن) کی اولاد میں دو ایسے بزرگوار پیدا ہوئے جن کو ملک نے اعجاز بیان مانا ہے۔ ایک مرزا دبیر ہیں جن کے یہاں تمام صنائع و بدائع اور بلاغت کے نکات موجود ہیں۔ دوسرے میر انیس ہیں جن کا کلام فصاحت و سلاست میں آپ اپنی مثال ہے +

فصل سوم / اسناد و خطوط

اسناد و خطوط

کتاب شمس الضحٰی[۱] میں اور اُس کے بعد تنقید آب حیات[۲] میں چند فرمان شاہان دہلی کے اور چند خطوط امرائے دہلی کے درج ہیں۔ اور ایک استشہاد بھی چھپا ہے جس سے مرزا صاحب کے بزرگوں کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے میں انہی فرمانوں اور خطوط وغیرہ سے حالات لکھتا ہوں +

یہ استشہاد اُس زمانہ میں مرتب ہُوا تھا کہ جب مرزا غلام حسین (پدر مرزا صاحب) دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اور لکھنؤ میں شادی کرنا چاہا۔ بزرگوں کی پوچھ پانچھ ہوئی۔ اور مرزا غلام حسین دہلی و آگرہ گئے۔ اور وہاں سے شہادت نامہ لکھوا کر لکھنؤ میں لائے۔ یہاں بھی جو لوگ اُن کے خاندان سے واقف تھے اُنھوں نے شہادت ثبت کی۔ یہ تیرھویں صدی کے شروع کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ اس شہادت نامہ سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) مرزا صاحب کے آباؤ اجداد شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر سرفراز و ممتاز رہے۔ پھر زمانہ کی ناموافقت کے سبب سے دہلی و اکبر آباد (آگرہ) میں وارد ہوئے +

(۲) مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابو ظفر خاں حقیقی نانا مرزا غلام حسین کے ناظم صوبہ کشمیر

---

[۱] شمس الضحٰی مرزا دبیر صاحب کے حالات میں مولوی میر صفدر حسین صاحب کی تصنیف عہد شاہی کی مطبع حسینی میر عابد علی صاحب میں اب سے عرصہ پہلے چھپ چکی ہے +

[۲] تنقید آب حیات مؤلف کے نانا میر محمد رضا طبیر مرحوم کی ایک مختصر کتاب ہے۔ جو مدت ہوئی کہ چھپ چکی ہے۔ آب حیات میں جو مرزا صاحب کے حالات غلط درج تھے۔ اُن کی تصحیح فرمائی ہے +

کے تھے۔ اور مرزا غلام حسین کے ماموں مرزا شہامت علی خاں شہزادگان دہلی کے اُستاد اور خط نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے +

(۳) جد امجد مرزا محمد رفیع عہدہ منشی (میر منشی شہنشاہ دہلی) پر سرافراز تھے۔ اور والد ماجد (مرزا غلام محمد مرحوم) بھی صاحب اقتدار تھے +

(۴) جب شہر دہلی متواتر تاراج و غارت ہونیکے سبب سے قابل قیام نہ رہا۔ تو مرزا غلام حسین مرزا افضل علی خاں ابن مرزا فتح علی خاں کے ہمراہ [جنہوں نے مرزا غلام محمد (پدر مرزا غلام حسین) کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھا تھا] لکھنؤ تشریف لائے +

اس شہادت نامہ کی پیشانی پر شاہ عالم بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت ہے۔ مُہر سے اُوپر جو عبارت شہادت مرقوم ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے "درحقیقت ان کے بزرگ شرفائے شیراز سے تھے۔ اور ابدولت کی سرکار میں عہدہ ہائے جلیلہ پر سرافراز و ممتاز تھے" اس کے بعد حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب مجتہد اول لکھنؤ اور مرزا کاظم علی صاحب محدث اور حسن رضا خاں صاحب نائب صوبہ اودھ اور نواب ضیاء الدولہ آفتاب جنگ محمد نور اللہ خاں کی شہادت اور مہریں ہیں۔ ان سب بزرگوں نے مرزا غلام حسین کو خلف مرزا غلام محمد ابن مرزا محمد رفیع ابن ملا ہاشم شیرازی لکھ کر صاحبان عزت و شرافت سے لکھا ہے۔ نواب آفتاب جنگ نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا غلام حسین کی والدہ کی نانی اور میری نانی حقیقی بہنیں تھیں۔ اس کے بعد سید فرزند علی اور مرزا رحمت علی خاں اور امجد علی خاں اور نواب مسیح الدولہ خاں

ف ۱ مخدومی مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنوی اور محسنی حاجی ڈپٹی سید جعفر حسین صاحب جعفری بیرسٹری سابق ممبر کونسل کوٹہ وجے پور کے ارشاد کے موافق اصل شہادت نامہ و فرمان شاہی کی نقلیں بھی اس کتاب میں چھپوائے دیتا ہوں جو اس سے پہلے شمس الضحیٰ و تنقید آب حیات میں بھی چھپ چکی ہیں۔ کہ یہ چیزیں بطور یادگار زمانہ سابق ہیں + مؤلف حقیر۔

ف ۲ مرزا کاظم علی ایک مشہور عالم اخباری شیعہ تھے۔ مرزا دبیر نے ان سے بھی پڑھا ہے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق صاحب شاہ اودھ انہیں کے فرزند ارجمند تھے۔ جو ناسخ مرحوم کے ارشد تلامذہ سے تھے + ۲ اثابت

شارح اعجاز خسروی اور نواب مختار خاں[۱] (برادرزادہ نعمت خاں عالی) کی گواہیاں اور مہریں ہیں۔ بعد ازاں فضل علی خاں[۲] عرف آغا خاں ابن فتح علی خاں کی مہر ہے جس میں یہ مصرع سجع ہے ع امید شفاعت ز فضل علی ست۔ اور علی مراد خاں[۱۲] داروغہ دیوان خانہ شاہ عالم اور امین الدین[۱۳] علی اور مرزا محمد باقر[۳] اور سید احسن اللہ خاں[۱۵] کی شہادت اور مہریں ہیں۔ یہ تو استشہاد کی کیفیت تھی اب میں جو مضامین فرمانوں سے مستنبط ہوتے ہیں اُنکا خلاصہ (ذیل میں) اُردو میں لکھتا ہوں:۔

۱۔ پہلا فرمان شاہ دہلی (شاہ عالم) کا مورخہ سوم رجب ۱۱۷۵ھ مطابق سنہ ۳ جلوس سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) مرزا غلام محمد (مرزا دبیر مرحوم کے دادا) کو بادشاہ نے "فضیلت و شریعت مآب تقویٰ وصلاح دستگاہ" تحریر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کے دل میں اُن کی کس قدر عظمت تھی۔ اور اُن کے والد ماجد کا نام مُلّا محمد رفیع اور دادا کا نام مُلّا محمد ہاشم شیرازی درج فرمان شاہی ہے +

(۲) تعریف دیانت میں لکھا ہے۔ کہ خود را بانتہائے تدیّن رسانیدہ[۴] +

(۳) یہ لکھا ہے کہ خدا کی عبادت کے شوق میں مناصب جلیلہ کو ترک کر دیا +

(۴) یہ کہ ان کے نانا عنایت اللہ خاں ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر کے اور ان کے

ف۱ نواب مختار خاں نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ میں نے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھا ہے +

ف۲ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا غلام حسین نے میرے والد ماجد کی مہمانداری چند روزہ کے عوض مجھ پر بہت احسان کئے ہیں۔ ایک اُن میں سے یہ ہے۔ کہ آج کل میں انہیں کے مکان میں رہتا ہوں دیکھئے اُس زمانہ کے لوگ احسان کا بدلہ کس عمدگی سے ادا کرتے تھے اور اُسکا اقرار کس صفائی سے فرماتے تھے ہمارے زمانہ میں احسان کا شکریہ ادا کرنا گویا بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے۔ افسوس کیا انقلاب زمانہ ہُوا +

ف۳ معلوم نہیں یہ مرزا محمد باقر مولوی محمد حسین آزاد صاحب آب حیات کے والد ماجد ہیں یا دوسرے بزرگوار ہیں +

ف۴ اس سے بڑھ کر ایک دیانت دار منشی کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُنکی دیانت معراج کمال پر بادشاہ کی نظر میں پہنچی ہوئی تھی جس سے بڑھ کر دیانت نہیں ہو سکتی + ۱۲ ثابت

ماموں شہامت علی خاں شاہزادوں کے اُستاد۔ اور جد امجد مُلا محمد ہاشم منشی سلطنت ہندوستان کے تھے +

(۵) اسی سند میں لکھا ہے کہ چار لاکھ اٹھاسی ہزار ایک سو بیس دام جو چار ہزار سات سو اکتیس روپیہ کے برابر ہوتے ہیں ان کو (بطور پنشن) ملتا ہے۔ ہر سال نئی سند نہ طلب کیجائے [ف۱] +

۲۔ دوسرا فرمان بھی شاہ عالم بادشاہ دہلی کا ہفتم ماہ رمضان سنہ ۱۱۹۰ھ (گیارہ سو نوّے) کا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مُلّا غلام محمد (نواده ملا ہاشم شیرازی) کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ غلام حسین (پدر مرزا دبیر مرحوم) نام رکھا گیا۔ مصارف دایہ کے واسطے سو روپیہ ماہوار (پُرانے سکّہ کے) مقرر فرمائے گئے [ف۲] +

مرزا غلام حسین کی لکھنؤ میں حالت عسرت یا ثروت

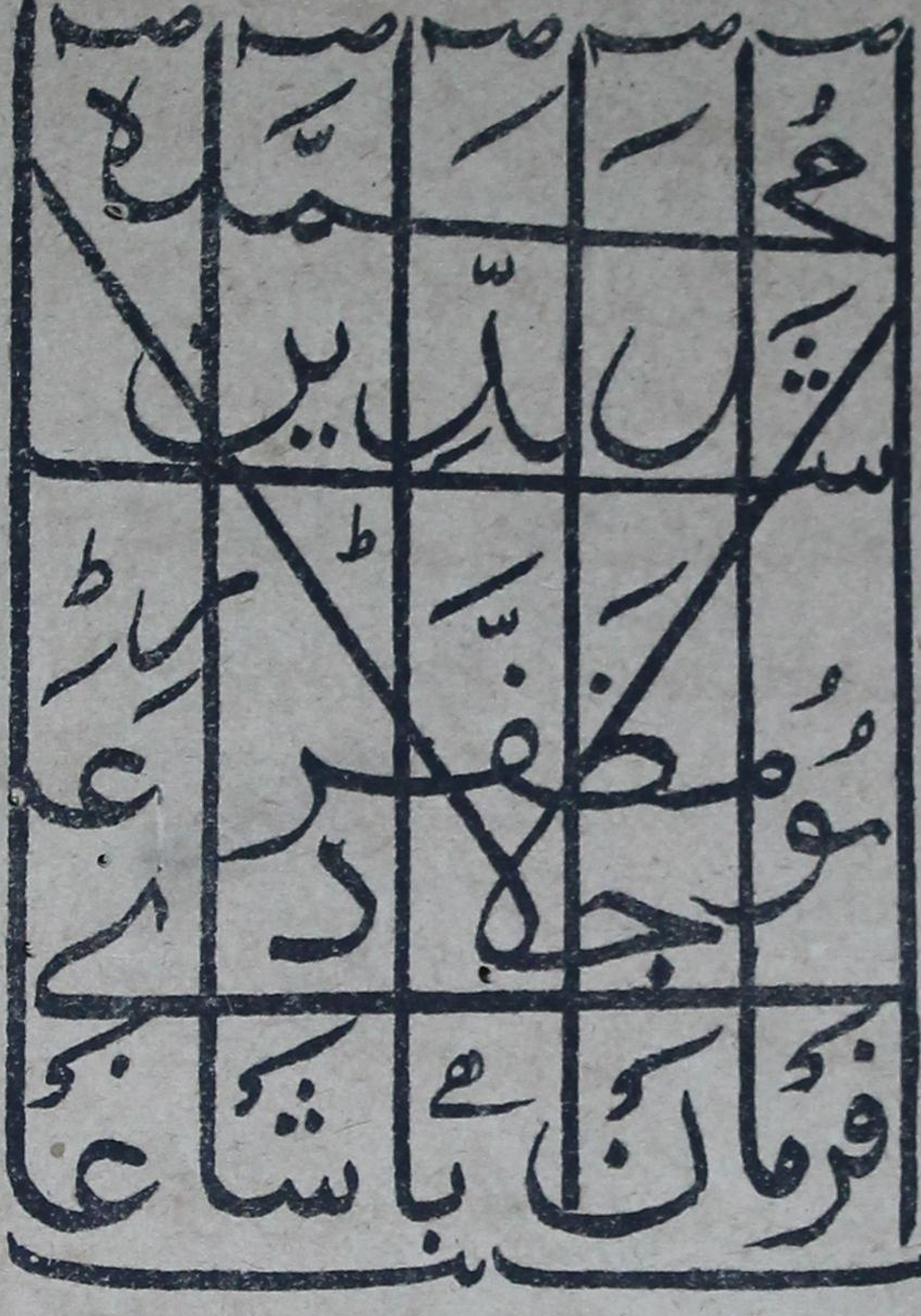
اس موقع پر شاید ناظرین کتاب کو یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب پریشانی کے عالم میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے ضرور مبتلائے عسرت ہونگے۔ ہر چند عسرت و افلاس شرفا اور اہل کمال کی بے عزتی کا سبب نہیں ہو سکتے۔ مگر از بسکہ میرا فرض واقعات کا لکھنا ہے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ کہ مرزا غلام حسین باوصف عسرت کے صاحب ثروت تھے۔ ناظرین آپ تعجب کرینگے۔ کہ یہ تو اجتماع نقیضین معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور و تامل سے سُنئے۔ عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے۔ کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں مرزا غلام حسین

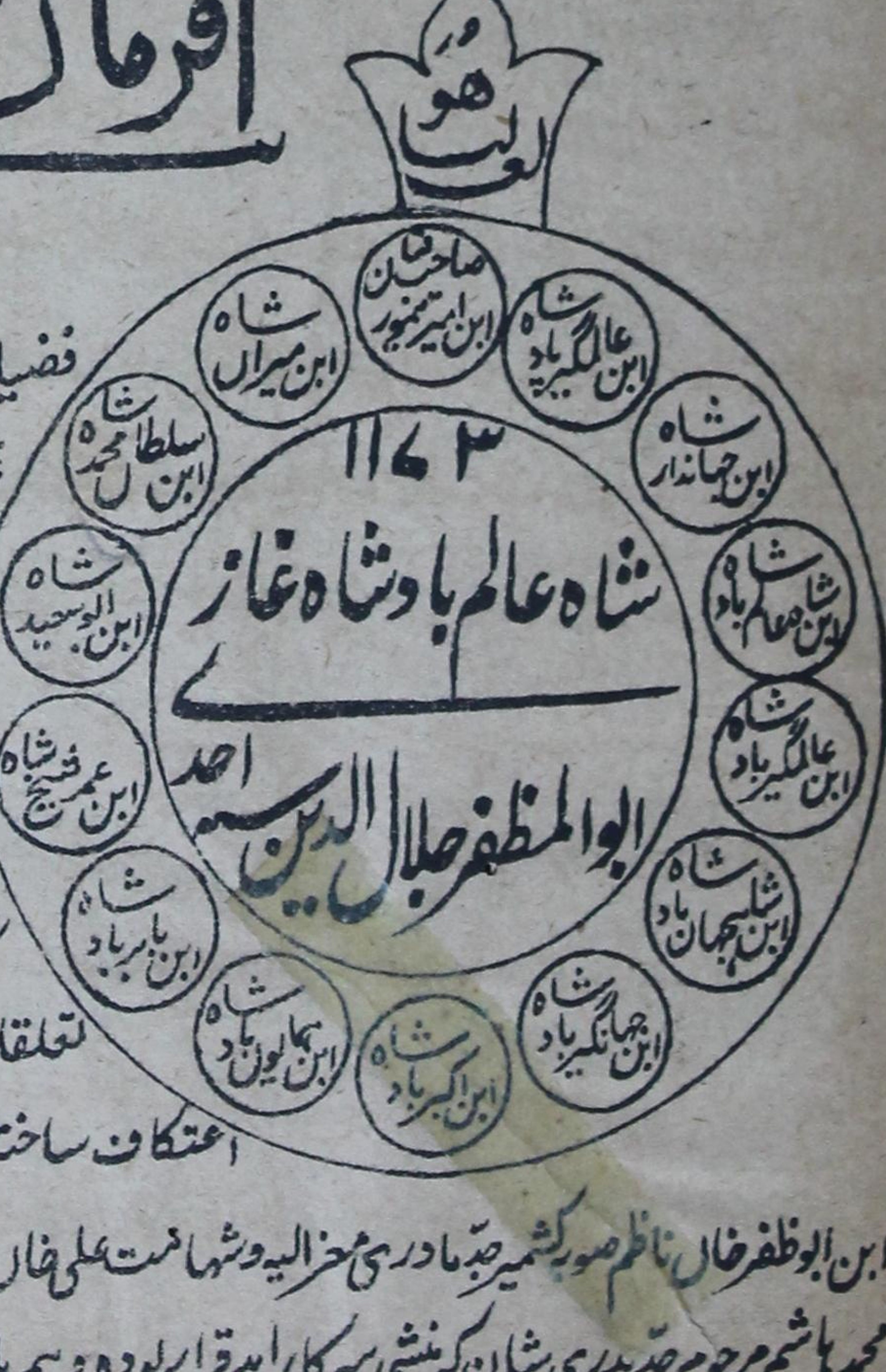
ف۱ ان ملا محمد المتخلص بہ رفیع کا ایک قصیدہ نعت و منقبت میں کتاب روضۂ رضوان مطبوعہ بستان مرتضوی میں چھپا ہے۔ جو کتاب سنہ ۱۳۰۲ ہجری کی مطبوعہ ہے۔ سید محمد صفدر صاحب رئیس اناؤ نے یہ ملک پر احسان کیا ہے۔ کہ تمام شعرائے ایران و ہندوستان کے قصاید نعت و منقبت میں سے اکثر اعلے درجہ کے قصیدے ایک جگہ جمع کر دئے ہیں۔ رفیع مرحوم کا قصیدہ صفحہ ۸ پر ہے اُس کا مطلع یہ ہے۔ اے شہنشاہ دینے ملک وتدتے کشور + والضحےٰ روے و قمر طلعت و النجم افسر +

ف۲ اس فرمان سے ولادت مرزا غلام حسین کی سنہ ۱۱۹۰ ہجری کی پائی جاتی ہے +

نقل فرمان شہنشاہی متذکرہ حیات دبیرؔ صفحہ ۶

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالیٰ





چوں بعرض مقدس و معلےٰ رسید کہ
فضیلت و شریعت مآب تقویٰ و صلاح دستگاہ
غلام محمد ابن مُلا محمد رفیع ولد ملا محمد ہاشم شیرازی
مناسب جلیلہ سرکار از خیال مآل اُخروی
رضیہ برضائے جناب باری عز اسمہ
و مابدولت و اقبال بانتہائے تدین کمال
رسانیدہ باکراہ فانی از ترک مناسب متعلقہ
لتعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الوجود
اعتکاف ساختہ۔ لہٰذا الصوابدید قدامت عنایت اللہ خاں
ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر جدّ مادری معز الیہ و شہامت علی خاں خال استاد شاہزادہ ہائے ہمایوں و ملا
محمد ہاشم مرحوم جدّ پدری شان کہ منشی سرکار ابد قرار بودہ وہم باثبات حقوق خدمت گذاری ہائے
شان برضاجوئی خلّاق عالم و کسب ثواب اُخروی کہ خاصہ سلاطین و فرمان روایان پیشین بودہ است

بنظر مراتب صدر چہار لک وہشتاد وہشت ہزار یک صد وبست دام بتعداد چہار ہزار ہفتصد و
سی ویک روپیہ از پرگنہ حویلی دار الخلافت شاہ جہان آباد در وجہ مدد معاش متعلقان مشار الیہ بافرزندان
بطریق التمغا از نصف خریف پارس ئیل حسب الضمن مقرر باشد . باید کہ فرزندان کامگار والاتبار و امرای
عالیمقدار ومتصدیان مہمات وجاگیرداران وکروڑیان حال واستقبال وجہ مذکور نسلاً بعد نسلٍ وبطناً
بعد بطنٍ بتصرف فرزندان ومتعلقان مشار الیہ بازگذارند واز جمیع وجوہ عوارض مرفوع القلم شمارند
دریں باب ہر سال مجدّدنہ طلبند .

سیوم شہر رجب المرجب سنہ ۱۱۷۵ ہجری مطابق سنہ ۳ جلوس والاتحریر یافت .

۱۱۷۴
شاہ عالم بادشاہ غازی
کمترین بندگان سنہ ۲
منیر الامرا

۱۱۶۷ عالمگیری
فدوی بادشاہ غازی
بہادر جنگ شجاع الدولہ ابو
جلال الدین حیدر خاں

برسالہ شرافت ونجابت مرتبت امارت
وایالت منزلت فرازندہ لوای
شوکت وحشمت طرازندہ بساط
ابہت وعظمت اعتضاد خلافت
وفرمانروای اعتماد سلطنت وکشورکشای
معرکہ آرای جہانبانی عیش آرای محافل
کامرانی جوہر حقیقت وفافروغ
شمع یکرنگی وصفا ہمدم انکشای مجلس
خاص محرم خلوت سرای صدق واخلاص
کارفرمای سیف والقلم مدبر امور عالم زبدۂ فدویان
خوانین بلند مکان عمدۂ امرای عظیم الشان وزیر
صائب تدبیر ممالک مدار منیر روشن ضمیر
عالیمقدار لازم اختصاص والاعزاز واجب الاحترام
والاتنیاز رکن السلطنت بادشاہ
سلیمان اقتدار وزیر الممالک عمدۃ الملک
مدار المہام اعتماد الدولہ آصف جاہ
برہان الملک ابو المنصور خاں صفدر جنگ
شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر بہادر جنگ سپہ سالار رستم ہند .

مطابق ۳ جلوس والا

۳ جلوس والا
فی التاریخ
۲۱ رجب المرجب

شاہ عالم ۱۱۷۵
فدوی بادشاہ غازی سنہ ۳
خانہ زاد خان بہادر

وے الساز ۳ جلوس معلے مطابق ۱۱۷۵ ہجری
بست و چہارم شہر رمضان المبارک

نقل خط انور آنکہ

یادداشت شرح دستخط نائب وزیر الممالک حسنۃ الملک مدار المہام مطابق صاد خاص فرمان والاشان بنویسند

شرح ضمن و خالق رغبت طاعت حضرت

واجب الوجود بعزت نسبت فضیلت شرعیہ تقوے وصلاح دستگاہ غلام محمد ابن ملا محمد رفیع ولد ملا محمد ہاشم شیرازی بترک مناصب سرکار قدسی وتعلقات سعادت

مطلع البصار کرامت عاکفان سریر خلافت گشتہ بخاصہ سلاطین از مزید مرحمت خاقانی بتعیین چہار لک و ہشتاد و ہشت ہزارہ

نکیصد و بست دام بقیدہ چہار ہزار و ہفت صد و سی دیگر

در بیہ از پرگنہ دار الخلافت شاہجہاں آباد در وجہ مدد معاش

متعلقان ملا مذکور باز فرزندان بطریق التمغا من ابتدائے

نصف خریف بارش نیل ۱۱۲۷ فصلی بلا قید ساحی و قیمت عوض

بصاد خاص بدفتر رسید تنصدیان دار الانشا بموجب دستخط خاص کرامت

اختصاص بلا عرض ثانی فرمان والاشان قلمی نمایند

[illegible]

نقل فرمان شہنشاہ دہلی محولہ حیات دبیرؔ صفحہ ۶





دریں وقت میمنت اقتران زو قالع مولود فرزند ملا غلام محمد نواده ملا ہاشم شیرازی بہ نام نہاد مسمی غلام حسین بسمع ہمایوں رسیده حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازن خزانہ عامرہ سلطانی بارشاد ماموری یکصد روپیہ سکہ کہنہ ماہانہ مصارف مرضعہ و غیرہم شرف صدور یافت موجہ حاسبان دفتر دیوانی سرکار معلے سوائے ماہانہ ملا غلام محمد محسوب بسنین پیشین ماہانہ ہذا المصارف مرضعہ ہا و غیرہم غلام حسین مولود حال بخازن خزانہ خاقانی بمجرائے مجدد مجرا داده قبض مہری غلام حسین بہ دفتر داشتہ باشند۔ دریں باب ہر سال سند مجدد نہ طلبند۔

ہفتم شہر رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۰ ہجری مطابق سنہ ۱۸ از جلوس والا تحریر یافتہ۔

نقل فرمان

برسالۂ شرافت و نجابت مرتبت امارت و ایالت منزلت فرازندہ لوای شوکت و حشمت طرازندہ بساط ابہت و عظمت عقیدت فطرت خلافت ارادت اعتضاد خلافت و فرمانروائی اعتماد سلطنت و کشورکشائی معرکہ آرای جہانبانی عیش آرای محفل کامرانی جوہر مرآت حقیقت و فا فروغ شمع یکرنگی و صفا ہمدم دلکشا مجلس خاص محرم خلوت سرای صدق و اخلاص کارفرمای سیف و القلم مدبر امور عالم زبدۂ فدویان خیر اندیش بلند مکان عمدۂ امرای عظیم الشان زبدۂ تدبیر جہانگیر روشنضمیر عالیمقدار لازم الاختصاص و الاعزاز واجب الاحترام و الامتیاز رکن السلطنۃ بادشاہ سلیمان اقتدار وزیر الممالک جملۃ الملک مدار المہام اعتماد الدولہ آصف جاہ برہان الملک ابو المنصور خان صفدر جنگ شجاع الدولہ یحییٰ خان آصف الدولہ بہادر ہزبر جنگ سپہ سالار رستم ہند۔

شاہ عالم بادشاہ غازی ۱۱۸۵ جناب یار وفادار سپہ سالار رستم ہند فدوی جنگ یحییٰ خان آصف الدولہ بہادر ہزبر الملک شجاع الدولہ ابو المنصور خان صفدر الملک اعتماد الدولہ آصفجاہ برہان وزیر الممالک جملۃ المدار المہام سنہ ۱۸

فی التاریخ ۲۷ رمضان سنہ ۱۸ جلوس واللہ

شاہ عالم ۱۱۷۸ فدوی بادشاہ غازی سنہ ۸ خانہ زاد خان بہادر

فی التاریخ ۲۷ شہر رمضان المبارک سنہ ۷ جلوس واللہ

نقل خط انور آنکہ

صاد

یادداشت شرح دستخط نائب وزیر الممالک جملۃ الملک مدار المہام مطابق صاد خاص فرمان والا شان نبویسند برای ضمن وقایع مولود فرزند غلام محمد ابن مرزا رفیع ولد ملا محمد ہاشم شیرازی و نام نہاد آن مسمی غلام حسین مزین بصاد بدفتر رسید کہ جا بسان دفتر دیوانی سرکار معلی سہ ماہانہ مرزا مشارالیہ یکصد روپیہ سکہ کہن ماہانہ بلا قید آسامی من ابتدای سنہ ۱۱۸۳ فصلی بمصارف مرضعہ ہای وغیرہ مولود حال بخازن خزانہ عامرہ خاقانی مجدد مجرا دادہ قبض مہری غلام حسین بدفتر داشتہ باشند و متصدیان بموجب حکم جہان مطاع خورشید شعاع ناصیہ وقائع باعرض ثانی فرمان والا شان قلمی نمایند۔

نقل استشہاد متذکرہ حیات دبیر صفحہ ۶

لا تکتموا الشہادۃ ومن یکتمہا فانہ اثم قلبہ

فی الحقیقت بزرگان مستشہد از شرفائے شیراز و لبسر کار ما بدولت العہد ہائے جلیلہ ممتاز بودہ اند

شاہ عالم بادشاہ غازی

ابو المظفر جلال الدین

سنہ احد ۱۱۷۳

ابن عالمگیر بادشاہ — ابن شاہ عالم بادشاہ — ابن جہاندار شاہ — ابن عالمگیر بادشاہ — صاحب قران ابن امیر تیمور — ابن میران شاہ — ابن سلطان محمد — ابن ابو سعید — ابن عمر شیخ — ابن بابر بادشاہ — ابن ہمایون بادشاہ — ابن اکبر بادشاہ — ابن جہانگیر بادشاہ — ابن شاہجہان بادشاہ

آصف الدولہ ... ۱۱

گواہی مطالبہ بصدق و شہادت میخواہد بحق ایں رقوم سالکھنؤ شاہجہان آباد
و اکبر آباد ننگ و عار دارد ایں مسمی غلام حسین ابن مرزا غلام محمد خلف مرزا
رفیع ولد مرزا ہاشم شیرازی برادر عینی علما اہلی شیرازی حشرہما اللہ مع الائمۃ
المعصومین علیہم السلام بدیں مضامین صداقت آئین از قدیم الایام
بزرگان آبا عن جد احقر العباد در شیراز کہ موطن و مولد آنہا بودہ ہموارہ
بمناصب جلیلہ و مدارج رفیعہ ممتاز بودند چوں بسبب نا مساعدت ایام
جلائے وطن ساختہ وارد اکبر آباد شدند مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابو المظفر
خاں جد بعدی آثم ناظم صوبہ کشمیر و ماموں صاحب مرزا شہامت علی خاں نویسانید
خط النستعلیق باستادی شہزادگان منصوب و جد امجد بعہدہ منشی گیری سرفراز و
ممتاز گردیدند تا مدت مدید عرصۂ لبینہ بعہدہ مناسب جلیلہ خوش گذران

ورای غلام حسین ذوالقعدہ ۱۲۱۰ ہجری ساکن محلہ ...

۱۲۱۰ سید فرزند علی

ساکن محلہ ...

مرزا محمد علی خان ۱۲۱۰

ماندند و والد مغفور نیز صاحب اقتدار بودند لاکن چون والدهٔ ماجدهٔ
مستشهد از دار فانی بعالم بقا انتقال نموده - والد مرحوم عقد دیگر
ساختند حقیر که در آن ایام نه ساله بود و در مکتب خانه تحصیل علم مینمود
والد مرحوم حسب ارشاد شاهی اکثر بسفر میماندند مادر نامهربان بوجه
مغائرت بطن با نواع و اقسام ایذا میرسانید چنانچه روزی زهر سم
در طعام داده معلم حقیر ازین دشمنی آگاه گشته حقیر را از
اکبرآباد به شاهجهان آباد بخانه مرزا فتح علی خاں ابن مرزا
افضل علی خاں که با پدر حقیر صیغهٔ اخوت در روابط قدیم میداشتند
آورد و حال مهربانی مادر نامهربان حالی ساخته جناب
خانصاحب موصوف متاسف گشته مثل بزرگان سلف که
فرزند آشنا را فرزند خود میدانستند حقیر را بخانهٔ خود با هزار
شفقت و محبت نگاه داشتند چون والد مرحوم از کار سرکار الفراغ
یافته مراجعت نمودند جویای حقیر گشتند مادر نامهربان نسبت
آوارگی و بد فعالی باین سند جو نموده لاکن با اینهمه والد مغفور بسبب
مهر پدری بیتاب گشته برای تلاش حقیر بشاهجهان آباد آمده و بخانهٔ
خانصاحب ممدوح سراغ یافته حقیر را در بر کشیدند و چند روز مهمان خانصاحب
مانده حقیر را همراه خود بردند هر چند که خانصاحب ممدوح نام بنده گرفته
بوالد ماجدم تفهیم نمودند که ایشان را در خانهٔ بنده بگذارید که خانهٔ خانه
شما است و در خانهٔ شما الیقین هلاکت ایشان است که مادر جدید
نامهربان است - والد بنده باقتضای حمیت عذر نمودند
و مفارقت این جانب گوارا نساختند چند سال باز بنا مهر
باین هلے مادر نامهربان بسر بردم - چون والد ماجدم
بسن سیزده سالگی حقیر از دنیا رخت سفر آخرت
بستند و اقربای مادر نامهربان مال و اسباب جمیع
اشیای والدم از حقیر پوشیده بقبض و تصرف آوردند



گواه محضر مسیح است
صحیح است و صحیح است و صحیح است

صاحب شرح اعجاز خسروی متخلص مسیح عفی عنه



بخدا که عالی نسبی و والا حسبی مستشهد
اظهر من الشمس و آبین من الامس



لاریب فیه که قرهٔ باصرهٔ شرافت وغیره ناصیهٔ شرافت
جناب مستشهد ممدوح نجیب الطرفین است

برادر زادهٔ نعمت خاں عالی که با والد مستشهد
صیغهٔ اخوت میدارد والسلام



والله بالله که آنچه در متن است
حرفاً حرفاً و لفظاً لفظاً از
والد مرحوم بارها شنیده ایم

ساکن اکبرآباد

حقیر کہ محض بے دست و پا بود۔ چارہ ناچار بخانۂ فتح علی خاں باز آمدہ بسکونت ورزید در آں ایام خاں صاحب ممدوح ہم مبتلائے عسرت بودند۔ لاکن مہمانداری حقیر از اول زیادہ ترنمودند۔ آزانجا کہ شہر مذکور بسبب تاراج وغارت متواتر قابل ماندن نماندہ عزیمت لکھنؤ فرمودند بندہ نیز ہمراہ معظم الیہ وارد لکھنؤ گردیدہ حقیقت حال اینست کہ بقید رقم آوردہ ہر کس کہ دریں شہر از آباؤ اجداد بندہ آگاہی کماہی داشتہ باشد حسبۃً للہ مہر و گواہی زیب تحریر نماید و چوں استشہاد نامہ ہذا در اکبر آباد و شاہ جہان آباد بنظر رؤسائے شہرین مذکورین بگذرد مترقب کہ قربۃً الی اللہ از روئے یقین کالشمس فی النہار طالعاً مواہیر شہادت خود ثبت نمایند کہ عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور خواہد بود +

تحریر فی التاریخ ہفتم رجب المرجب
۱۲۱۵ ہجری النبوی

شہد بما فیہ المتن

واللہ ثم باللہ کہ جناب مستشہد لبعض احسان مہمانداری چندروزہ کہ والد مغفور معظم الیہ نمودہ اند احسانات فراواں برمن فرمودہ و میفرمایند چنانچہ دریں ایام درمکان مکرم الیہ سکونت میدارم

[مہر: علیشت ۱۱۱ عزت امید شفا از فضل]

عرف آقا جان ابن فتح علی خان

الامر کذلک

[مہر: ۱۲۰۹ علی مراد خان بہادر]

داروغہ دیوانخانہ حضرت شاہ عالم دعالیان خلد اللہ ملکہ

دریں دار الخلافت خاندان مستشہد جلیل الشرافت از آفتاب روشن تر است

[مہر: ۱۲۰۹ علی امین الدین]

فی الواقع کہ جناب مستشہد ممدوح از خاندان جلیل وار دو دمان نجیب و اصیل است

[مہر: محمد ۱۱۹۴ مرزا باقر]

حقیر مستند عزیز
راد رس حادہ است

[مہر: حسن ۱۲ سید اللہ]

مسافر گویا مفلس تھے۔ کہ کوئی آمدنی نہ تھی پرانی کھرچن (بزرگوں کی بچی ہوئی پونجی) اور اپنا اسباب خانہ داری بیچ بیچ کر کھاتے تھے مگر اس زمانے کے مالدار مرزا مدکاروں پر خیال کیا جائے۔ تو بہت مرفہ الحال تھے۔ دولت تلف ہونے کے بعد بھی اس قدر تھی۔ کہ سیکڑوں روپیہ خیرات (خمس و زکوٰۃ) میں دیتے تھے۔ اس کی تصدیق آپ کو دو خطوں سے ہوگی جو شمس الضحےٰ میں چھپے ہیں۔ اور جن کا خلاصہ میں ذیل میں نمبر بہ نمبر لکھتا ہوں:-

۱- پہلا خط غفران مآب حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب قبلہ (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) کا مورخہ ۱۲۱۶ھ ہے جس کو میں لفظ بلفظ مع ترجمہ تبرکاً لکھتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں یہ سب سے پہلے مجتہد ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کے تمام شیعوں میں دینداری پھیلی ہے۔ اکثر اہل علم شیعوں کے خاندان انہیں کے خانوادہ کے تعلیم یافتہ اور شاگرد ہیں۔ انکی تحریر کو شیعہ آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

اصل عبارت خط	خلاصہ اردو میں
جناب مرزا صاحب کرم فرمائے دوستان مستجمع الطاف واحسان عالی مراتب والامناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہ۔ بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائے شریف باد۔ کہ مبلغ پانصد روپیہ منجملہ زکوٰۃ وخمس کہ بدست مسمی غلام حیدر فرستادند۔ رسید انشاء اللہ تعالےٰ المستحقین مومنین تقسیم کردہ خواہد شد۔ زیادہ والسلام۔ مرقومہ چہارم شہر رمضان ۱۲۱۶ھ ہجری نبوی	آپکا بھیجا ہوا پانچ سو روپیہ خمس و زکوٰۃ کا غلام حیدر کے ہاتھ پہنچا۔ حقدار مومنوں کو انشاءاللہ تقسیم کردیا جائیگا۔ ۴ ماہ رمضان ۱۲۱۶ھ

سید دلدار علی
۱۲۱۰

۲- دوسرا خط نواب مختار خاں رئیس دہلی برادر زادہ نعمت خاں عالی کا ہے اس میں تاریخ درج نہیں ہے۔ مگر مہر میں ۱۲۱۲ھ کندہ ہے۔ اس لئے (سنہ بارہ سو بارہ)

سنہ ۱۲۱۲ھ کے قریب قریب زمانہ کا یہ خط سمجھنا چاہئیے۔ اس خط فارسی کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ تین سو پچھتر ۳۷۵ روپیہ زکواۃ کا جو نامدار خاں کے ہاتھ آپ نے بھیجا تھا (تقسیم مومنین کو) میرے پاس امانت رکھا ہوا ہے۔ اب چند صاحبوں کی زبانی سنا گیا ہے۔ کہ آقا شاہ حسین اصفہانی حج اور زیارات عتبات عالیات سے فائض ہو کر چند روز سے اس شہر میں وارد اور عسرت شدید میں مبتلا ہیں اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ لہذا جناب کی خدمت میں تکلیف دیتا ہوں۔ کہ اگر آپ کو دل سے منظور ہو۔ تو بعوض حصہ چند مومنین کے آقا صاحب موصوف کی خدمت میں منت وسماجت سے وہ رقم پیش کر کے اُن کو اُن کے وطن اصفہان کو بھجوا دوں*

مرزا صاحب کے نسب پر بعض لوگوں کے حملے

اب میں یہ بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ایسے عالی نسب کے نسب پر ناواقفی یا اور کسی (کدورت باطنی وغیرہ کے) سبب سے بعض لوگوں نے کیا کیا حملے کئے ہیں۔ اُن حملہ آوروں میں سے :-

(۱) پہلے بزرگ صاحب تذکرہ سراپا سخن میر محسن علی صاحب اپنے تذکرہ کے صفحہ ۱۰۸ پر تحریر فرماتے ہیں "مرثیہ گوئی میں طاق صف آرائی اور مضمون خیزی میں شہرۂ آفاق مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے باشندۂ لکھنؤ ارشد تلامذۂ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو"۔ پھر صفحہ ۲۱۵ پر یہی بزرگ لکھتے ہیں "مرزا سلامت علی دبیر

* معلوم ہوتا ہے اُس زمانے کے مصنفوں اور مؤلفوں کا یہ عمل عام طور پر نظر آتا ہے۔ کہ جس سے کچھ رنجش ہوتی تھی اُس کی تعریف کے الفاظ لکھ کر ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے تھے۔ کہ منقصت ثابت ہو۔ مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں یہ عادت عام مصنفوں ومؤلفوں کی لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی اختلاف مذہب شیعہ وسُنّی اس تحریک کا باعث ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو منشی صاحب موصوف کی تاریخ میں اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر ۱۲ آثابت

فصل ۵ نسب پر بعض گروہ کے حملے

ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش باشندہ لکھنؤ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر"۔

صفحہ ۸۰ اپر تو متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا
تھا کہ مرزا غلام حسین کے عزیزوں میں کوئی صاحب کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔ جن کا نام
آغا جان تھا جس کی تاویل یہ ہو سکتی تھی۔ کہ آغا جان تاجر کاغذ کوئی مشہور شخص تھے۔ جو مرزا
غلام حسین کو اُن کے ذریعہ سے ناظرین تذکرہ سے واقف کرایا۔ مگر آگے بڑھ کر جب کہ
صفحوں کی گنتی بجائے ایک سو کئی کے دو سو کئی ہو گئی۔ تو خود مرزا غلام حسین ہی کو کاغذ فروش
لکھ دیا۔ غالباً مصنف موصوف اگر کہیں تیسری جگہ سو دو سو صفحہ کے بعد پھر مرزا دبیر مرحوم کا ذکر
فرماتے۔ تو خود مرزا صاحب ہی کو کاغذ فروش بلکہ کاغذ ساز لکھ دیتے۔ مگر ہم اس کا جواب بس
اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔

ناظرین کتاب! آپ کو یاد ہو گا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب کے استشہاد پر مہر کرنیوالوں
میں سے ایک صاحب فضل علی خاں عرف آغا جان بھی ہیں۔ جن کے نام پر میں نمبر ۱۱
لکھ چکا ہوں۔ اور جنھوں نے مرزا صاحب کے مکان میں اپنا رہنا لکھا ہے۔ میں نے
لکھنؤ کے بعض معمر آدمیوں سے سنا ہے۔ کہ وہ آغا جان اور مرزا غلام حسین۔ یہ دونوں
صاحب بزرگوں کے وقت کا اسباب خانہ داری۔ دوشالہ۔ ہتھیار۔ ظروف نقرہ وطلا وغیرہ
وغیرہ جو بہت کچھ تھا بیچ بیچ کر کھا گئے۔ اُس زمانہ میں کاغذ بھی بہت قیمتی ہوتا تھا۔
خصوصاً ایرانی و کشمیری کاغذ بہت ہی قیمت پاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان صاحبوں کے
ساتھ کچھ کاغذ بھی ہو۔ اور وہ بیکار سمجھ کر بیچ دیا ہو۔ ع یاروں کو شگوفہ ہات آیا اور
کاغذ فروش لکھ دیا۔ حالانکہ کاغذ فروشوں کا (مثل کاغذ سازوں کے) کوئی فرقہ یا قوم
نہ شاہی زمانہ میں تھا نہ آج ہندوستان بھر میں کہیں ہے۔ بلکہ پہلے بھی مختلف
قوموں کے شریف آدمی کاغذ بیچتے تھے اور آج بھی۔ میں اس پر اتنا اور لکھنا چاہتا ہوں
کہ اگر واقعی بھی یہ بزرگوار کاغذ فروش ہوتے جب بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ تجر

اسلام کو حاصل ہے۔ کہ پیشۂ تجارت سے کوئی شخص ذلیل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ بفحوائے الکاسب حبیب اللہ[1] شرافت بڑھ جاتی ہے۔ اور زمانہ موجودہ نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ تجارت و حرفت و صنعت ہی ترقی اقوام کا باعث ہے۔ اور اسی پر عمل نہ کرنے سے مسلمان مفلس اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لکھنا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین مرحوم نے لکھنؤ میں بزرگوں کے اسباب کو بیچ بیچ کر بسر کی۔ اور شادی کی۔ اور مکانات خریدے۔ جو آج تک لکھنؤ نخاس میں موجود ہیں[2]۔ اور نواب اودھ یا کسی اور رئیس کی نوکری نہیں کی۔ اور پھر لکھنؤ سے دہلی (شاید اپنی جائداد غیر منقولہ دہلی کی حفاظت یا فروخت کے لئے) چلے گئے۔ مرزا صاحب سے بڑی دو بہنیں اور مرزا صاحب کے بڑے بھائی (نظیر مرحوم) اور خود مرزا دبیر مرحوم یہ سب دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور پھر دوبارہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ واقعات بتلا رہے ہیں۔ کہ مرزا غلام حسین کے پاس کافی سرمایہ تھا۔ ورنہ اُن کو نواب اودھ کی نوکری مل جانا خصوصاً اُس زمانہ میں کہ جو آصف الدولہ کا زمانہ معلوم ہوتا ہے شاید بہت آسان ہوگا۔ اس لئے کہ دہلی میں میر منشی اور اُستاد بادشاہ دہلی یہ خاندان رہ چکا تھا۔ نواب اودھ کو ان سے سینکڑوں مرتبہ کام پڑا ہوگا۔ اس میرے خیال کی تائید نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نور اللہ خاں آفتاب جنگ کے ایک خط سے ہوتی ہے جس کی نقل شمس الضحیٰ میں چھپی ہے[3] جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آپ (مرزا غلام حسین صاحب) صوبہ اودھ کے

---

[1] الکاسب حبیب اللہ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ محنت کر کے روٹی (اکل حلال) پیدا کرنیوالا خدا کا دوست ہے مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث ہے۔ مگر حقیر کی نظر سے ابھی تک یہ حدیث نہیں گذری۔ ورنہ ماخذ لکھ دیتا +

[2] یہ گلی آج کل کوچہ دبیر کہلاتی ہے +

[3] اس خط میں یا تاریخ تحریر درج نہیں یا ناقل نے چھوڑ دی۔ کہ جس نے شمس الضحیٰ میں نقل کیا۔ مگر مُہر میں ۱۱۹۰ھ کندہ ہے جس سے ۱۱۹۰ھ کے بعد کا زمانہ سمجھا جاتا ہے جو آصف الدولہ ایک سخی نواب اودھ کا عہد ہے۔ کہ جس زمانہ میں دہلی کے ایک رئیس زادہ کو لکھنؤ میں معزز نوکری مل جانا بہت آسان تھا + ۱۲ ثابت

پاس جائیے۔ کہ آپکے دادا ملا محمد رفیع کے ساتھ برہان الملک (محمد امین سعادت خاں بزرگ خاندان نوابان وشاہان اودھ) نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا۔ بلکہ صوبۂ اودھ کے بزرگ آپکے بزرگوں کے زیر بار احسان ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ صفدر جنگ صوبہ دار اودھ زمانہ وزارت ابوالنصر مجاہد الدین احمد شاہ میں محسود عالم ہوگئے تھے (یعنی سب لوگ اُن سے جلتے تھے)۔ بلکہ جن خاندانوں میں پہلے وزارت رہ چکی تھی۔ وہ اُس بیچارہ (صفدر جنگ) کے درپے آبروریزی تھے۔ مگر آپ کے آباؤاجداد عنایت اللہ خاں صوبہ دار کشمیر اور ملا غلام محمد صاحب شیرازی اُن کے مددگار تھے جس سے کسی کی دشمنی نہ چل سکی۔ انہیں دونوں صاحبوں کی بدولت ذلت۔ رسوائی وقید سے وہ محفوظ رہے۔ اور صوبہ دار کشمیر نے صفدر جنگ کو لکھنؤ کی طرف روانہ کرادیا۔ مگر مرزا غلام حسین عجب مستغنی المزاج اور دولتمند شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کہ جنہوں نے ایسے نواب اودھ سے مطلق رجوع نہ کی جن پر اُن کے بزرگوں کا احسان تھا۔ اور صیغۂ اخوت کے مقدس رشتہ سے گویا نواب اودھ کے واجب الاحترام ایمانی بھائی ہوتے تھے※

مصنف آبحیات کی تحریر نسبت نسب کے

۲۔ دوسرے تذکرہ نویس مرزا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم ہیں جنہوں نے آب حیات میں یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:۔

"تذکرہ سراپا سخن میں لکھا ہے۔ کہ ان کے (مرزا دبیر کے) والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔ پھر ایک جگہ اُسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے ہیں۔ مصنف موصوف کو شوق ہے۔ کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں۔ اس لئے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک"

※ اُس زمانہ کے اُمرا و شرفا اپنے محسنوں کی اولاد سے حسن سلوک کرنا لازم وواجب جانتے تھے خصوصاً آصف الدولہ مرحوم بڑے بامروت وسخی تھے۔ جو لکھنؤ کے حاتم سمجھے جاتے ہیں۔ اور اکثر سودا بیچنے والے آج بھی یا آصف اللہ کہکر صبح کو سودا بیچنا شروع کرتے ہیں سچ کہا ہے ؎ کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے + کچھ نے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے + ۱۲ ثابت

اس عبارت میں مولانا آزاد مرحوم نے صاحب سراپا سخن کی تردید و تکذیب فرمائی ہے۔
البتہ اتنا سہو اُن سے بھی ہؤا۔ کہ اس عبارت میں سراپا سخن کے حوالہ سے مرزا دبیر مرحوم کے
والد ماجد کا نام آغا جان لکھ گئے ہیں۔ مگر خدا مغفرت کرے آزاد مرحوم بہت نیک نیّت۔
پاک طینت تھے۔ جب اوّل اوّل میں نے اُن کی کتاب آب حیات دیکھی۔ اور اس میں مرزا صاحب
کے حالات میں کئی واقعہ غلط اور کئی حکائتیں ناسخ و آتش و ضمیر کی خلاف واقع نظر آئیں۔ تو
مَیں نے اُن کی خدمت میں ایک کارڈ بھیجا۔ کہ آپ نے ناسخ و آتش و ضمیر کی حکائتیں اور
کئی واقعات دبیر مرحوم کے باب میں غلط درج فرمائے ہیں۔ آب حیات میں اور ایسا شور
پانی ملا ہے۔ افسوس ہے۔ اُس کے جواب میں اُن مرحوم نے صاف لفظوں میں اس
غلطی کا اعتراف فرمایا تھا۔ اور لکھا تھا۔ کہ مجھ سے جس طرح لوگوں نے کہا۔ مَیں نے لکھ دیا۔
اب تم صحیح صحیح حالات لکھو۔ مَیں آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی کر دونگا۔ مگر افسوس قضا و
قدر میں کیا چارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت آزاد آزاد نہ رہے۔ اُن کی حیات آب جنون کے
شور چھینٹوں سے تلخ ہو گئی[1] ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند +

۳-۴- تیسرا اور چوتھا نمبر مجموعہ سخن اور سخن شعرا کا ہے۔ یہ دونوں تذکرہ سراپا سخن
کے بعد لکھے گئے۔ ایک نے ایک مقام کی عبارت اور دُوسرے نے دُوسرے مقام سراپا سخن کی
گویا نقل کر دی۔ تحقیق کون کرے۔ اور شمس الضحےٰ کون دیکھے[2]۔ ہائے غفلت تیرا منہ کالا۔
آفتاب نکلا ہؤا ہے پھر بھی لوگ رات رات پکارے جاتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر
جو اس نئی روشنی میں اندھیر ہؤا ہے اُس کو نمبر ۵ میں بچشم غور دیکھئے +

---

[1] اُس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مغل ہیں۔ مَیں نے میر محمد حسین صاحب لکھ دیا تھا جس پر مجھے تحریر فرمایا تھا۔ کہ بندہ
آزاد سیّد نہیں ہے۔ بلکہ سیدوں کا غلام یعنی مغل ہے۔ اللہ اللہ کیسے خلیق و منکسر شخص تھے۔ خدا مغفرت کرے برسوں مجنوں رہنے
کے بعد ابھی دو برس ہوئے کہ انتقال فرمایا ہے۔ ثابت (۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ) +

[2] حالانکہ شمس الضحےٰ سنہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع اثنا عشری لکھنؤ میں چھپکر مشتہر ہو چکی ہے۔ مگر افسوس ہم ہندوستانیوں میں تحقیق و تنقید کا مادہ ہی بہت کم ہے +۱۲ ثابت

۵۔ پانچواں نمبر امراؤ مرزا صاحب حیرت (مالک کرزن گزٹ دہلی) کا ہے جنکو بعض لوگ چودھویں صدی کا مجدد (محقق) سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مرزا صاحب کو کالیستھ تو مسلم ہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو ارمغان یا چراغ دہلی مصنفہ مرزا حیرت صاحب[۱])۔ مگر اس کا جواب باصواب نواب سید مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالنسٹھ (میرے معزز کرم فرما اور اُستاد بھائی) کی طرف سے وقت پر پیسہ اخبار میں چھپ گیا۔ اور مرزا حیرت صاحب کی تردید ہوگئی جس کو سُن کر یا دیکھ کر مرزا حیرت پی گئے[۲]۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس لئے اور نیز اس خیال سے کہ مرزا حیرت صاحب خود شہادت جناب امام حسین ع کے منکر ہیں۔ مرزا دبیر تو اُن جناب کے ادنےٰ مداح ہیں[۳]۔ مَیں مرزا حیرت کی اس تحریر پر ایک نہ حیرت کرتا ہوں نہ اس سے زیادہ تردید ضروری سمجھتا ہوں۔

خیر مَیں اب ذات کی بحث کو زیادہ طول دینا فضول سمجھ کر اس شعر مولانا عرفی رح پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ؎

المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست + اینک بشہادت طلبم لوح وقلم را

مگر قبل اس کے کہ اور کچھ حالات لکھوں۔ اتنا اور لکھنا ضروری و مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ سید انشا جن کی شرافت نسب و نجابت و سیادت پر تمام تذکرے متفق ہیں۔ اور با وصفیکہ مصحفی سے اور اُن سے کیا کیا چوٹیں چلیں۔ اور کیسی کیسی ہجو کی نوبت آئی بلکہ نوبت بجی۔ اور مصحفی کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا ہوا پڑا تھا۔ پھر بھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ کہ آفتاب

فصل ۲
سید انشا خسرو ازا دبیر اعجم
مع مختصر حالات

۱؎ مدت ہوئی جب میری نظر سے یہ کتاب گذری تھی اب نام بھی یاد نہیں رہا۔ اگر چراغ دہلی نام ہے تو یہ مثل اس موقع پر صادق آتی ہے کہ چراغ کے تلے اندھیرا کیونکہ مرزا صاحب مرحوم دہلوی لڈ ایک خاندانی رئیس ہیں اُنکی نسبت مرزا حیرت دہلوی ہو کر ایسی جھوٹ لکھا ئیں مقام حیرت ہے ع حیرتی در حیرتم کل العجاب مؤلف حقیر

۲؎ پی گئے خاص روزمرہ ہے جس کا لطف اہل زبان یا زباندان اصحاب کو حاصل ہو سکتا ہے چنانچہ میرے استاد مکرم جناب منشی امیر مینائی مرحوم نے ایک موقع مناسب پر اس روزمرہ کو نظم فرمایا ہے وہ یہ ہے ؎ ہجو مے کر رہا تھا منبر پہ۔ ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ +

۳؎ مرزا دبیر کو جناب امام حسین علیہ السلام کا ادنےٰ مداح میں یوں کہتا ہوں کہ اُن جناب کے اعلےٰ مداح خود پروردگار عالم اور رسول مختار صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں + ثابت

پر خاک ڈالے۔ اور سید انشاؔ کے نسب و سیادت میں کلام کرے (یہ ایسے عالی نسب سید ہیں) ۔ انکی حقیقی نواسی سید معصوم علی مرحوم کی بیٹی مرزا دبیر مرحوم کی زوجہ تھیں۔ جن کے لخت جگر میرے اُستاذ مکرم جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوجؔ مدظلہ (بقول مصنف خم خانہ جاوید تاریخ مرثیہ گویان حال) ہیں۔ جو فخریہ ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎ نانا ہیں مرے سید عالی نسب انشا ٭ عاجز ہے خرد اُن کے فضائل ہوں کبا انشا ٭ یہ رشتہ بھی مرزا صاحب مرحوم کی عالی نسبی پر ایک برہان قاطع ہے ٭

مختصر حالات سید انشا

از بسکہ سید انشاء اللہ خاں مرحوم کا نام آگیا ہے۔ میں اس مقام پر ناظرین کی اطلاع کیواسطے دو باتیں لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے انکا حال آب حیات میں لکھکر ان کے کمالات کی خوب داد دی ہے۔ اور پروفیسر آزاد مرحوم کے الفاظ سے ٹپکتا ہے۔ کہ سید انشا کے کمالات کی وجہ سے ان کو بدرجہ کمال محبت تھی۔ اس لئے وہ جان بوجھکر کوئی بات سید انشا کے حال میں غلط نہ لکھتے۔ مگر دو باتیں مندرجہ آب حیات خلاف واقع ہیں (جو قابل تنقید و تصحیح ہیں) جو غالباً پروفیسر آزاد مرحوم تک نہیں پہنچیں ٭

۱۔ آب حیات دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سعادت علی خاں نواب اودھ نے ان کی آخر عمر میں تنخواہ بند کر دی تھی۔ اور یہ محتاج و مجنون ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے بڈھے بڈھے آدمی عموماً اور ان کے نواسے جناب مرزا اوجؔ مدظلہ خصوصاً مجھ سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ بس بات اسی قدر تھی۔ کہ نواب اودھ (سعادت علی خاں) نے یہ حکم دیدیا تھا۔ کہ سید انشا اپنے مکان پر ہر وقت رہا کریں۔ جب ہمارا چوبدار جائے وہ آجائیں۔ اسی (حبس بیجا) کی طرف وہ اپنے اُن اشعار میں اشارہ فرماتے ہیں۔ جو حاجب علی شیرازی کو لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر یہ ہے ؎

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا ٭ چساں کنم حرکت نوکر یست یا بازی

اس حکم کا اُن کے دل پر ایک صدمہ ضرور تھا۔ مرزا دبیر مرحوم نے ایک رباعی میں ایسا مضمون بیان فرمایا ہے۔ جو گویا سید انشا کے حسب حال بلکہ اُن کی زبان سے (گویا) ہے ؎

اس ہند میں طوطیٔ قفس کی مانند * خوبی سے زباں کی زندہ در گور ہیں ہم
ورنہ وہ محتاج یا مجنون مرتے مرتے نہیں ہوتے تھے *

۲۔ دوسری بات قابل اظہار یہ ہے کہ آب حیات کے دیکھنے سے لکھنؤ میں میر انشا کا آنا اور دربار نواب اودھ میں باریاب ہونا فقط ایک بار پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی سعادت علی خاں کے عہد میں۔ حالانکہ یہ اُن کا دوسری مرتبہ ادھیڑ عمر میں آنا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں آئے۔ جیسا کہ مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنی کتاب مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔ اور مولوی احمد علی صاحب کا لکھنا اس لئے قابل قبول ہے۔ کہ وہ سید انشا کے زمانہ کے آدمی ہیں[ف۱] *

مولوی احمد علی معاصر انشا کی زبانی حال سید انشا کا

مولوی احمد علی صاحب نے جو لکھا ہے۔ اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ سید انشا نے صغر سن میں تمام کتب صرف و نحو و منطق و حکمت صدرا تک پڑھیں۔ سولہ برس کی عمر میں نواب شجاع الدولہ (صوبہ دار اودھ) کے دربار میں حاضر ہو کر حلبیوں میں شامل ہوئے۔ اس وقت تمام دیوان ہندی (اردو) نئے طرز پر بغیر کسی اُستاد کی اصلاح کے تصنیف کر چکے تھے۔ اور کچھ فارسی و عربی اشعار بھی کہہ چکے تھے۔ میں (حقیر ثابت) جب کبھی میر انشا کا دیوان دیکھتا تھا۔ دل میں خیال کرتا تھا۔ دیوان کیا ہے۔ جوانوں کی اُمنگوں کا نمونہ۔ جوانی کے ارمانوں کا مرقع۔ ولولوں کا خاکہ ہے۔ کیا میر انشا ہمیشہ جوان ہی رہے۔ بڈھے کبھی نہیں ہوئے۔ یہ

ف۱ مخزن الغرائب فارسی میں ہے۔ اس موقع کی عبارت کی نقل شمس الضحےٰ میں چھپی ہے جس سے مؤلف تذکرہ بڑے ذی علم باخبر شخص معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے یہ خلاصہ شمس الضحےٰ سے لکھا ہے۔ مخزن الغرائب باوصف تجسس کے مجھے اب تک نہیں ملی۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کے یہاں اس کی ایک نقل تھی۔ مگر پھر کوئی صاحب لے گئے۔ واپس نہ دی۔ ۱۲ مؤلف حقیر *

ف۲ بجز ایک مشہور غزل کے جس کا مطلع یہ ہے۔ کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں * بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ٭ یا اور کوئی ایک آدھ غزل ایسی ہو۔ ورنہ تمام دیوان تغزل کے عاشقانہ رنگ سے رنگین ہے * ۱۲ مؤلف حقیر

معمّا اس تذکرہ مخزن الغرائب سے حل ہُوا۔ کہ درحقیقت وہ دیوان عنفوانِ شباب کی تصنیف ہے ۔

پھر صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں نہایت حسین و وجیہ اور ایسے خوش تقریر تھے۔ کہ تمام دربار میں کوئی ایسا متقرر نہ تھا۔ آخر کو اکثر اہل دربار اُن سے حسد کرنے لگے۔ اور شجاع الدولہ کے مرنیکے بعد عہد آصف الدولہ میں میر انشا لکھنؤ سے چلے گئے۔ کچھ روز نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے لشکر میں اور کچھ عرصہ تک بُندیل کھنڈ میں رہکر پھر اپنے والد مرحوم حکیم میر ماشاء اللہ کی طرح دہلی محمد بیگ خاں ہمدانی کے پاس معزز رہے۔ (اس سے پہلے مولوی احمد علی صاحب اپنی کتاب میں میر ماشاء اللہ کے اعزاز کا یہ حال درج کر آئے ہیں۔ کہ جب وہ اپنے بگڑے ہوئے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس آئے ہیں۔ جب بھی اُنیس ۱۹ ہاتھی اُن کے ہمراہ تھے)۔ پھر دوبارہ (میر انشا) عالم پیری میں دہلی سے لکھنؤ آکر اول سلیمان شکوہ اور پھر الماس علی خاں (خواجہ سرائے شاہی) کے اور سب سے آخر میں نواب سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کے مصاحب خاص ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اردو چاروں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور بہادر اور خوش مزاج ہیں۔ مجھے بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی صحبت میں عجیب و غریب باتیں اور نقلیں سُن کر روتا ہُوا آدمی ہنس دیتا ہے۔ کبھی کبھی رستہ چلتے ہوئے آدمی سے دل لگی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ چپ ہو گیا تو خیر۔ ورنہ وہ گالیاں دے رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوئے ہنس رہے ہیں۔ یہ تو مزاج کی کیفیت ہے۔ اور یوں ہفت ہزاری کی مجال نہیں۔ کہ کوئی لفظ اُن کی شان کے خلاف کہدے۔ جے نگر میں باتوں باتوں میں مرزا اسمٰعیل بیگ خاں برادرزادہ محمد بیگ خاں ہمدانی سے لڑائی ہو پڑی۔ کٹار کھینچ کر (سید انشا) اُس کی طرف دوڑے۔ اور جو کچھ زبان پر آیا۔

موشجاع الدولہ کا سالِ وفات پروفیسر آزاد مرحوم نے صفحہ ۱۵۴ آبِ حیات میں ۱۱۸۸ھ لکھا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ آئندہ ایک دلچسپ بحث تقابل و تتبع انشاؔ و نظیری کی مَیں لکھنا چاہتا ہُوں ۱۲ مؤلف حقیر۔

جاؤ بے جا کہا۔ یہی معاملہ مرزا قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ کے ساتھ لکھنؤ میں سعادت علی خاں کے روبرو پیش آیا تھا۔ کہ ایک شعر کی بحث میں سید انشا نے اُن کو ذلیل کیا۔ خیر اب میں سید انشا کو دربار اودھ میں چھوڑتا ہوں۔ مگر قبل اس کے کہ مرزا صاحب کے حالات لکھوں۔ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے معزز معاصر۔ پروفیسر عبدالغفور صاحب شہباز مولف زندگانی بےنظیر نے (جنہوں نے واقعی نظیر اکبر آبادی کی بےنظیر سوانح عمری لکھی ہے) جو انشا و نظیر کا بعض مقامات پر طرز کلام ملتا جلتا دیکھ کر یہ خیال و فیصلہ فرمایا ہے۔ کہ انشا نظیر کا متبع ہے۔ یہ میرے نزدیک بالکل معکوس ہے۔ کیونکہ خود پروفیسر شہباز صاحب کی تحقیق سے نظیر مرحوم کی موجودگی ۱۲۲۱ ہجری میں پائی جاتی ہے۔ کہ اُس سنہ کے ایک تذکرہ نویس دہلوی نے نظیر کا ذکر خیر لکھا ہے۔ اور سید انشا ۱۱۸۸ ہجری (سال وفات شجاع الدولہ) سے پہلے پہلے دیوان طیار کر چکے ہیں۔ کہ جب نظیر یا پیدا نہ ہوئے ہونگے یا پیدا ہو چکے ہونگے تو بچہ ہونگے۔

پس حق یہ ہے۔ کہ نظیر مرحوم انشا کے مقلد و متبع ہیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ ذی علم و انصاف پسند پروفیسر شہباز صاحب اس پر نظر غور فرمائینگے۔ اور اگر میری تحقیق و رائے اُن کے نزدیک صحیح و قابل قبول ہوگی۔ تو زندگانی بےنظیر کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی فرمادینگے۔ کہ آئندہ نسلیں غلطی سے بچیں۔

باب دوم۔ مرزا صاحب کے حالات ابتدائی

مرزا صاحب کے ابتدائی حالات
فصل اول

شجرۂ خاندان اور بزرگوں کے حالات دیکھنے سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ علم و تہذیب اس خاندان عالی شان میں گویا ہمیشہ سے ہے۔ اور شاعری و مداحی اہلبیت بھی تھی۔ ہر چند یہ سلسلہ مداحی مسلسل قائم نہ رہا ہو۔ کیونکہ مرزا غلام حسین کی نسبت کسی تحریر سے مداح یا شاعر ہونا ابتک ثابت نہیں ہوا۔ مگر یہ بات بھی مرزا دبیر صاحب کے واسطے باعث فخر ہے۔ کہ آبا و اجداد مسلسل شاعر یا مرثیہ گو نہ تھے۔ اس پر بھی اس صفت کو اُس معراج کمال پر پہنچایا۔

جس سے بڑھ کر خدا کا نام[1] ہے۔ چنانچہ خود وہ جناب فرماتے ہیں ؎

ہم فن مرے شاکی جو نہ ہوں روئے زمیں پر ✤ پہنچا دوں سخن کو میں ابھی عرش بریں پر

فصل ۳ تاریخ ولادت

تاریخ ولادت

گیارھویں جمادی الاول ۱۲۱۸ھ (بارہ سو اٹھارہ ہجری) کو مرزا صاحب پیدا ہوئے[2]✤

مقام ولادت

مقام ولادت

شہر دارالسلطنت دہلی۔ محلہ بلی ماراں متصل لال ڈگی مقام ولادت ہے۔ میرے خیال میں دہلی کی پیدائش صرف دو شاعر ایسے ہیں۔ جن کے حالات و خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اور جو اپنے اپنے فن میں بلکہ شاعری و مرثیہ گوئی کے فن میں یکتا مانے جاتے ہیں۔ اور دونوں اتفاق سے مغل ہیں۔ ایک تو مرزا رفیع سودا مرحوم دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مغفور ہیں[3]۔ یہ دونوں شاعر دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ ان دونوں صاحبوں کی

---

[1] یہ وہ فخر ہے جو آزاد مرحوم بھی آب حیات کے صفحہ ۵۵۰ و ۵۵۴ میں فرماتے ہیں۔ کہ مرثیہ گوئی کو مرزا دبیر نے اس درجہ تک پہنچا دیا۔ جس سے آگے ترقی کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئیگا نہ ویسے صاحب کمال پیدا ہونگے۔ یہ تو مرثیہ گوئی کی نسبت رائے تھی۔ شاعری کی نسبت بھی آزاد کی یہ آزادی مطلب ہے۔ کہ میر انیس و مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اردو ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۴۳ آب حیات ✤ ۱۲ ثابت۔

[2] یہ تاریخ ولادت مجھے میر سید حسین عرف سید حسین جان صاحب شاگرد مرزا دبیر صاحب سے معلوم ہوئی ہے کہ جن کے والد ماجد سید حسن عرف حسن جان صاحب مرزا صاحب کے ابتدائی شاگردوں میں اور ہم عمر تھے۔ یہ تاریخ اُن کے پاس ایک کتاب میں لکھی ہوئی نکل آئی جس کتاب میں اُن کے اور بزرگوں کی بھی تواریخ ولادت و وفات درج ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتائی میں اُنکی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں ✤ ۱۲ مولف

[3] میر تقی میر مرحوم جنکے باب میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ متفق ہیں کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ وہ (میر) مرزا سودا کو پورا شاعر اور درد کو آدھا اور سوز کو پون (شاعر) مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو آب حیات اور میر و سودا کے حالات۔ اور مرزا دبیر کو اُن کے تمام معاصر بلکہ تمام زمانہ پورا شاعر مانتا ہے۔ اور اُن کا کلام منوا کر چھوڑتا ہے۔ بشرطیکہ منصف مزاج سامع و ناظر ہو ✤ ۱۲ مولف

وجہ سے خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کو فخر ہے۔ ایسی مناسبت کسی تیسرے مشہور شاعر کو دہلی و لکھنؤ سے نہیں ہے۔ مثلاً میر تقی میر مرحوم اور مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور آگرہ کی پیدائش ہیں۔ درد۔ ذوق و مومن دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر لکھنؤ نہیں گئے۔ ناسخ و آتش و انیس مرحومین کی فیض آباد کی پیدائش ہے۔ میر انشا مرحوم کی مرشد آباد کی۔ مُصحفی مغفور کی امروہہ کی ولادت ہے۔ شاہ نصیر دہلی کے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہے۔ وہاں دفن نہیں ہوئے۔ میر سوز اور جرأت اور میر حسن ضرور ایسے شاعر ہیں۔ جو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں پیوند زمین ہو گئے۔ مگر یہ بزرگوار مثل سودا مرحوم کے ہر فنی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ صرف شاعر ہیں۔ مرثیہ گو نہیں ہیں۔ اور ناظرین کی بھی مرضی ہے۔ تو خیر میں ان کو بھی اس زمرہ میں لیکر پانچ کا مبارک عدد (بلحاظ پنجتن پاک) پورا کرنے کو طیار ہوں۔ یہ سب کامل ہیں۔ خصوصاً میر حسنؔ کی میں بڑی وقعت کرتا ہوں۔ کہ جن کے پوتے جناب میر انیس مرحوم ہیں[1] باقی اپنے اپنے مقام پر سوز و جرأت بھی قابل تعریف ہیں۔ الحاصل مرزا دبیر کی وجہ سے اہل دہلی و لکھنؤ جتنا فخر کریں۔ تھوڑا ہے[2]+

نام و تخلص

نام تو ناظرین کو اوپر (سلامت علی) معلوم ہو چکا۔ جو مرزا صاحب کی سلامت روی کی گویا خبر دے رہا ہے۔ تخلص دبیر نام سے زیادہ مشہور ہے۔ مگر میں تخلص کی تاریخ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ کس بزرگ کا عطیہ ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب اپنے

---

[1] اور میر حسن مرحوم کی مثنوی سحر البیان اردو کی جان فصاحت کی کان ہے جس کا جواب آج تک کسی سے نہ ہو سکا+ ۱۲ مولف

[2] بلکہ دہلی کے احاطہ پنجاب میں ہونیکی وجہ سے اہل پنجاب کو بھی فخر و مباہات کا موقع حاصل ہے۔ اہل پنجاب جلدی چاہیے کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ دہلی پنجاب سے تخت گاہ ہونیکے سبب سے نکل جائے۔ اور تم یہ موقع فخر ہاتھ سے کھو دو+ ۱۲ ثابت۔

نام و تخلص
فصل ۳

والد ماجد (اور تمام کنبہ) کے ساتھ پانچ سات برس کی عمر میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ میں ان کے والد ماجد نے پڑھوانا شروع کیا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فرما چکے تھے۔ کہ رجحان طبعی دیکھ کر ان کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے۔ (یہ ۱۲۲۹ یا ۱۲۳۰ ہجری کا ذکر ہے) اور میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے کہا۔ کہ یہ بندہ زادہ ہے۔ اس کو مدّاحی اہلبیتؑ کا شوق ہے۔ میر ضمیر صاحب نے (صاحبزادہ سے) مخاطب ہو کر پوچھا صاحب زادے۔ نام آپ کا۔ عرض کی۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ پوچھا۔ کیا پڑھتے ہو۔ جو کچھ پڑھتے تھے بتلایا۔ جب میر ضمیر صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا۔ کہ ذی استعداد و ذہین لڑکا ہے۔ دل میں بہت خوش ہوئے۔ فرمایا جو کچھ کہا ہو مجھے سناؤ۔ مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے ✦ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ✦ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے[1]

یہ سُن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین پھڑک گئے۔ کوئی صاحب بول اُٹھے۔ صاحب زادے ماشاء اللہ چشم بد دُور۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ لمؤلفہ ع یہ بچپنے کی ہیں باتیں شباب کیا ہوگا۔ میر ضمیر صاحب نے پھر پوچھا۔ تخلص کیا کرتے ہو۔ عرض کیا تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرما دیں۔ فرمایا دبیر[2]۔ اور پھر کہا "بر دبیراں روشن ضمیر مخفی و محتجب نماند" اور مسکرا کر بولے۔ صاحبزادے۔ میں نے اپنے نفس و نام کو مقدم کر دیا۔ کہ اس

تصنیف اردو مرثیہ کی پہلی

[1] بعض حضرات اس کو رباعی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اُن کی عروض سے ناواقفی ہے۔ رباعی کے لئے بحر ہزج خاص ہے۔ اور یہ نظم اُس بحر میں نہیں ہے۔ اس لئے قطعہ ہے ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

(لطیفہ)

[2] دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ یہاں پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ شاید ۱۸۸۲ء میں مجھ سے بمقام آگرہ شاہ گنج وزیر صاحب مرحوم مشیّاز و خلف الصدق جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رمسہ فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب کے روبرو ایک انیسیئے اور ایک دبیرئے جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے ممدوح کے کلام کو پڑھ کر اُس کی خوبیاں بیان کر کے دوسرے پر ترجیح دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ دبیرئے بولے۔ اور باتیں تو درکنار ایک تخلص ہی کو دیکھئے کس قدر عظمت اور برکت نمایاں ہے۔ اُس کے وزن پر کس کثرت

مشہور جملہ ہیں دبیر اوّل ضمیر بعد کو ہے۔ میں تمکو بتاؤنگا ضرور رکھا کرو۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کی زبان فال ہوا کرتی ہے۔ جو کچھ میر ضمیر (روشن ضمیر) نے فرمایا تھا وہی ہوا۔ کہ آج مرزا دبیر میر ضمیر پر تمام ملک کے نزدیک گویا مقدم ہیں۔ اپنے اُستاد سے بڑھکر شہرت اور عزت پائی۔ زیادہ شاگرد پائے۔ اور اس فن مرثیہ گوئی (رزم و بزم) کو جس کے موجد ضمیر ہیں ترقی دی۔ اس موقع پر دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ اس لئے میں ایک عجیب و غریب بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ میں نے بہت سے تذکرے دیکھے۔ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر نظر آئے۔ مگر دبیر تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا مجھے نظر نہیں آیا۔[۱]

منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم گویا اسی موقع کے لئے فرما گئے ہیں ؎

شاعراں حال کیا مضمون تو باندھیں اسیر ✤ ڈھونڈھتے ہیں یہ تخلص بھی نیا ملتا نہیں

مرزا صاحب مرحوم نے جا بجا اپنے مرثیوں میں شاعرانہ دعوے فرمایا ہے ؎

کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے ✤ مضمون بھی ہمارا نہیں لڑتا ہے کسی سے

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ؎

وہ تازہ مضامین کا رن آج پڑیگا ✤ مصرع تو کہاں ذہن کسی کا نہ لڑیگا

تیسرے مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

ماتم کی انجمن ہے یہاں رن نہ پڑنے پائے ✤ صابر کا مرثیہ ہے نہ مضمون بھی لڑنے پائے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) سے تخلص ہیں اور کثرت سے مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔ مشیر۔ منیر۔ مطیر۔ نظیر۔ قدیر۔ ظہیر۔ فقیر۔ امیر۔ وزیر۔ خبیر۔ نصیر۔ صفیر۔ سفیر۔ حقیر۔ صغیر۔ کبیر وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کیا ہے ڈھاک کے تین پات انیس۔ نفیس۔ سلیس آگے بڑھئے تو جلیس۔ مفتی صاحب نے فرمایا تخلص تو اُدھر بھی بہت ہو سکتے ہیں۔ پوچھا کیا۔ فرمایا۔ انیس۔ بیس۔ اکیس۔ بائیس۔ تیئیس۔ اڑتالیس تک۔ حاضرین یہ لطیفہ سُن کر بے اختیار ہنسے۔ اور فضول جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا ✤ ۱۲ مُولف۔

[۱] ناظرین کتاب میں سے اگر کوئی صاحب یہ تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا دیکھ چکے ہوں۔ تو کرم فرما کر مجھے آگاہ فرمائیں کہ انشاء اللہ دوسری مرتبہ چھپوانے پر اپنے خیال کی تردید اور اُن کا شکریہ درج کتاب کرونگا ✤ ۱۲ اثبات بلے بضاعت

مرزا صاحب زندہ ہوتے۔ تو میں اُن سے عرض کرتا۔ اب اُن کی روح سے گزارش کرتا ہوں کہ مضمون اور مصرع لڑنا تو درکنار حضور کا تخلص بھی کسی سے نہیں لڑا۔ درحقیقت آپ امام صابرؑ کے دل سے مداح تھے ممکن ہے کہ یہ بھی اُسی کا اثر ہو +

مرزا صاحب کا حلیہ فصل ۳

حلیہ لکھنے سے پہلے اتنا عرض کرتا ہوں۔ کہ میں نے کوشش بلیغ کی۔ کہ لکھنؤ میں یا اور کہیں مرزا صاحب مرحوم کی قلمی یا عکسی تصویر مل جائے۔ مگر ناکام رہا[1]۔ دریافت پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور بعض معمر اصحاب کی زبانی معلوم ہؤا۔ کہ فوٹو کا مسئلہ علمائے اسلام میں مختلف ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب نے اپنی تصویر نہیں کھچوائی۔ حالانکہ شاہی فوٹوگرافر مشکور الدولہ مرحوم مرزا صاحب مرحوم کے فدائی شاگرد نے بہت چاہا۔ مگر مرزا صاحب تصویر کھچوانے پر راضی نہ ہوئے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ کسی نے کلکتہ۔ پٹنہ۔ بنارس۔ آرہ۔ کھجوہ وغیرہ میں اُنکی بغیر اجازت فوٹو لے لیا ہو۔ کہ ان مقامات پر مرزا صاحب بعد غدر ۱۸۵۷ء گئے ہیں۔ خیر اب حلیہ ملاحظہ فرمائیے

حلیہ

پکا سانولا رنگ۔ کسی قدر کشیدہ قامت۔ ماتھا بڑا۔ کثرت سجود سے ماتھے پر سجدہ کا نشان جو نہایت خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی جو ایرانی الاصل ہونیکا پتہ دیتی تھیں۔ گول دُہرا ڈیل[2]۔ دو انگشتی ڈاڑھی۔ بڑی اور پاٹ دار دلگداز آواز۔ واعظ و ذاکر کے واسطے بڑی اور دلگداز آواز ہونا بھی ایک خداداد نعمت ہے۔ مگر حسد بری بلا ہے

---

[1] قدردان علم و ہنر مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے قریباً تمام ہندوستان کے سربرآوردہ اردو اخباروں میں بطور اشتہار خطوط شائع فرمائے۔ اور اپنی جیب خاص سے ۵۰ تصویر لانیوالے صاحب کو دینا چاہے۔ مگر تصویر دستیاب نہ ہوئی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ اب سے تیس سال پہلے ایک یورپ کا علم دوست سیاح مرزا صاحب کے حالات و کلام لیگیا۔ مگر تصویر اُس کو بھی نہ ملی۔ حالانکہ اُس نے لکھنؤ میں بہت تلاش کی تھی۔ اور اُس زمانہ میں مرزا صاحب کے انتقال کو بھی تھوڑا عرصہ گذرا تھا + ۱۲ مولف۔

[2] جس سے خیال ہوتا تھا۔ کہ ضرور ورزش جوانی میں کی ہوگی۔ بلکہ ہر روز تخلیہ میں کثرت کرتے ہوں۔ تو کیا عجب ہے ۱۲ + مؤلف بے بضاعت

معلوم ہوتا ہے۔ کہ کچھ لوگ اس بڑی آواز کو بھی نام رکھتے تھے چنانچہ خود ایک رباعی میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں۔ رباعی ؎

جب شاہ نجف معین و ناصر ہوئے + کیوں سب میں نہ ممتاز یہ ذاکر ہوئے
آواز ہے بھاری تو ہو۔ پر بات یہ ہے + مجلس میں سخن نہ بار خاطر ہوئے

لباس

لباس۔ سر پر گول پچ گوشیہ ٹوپی جسم میں اندر شلوکہ۔ اوپر ڈھیلا کرتہ جو گھٹنوں سے نیچا ہوتا تھا۔ اُس کے نیچے ڈھیلا پائجامہ۔ اور پائجامے کے نیچے ایک جانگیہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے۔ پاؤں میں گھیتلا جوتہ +

غذا

غذا۔ صرف ایک وقت دن میں نو دس بجے غذا نوش فرماتے تھے۔ رات میں صرف چائے پیتے تھے۔ اور جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے تھے۔ اُن کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے۔ اور تپ محرقہ میں سات روز تک بیہوش رہے۔ تو اچھے ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت غذا کر دی گئی تھی۔ مگر چند روز کے بعد جو دیکھا تو پھر رات کی غذا نادرد تھی۔ جناب استادی اوج مدظلہ[۱] نے پوچھا۔ تو فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے رات کی غذا ترک کر دی +

فصل ۵ استعداد علمی

استعداد علمی۔ یہ بات لکھنؤ میں خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً مشہور ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھیں۔ جملہ علوم معقول و منقول میں تبحر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ صرف و نحو و منطق و ادب و حکمت وغیرہ مولوی غلام ضامن[۲] صاحب (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) سے اور کتب دینیہ حدیث و

---

[۱] ان اکثر حالات کو مختلف اصحاب نے بیان فرمایا ہے۔ اور بعض امور کی صحت خود حضرت اوج مدظلہ سے حقیر نے کر لی ہے۔ حقیر نے خود بھی جناب مرزا صاحب مرحوم کی زیارت کی ہے اور انکو پڑھتے بھی سنا ہے۔ در دولت پر بھی باریاب ہوا جب جناب مرحوم کا انتقال ہوا میری عمر ۱۲ سال کی تھی بعض حالات اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) سے سُنے۔ کچھ شمس الضحیٰ سے لئے۔ اس طرح یہ مجموعہ مرکب طیار ہوئی۔ مؤلف حقیر

[۲] مولوی غلام ضامن مرحوم اُس زمانہ کے ایک فاضل متبحر تھے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی مرزا فاخر مکین کے حالات میں

تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی[۱] صاحب (طاب ثراہ) سے پڑھی تھیں علاوہ ان کے ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی اور مولوی فدا علی صاحب اخباری (رحمہما اللہ) سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا تھا۔ مولوی فدا علی صاحب اخباری کے ایک شاگرد رشید مولوی گلشن علی صاحب اخباری جون پوری نے ایک مجلس میں مرزا صاحب سے فخریہ کہا تھا۔ کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک اُستاد کے شاگرد ہیں اس لئے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ بیشک آپکا اور میرا فخر ہے۔ کہ آپنے اور میں نے ایسے محدث کامل سے پڑھا ہے۔ اور آپ میرے اُستاد بھائی ہیں +

مذہب

مذہب۔ ازبسکہ مرزا صاحب مرحوم کے کئی اُستاد اخباری تھے بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے۔ مگر تحقیق یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب ایک مُحتاط اصولی شیعہ تھے +

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) آب حیات کے صفحہ ۱۷۲ کو ان کے ذکر خیر سے آبروے تازہ بخشی ہے اور یہ نقل لکھی ہے۔ کہ مولوی غلام ضامن صاحب رنتھے کے فاضل تھے۔ ایک دن غزل لیکر (مرزا فاخر مکین کشمیری کے پاس) گئے۔ کہ مجھے شاگرد کیجئے۔ اور اسے اصلاح فرمایئے مرزا فاخر نے ٹال دیا مولوی صاحب نے پھر کہا۔ اُنہوں نے پھر انکار کیا۔ اور کج خلقی کرنے لگے۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے سب مولوی صاحب نے ادا کئے۔ ایک نہ قبول ہُوا۔ ناچار یہ شعر پڑھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے ع "مرزا مکین ما نشود چوں بکیں ما + کین ہست جزو اعظم مرزا مکین ما" + اس سے مولوی غلام ضامن صاحب کی طبیعت حاضر کی روانی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ کیسا فی البدیہ برجستہ لاجواب شعر فرمایا ہے + ۱۲ مؤلف۔

[۱] مرزا کاظم علی صاحب کا ذکر خیر کچھ اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علم و فضل کی تمام لکھنؤ میں دھاک تھی۔ اور زہد و ورع کا شہرہ تھا۔ انہیں کے اخلاق حمیدہ کی نسبت مرزا جعفر علی صاحب فصیح مرحوم مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں ع عام عامل فقیہ لوذعی ہادی کامل امام یلمعی + ابر رحمت آفتاب مکرمت + کوکب دری سحاب مکرمت + مالک اقلیم زہد و اتقا + حکمران کشور حلم و حیا + حامی دین ماحی کفر و ضلال + سر گروہ عالمان باکمال + گلبن شاداب گلزار علی + طالب حق میرزا کاظم علی + جناب شیخ ناسخ نے بھی ان کی تاریخ وفات بہت عمدہ کہی ہے۔ اور بہت مدح اخلاق حمیدہ فرمائی ہے + ۱۲ مؤلف۔

اُستاد فن شعر

فن شعر میں وہ میر مظفر حسین صاحب ضمیر مغفور کے شاگرد تھے۔ مگر تمام اساتذہ کو نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید حسن صاحب لطافت مرحوم (خلف الصدق امانت مغفور) نے مرزا صاحب سے بسبیل تذکرہ پوچھا کہ کیا آپ کو دلگیر مرحوم سے بھی تلمذ تھا۔ فرمایا اگر تلمذ ہوتا۔ تو میرا فخر تھا۔ لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا*

حقیر عرض کرتا ہے۔ کہ درحقیقت فن شعر میں تو اُن کے اُستاد صرف ایک میر ضمیر مغفور ہی تھے۔ مگر ان اساتذہ اربعہ میں بھی سب کے سب ادیب یا شاعر بلکہ شاعر گر تھے۔ اس لئے بہت سے رموز شاعری ان کو علماء ممدوحین سے حاصل ہوئے تھے۔ یہ حضرت ملّا مہدی مازندرانی طاب ثراہ کا فیض تلمذ و صحبت خدمت ہے۔ کہ مرزا صاحب کی فارسی کی نظم بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ خصوصاً ہفت بند ملا کاشی رح کا مخمس قابل دید ہے۔ کہ ہر بند کے پانچوں مصرع ایک ہی شخص کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک زباندان کے لئے کمال کی بات یہ ہے۔ کہ وہ اپنا کلام اہل زبان کے کلام سے ملا دے*

باب سوم۔ مرزا صاحب کی شہرت اور ترقی

باب ۳ شہرت و ترقی فصل اول

مرزا صاحب کی شاعری۔ مرثیہ گوئی۔ تحصیل علم۔ عمر عناصر اربع کی طرح ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں۔ ذہین و ذکی صد درجہ کے تھے۔ اٹھارہ اُنیس سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اسی درمیان میں مرثیہ گوئی کو بھی خوب شہرت ہو گئی۔ اب تک لکھنؤ میں چار مرثیہ گو مستند مانے جاتے تھے۔ ضمیر۔ خلیق۔ دلگیر۔ فصیح۔ اب مع دبیر پانچ مانے جانے لگے۔ گویا مرثیہ گوئی کی ٹوپی اب تک چوگوشیہ تھی۔ اب پنج گوشیہ ہو گئی۔ مرزا صاحب کی شاعری کو خداداد طبیعت و ذہن نے (کہ وہ قدرتی شاعر تھے) اور ذہن کو علم نے اور علم کو حلم نے اور حلم کو تقوے و پرہیزگاری نے چمکایا۔ ان تمام اوصاف حمیدہ کی سرتاج

سخاوت و مہمان نوازی تھی۔ جو خدا نے مرزا صاحب کی سرشت و خمیر میں رکھی تھی۔ ابھی تک بزرگوں کے وقت کا اسباب بیچ بیچ کر مرزا صاحب کے والد ماجد کھاتے تھے۔ مرزا صاحب کا دل جس مہمان نوازی اور سخاوت کو چاہتا تھا۔ اُس کے وہ جوہر نہیں دکھلا سکتے تھے۔ مگر سے بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد۔ اگر خارے بود گلدستہ گردد۔ اب اُس کا عجیب و غریب موقع آیا +

اسباب ترقی قدرتی پیدا ہو گئے۔ جہاں جہاں بڑی بڑی مجلسوں میں میر ضمیر صاحب سے مجلس میں پڑھنے کا وعدہ لیا جاتا تھا۔ وہاں وہاں مرزا صاحب سے بھی لوگ وعدہ لینے لگے۔ اور اُن مجلسوں کے علاوہ بھی مرزا صاحب کو لوگ پڑھوانے لگے۔ لکھنؤ کی ریاست ایسی جلدی جلدی ترقی کر رہی تھی۔ کہ گویا عنقریب یہ سلطنت بن جائیگی۔ دہلی۔ آگرہ کے خصوصاً اور ہندوستان کے اور شہروں اور قصبوں اور دیہات کے عموماً اہل کمال سمٹ کر لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ بادشاہ سے لیکر امراء بلکہ غربا فقرا تک مذہب سبھی یا شیعہ تھا یا صوفی یا ایسے سُنّی کہ جو عزائے شہدائے کربلا کو اپنا فرض اعتقادی سمجھتے تھے۔ مرثیہ گویوں اور ذاکروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ نہایت عزت و احترام اور ادب و عاجزی کے ساتھ ذاکر کی خدمت میں نذرانے پیش کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں اہل ہنود بھی مجلسیں کرتے تھے۔ اور اکثر لوگ مرزا صاحب کو پڑھواتے تھے۔ اور ان کے کلام کے مشتاق رہتے تھے۔ شاعروں کا فروغ بادشاہوں یا امیروں کی دست گیری سے ہوا کرتا ہے۔ مگر دبیر کا فروغ ائمۂ اطہار و شہدائے کربلا کی بدولت

اسباب ترقی / فصل ۲

ہوا اپنے نفس کے واسطے تو شاید ہی مرزا صاحب دولت و ثروت کے طالب ہوں۔ اس لئے کہ جہاں تک میں نے غور کیا۔ اور اُن کے کلام میں غور و تامل کیا۔ وہ مفلسی اور بے زری کو مالداری پر ترجیح دینے والے آدمی تھے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎ سر کو سرگشتہ بےسامان نہ کیا + دل کو بےجمع زر پریشاں نہ کیا۔ ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں + احسان کیا جو ہم پہ احسان نہ کیا + ۱۲ مؤلف حقیر

ہوا۔ اس مضمون کو وہ خود ایک مرثیہ میں یوں فرماتے ہیں:-

شاہوں کی مدد سے ہوئے آفاق میں نامی + خاقانی و فردوسی و سعدی و نظامی

دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے حقِ غلامی + عباس ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی

ہیں دو ہی دبیر اس میں نہیں ایک کو شک ہے

منبر مری جاگیر مقام اس کا فلک ہے

فصل ۳ شاہ اودھ نے مرزا صاحب کو بلا کر سنا

جہاں تک میرا حافظہ اور یادداشت تحریری[1] مدد دیتی ہے۔ اور میں نے سنا ہے۔ پہلے پہل مرزا صاحب کو پہلے بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر مرحوم نے شہرۂ کلام و کمال سن کر اپنے عزاخانہ خاص میں پڑھنے کو چوبدار بھیج کر بلوایا۔ مرزا صاحب پینس میں سوار ہو کر اپنے معمولی لباس میں (جو میں اُدھر لکھ آیا ہوں) پہنچے۔ راہ میں ایک بند کہہ لیا تھا۔ عزاخانہ میں بادشاہ سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعد سلام لینے کے مرثیہ پڑھنے کا اشارہ فرمایا۔ تو مرزا صاحب نے منبر پر جا کر حمد و نعت و منقبت میں ایک ایک رباعی پڑھ کر وہی بند پڑھا۔ وہ بند یہ ہے:-

فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں + واجب ہے حمد و شکر جنابِ الٰہ میں

چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں + مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں

ذرّے پہ چشمِ مہر ہے مہرِ منیر کو

حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو[2]

---

[1] یہ واقعہ اور یہ بند میں نے اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کی زبانی غالباً اب سے ۳۰ سال پہلے سنا تھا۔ از بسکہ اب سے ۲۰ سال پہلے میں نے ایک مفصل تذکرہ آبحیات کے رنگ پر محض مرثیہ گویوں کا لکھنا چاہا تھا۔ اُس زمانہ کے بعض اخباروں میں اشتہار بھی دئے تھے اور لکھنؤ میں جو حالات معمر آدمیوں سے سنے تھے وہ بعض لکھ لئے تھے بعض اب تک یاد ہیں۔ اگر پورے پورے حالات نہ ملنے پر وہ عزم تو فسخ کر دیا۔ وہ یادداشتیں اور حالات اس کتاب کی ترتیب کے وقت بہت کام آئے سچ ہے خدا کسی کی محنت برباد نہیں کرتا ۱۲ مؤلف حقیر

[2] اس بند کے مضمون پر ذرا خیال کیجئے۔ بادشاہ کی مدح بھی کی۔ نرگس نئے انداز سے کہ اس میں بھی خدا کی تعریف ہے۔

پھر یہ مرثیہ جو اُسی زمانے میں کہا تھا۔ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

داغ غم حسینؑ میں کیا آب و تاب[1] ہے

جب مرثیہ پڑھتے پڑھتے اُس موقع پر پہنچے۔ کہ جناب سکینہ (دختر چار سالہ امام حسینؑ) نے یزید کو بادشاہ سمجھ کر اُس کے رُوبرو فریاد کی ہے۔ اور اُس کے لشکریوں کے ظلم کی داد چاہی ہے۔ تو بادشاہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بند یہ ہے (جناب سکینہ یزید سے کہہ رہی ہیں)

جب روز کبریا کی عدالت کا آئیگا ✤ جبّار بادشاہوں کو پہلے بلائیگا

انصاف و عدل اُن سے بہت پوچھا جائیگا ✤ تو آج داد دینے کی کل داد پائیگا

گُل کر دیا ہے دونوں جہاں کے چراغ کو

لُوٹا ہے تیرے عہد میں زہراؑ کے باغ کو

بادشاہ نے خواجہ سرا کو اشارہ کیا۔ کہ پھر پڑھواؤ۔ خواجہ سرا نے مرزا صاحب سے کہکر یہ بند دوبارہ پڑھوایا۔ بادشاہ کو اپنا خیال آگیا۔ یہ بند گویا تازیانۂ عبرت ہو گیا۔ مرزا صاحب تو مرثیہ پڑھ کر چلے آئے۔ بادشاہ کو رات بھر خوف خدا سے نیند نہ آئی۔ بار بار کہتے تھے۔ کہ خدا نے مجھے بھی بادشاہ کیا ہے۔ مجھ سے بھی سخت بازپرس ہو گی۔ دیکھئے میری غفلت مجھے کیا دکھاتی ہے۔ سویرے معتمد الدولہ آغا میر وزیر کو انصاف و عدالت کے باب میں بہت تاکید فرمائی[2]

فصل ۳
عہد نصیر الدین حیدر میں مرزا صاحب کی شہرت ہوجانی فسانہ عجائب سے ثابت

یہ بات بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ کہ فسانۂ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور نے عہد غازی الدین حیدر میں لکھنا شروع کیا۔ اور زمانہ نصیر الدین حیدر میں تمام کیا۔ اسی

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اور یہ بھی شکر کے قابل جگہ ہے۔ اور شکر خدا عقلاً و نقلاً واجب ہے۔ اور کتنی سچی بات کہی ہے۔ واقعی رستہ میں جب لوگوں نے یہ سُنا ہوگا۔ کہ آج جہاں پناہ نے مرزا دبیر کو مرثیہ پڑھوانے کو بلوایا ہے۔ تو ضرور چرچا کیا ہوگا۔ فوراً لکھنؤ بھر میں شور پہنچ گیا ہوگا ۱۲ مؤلف۔

[1] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے ۱۲ ثابت۔

[2] یہ کچھ میں نے نہیں سُنا کہ بادشاہ ممدوح نے مرزا صاحب کو نذرانہ کیا دیا۔ مگر عقل چاہتی ہے کہ ہزار دو ہزار روپیہ ملا ہوگا ۱۲ مؤلف

وجہ سے وہ کہتے ہیں ؎ یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ۔ پس عہد غازی الدین حیدر میں جن مرثیہ گویوں کی شہرت تھی۔ اور جو موجود تھے یا گذر چکے تھے۔ اُن کے نام سرور اس تلمیح سے لیتے ہیں۔ اصل مدح تو دلگیر مرحوم کی کرتے ہیں جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ دلگیر سے سرور کو زیادہ محبت و عقیدت تھی[1]

"مرثیہ گوبے نظیر۔ میاں دلگیر۔ صاف باطن۔ نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا" تلک عشرۃ کاملۃ۔ اس دو تین سطر کی عبارت میں سرور نے کمال کیا ہے۔ کہ دلگیر۔ ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مسکین۔ افسردہ۔ دبیر۔ سکندر۔ گدا۔ احسان۔ دس مرثیہ گویوں کے جو اس زمانہ تک گذر چکے تھے یا موجود تھے تخلص لکھ دئے ہیں۔ المختصر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہوں کے زمانہ میں مرزا صاحب کو بہت شہرت ہوگئی۔ اور یہ اُستاد مان لئے گئے۔ اور غربا و امرا سے لیکر شاہزادیاں اور بیگمیں تک ان کی شاگرد ہوگئیں۔ جن میں سے حسب ذیل نام آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (۱) ملکہ زمانی مرحومہ محل نصیر الدین حیدر بادشاہ۔ (۲) سلطان عالیہ دختر ملکہ زمانی۔ (۳) حاجی بیگم صاحبہ دختر نصیر الدولہ۔ جو بادشاہ ہو کر محمد علی شاہ کہلائے۔ (۴) نواب ممتاز الدولہ شوہر داماد شاہ اودھ۔ ان سرکاروں سے مرزا صاحب کے سفارشی رقعوں پر اہل حاجت کو سالانہ لاکھوں روپیہ[2] ملا کرتا تھا۔ اور یہ

[1] سُنا ہے کہ دلگیر مرحوم سے اُس زمانہ کے تمام اہل کمال محبت رکھتے تھے۔ وہ ایسے ہی وسیع الاخلاق نیک نہاد بزرگ تھے۔ شیخ ناسخ سے کامل اُستاد لکھنؤ سے جب الہ آباد گئے ہیں۔ تو دلگیر کو اس شعر میں یاد فرماتے ہیں ؎ متحد ایسے زمانے میں کہاں ہوتے ہیں + آپ دلگیر ہے ناسخ جو ہے دلگیر جدا۔ واقعی نیکی طبیعت عجب جوہر ہے۔ جو کمال پر صیقل کرتا رہتا ہے + ۱۲ مولف حقیر۔

[2] اس موقع پر لاکھوں روپیہ کے لفظ میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ واقعی یہی حال تھا + ۱۲ مولف حقیر۔

شاہزادیاں ع۲و۳ مرزا صاحب کی شاگرد بھی تھیں۔ مرزا صاحب کو آبا جان کہتی تھیں۔ حالانکہ مرزا صاحب نوجوان تھے۔ مگر ان کی عفت اور نیک چلنی بھی ضرب المثل تھی۔ بڑے بڑے شاہزادے اور حکام در دولت ع۱ پر حاضر ہوتے تھے۔ جس قدر مرزا صاحب کی شہرت و نیکنامی بڑھتی جاتی تھی۔ حاسدوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔ اور یہاں بمصداق المرء یقیس علی نفسہ ع۲ مرزا صاحب کسی کو اپنا دشمن ہی نہ سمجھتے تھے۔ اُن کے صاف دل کی تصویر اس انہیں کے آئینہ شعر میں نظر آرہی ہے ع

حاسد کو ہے پیچ و تاب کیوں موج کی شکل + یاں مثل حباب کچھ نہیں ہے دل میں

لوگ گھات میں لگے ہوئے تھے۔ خصوصاً وہ بعض شاگردان میر ضمیر صاحب جو مرزا صاحب سے پہلے کے شاگرد تھے۔ اور اب پیچھے رہ گئے تھے۔ حسد کا تازیانہ لگا کر اپنے فرس فراست و شہرت کو آگے نکالنا چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں نے سوچا۔ کہ شاگرد اور اُستاد میں بگڑوا دو۔ تاکہ مرزا صاحب بے اصلاحی کلام پڑھیں۔ قلعی کھلے۔ ہم کو اعتراض کا موقع ہاتھ آئے۔ کیونکہ یہ لوگ مرزا صاحب کے کلام کی تمام خوبیاں میر ضمیر صاحب کی اصلاح کی بدولت سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک دریا دل۔ امیر کبیر افتخار الدولہ مرحوم نے (جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ آخر الامر کربلائے معلےٰ میں جاکر روضۂ اقدس کے کلید بردار ہو کر وہیں سے سیدھے راہی جنت ہوئے) جن کے یہاں شبوں کی مجلسوں میں (جو ۱۹-۲۰-۲۱ ماہ رمضان کو ہوتی تھیں) اول مرزا دبیر بعد میر ضمیر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صاحبوں سے انیسویں کو اصرار بلیغ کیا کہ اکیسویں ۲۱

ع۱ اس فقرہ کی تائید میں تاریخ بہارستان اودھ دیکھئے + ۱۲ ثابت۔

ع۲ یعنی ہر شخص اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے۔ ایک سلام میں حقیر نے اس مضمون کو عرض کیا ہے ع جو نیک ہیں وہ سمجھتے ہیں نیک اوروں کو + خیال جیسا ہے ویسا ہی خواب دیکھتے ہیں۔ یہی تو وجہ تھی۔ کہ حضرت آدمؑ ایسے کامل العقل ہو کر اپنی زوجہ کے کہنے میں آگئے گیہوں کھا گئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۵ میر ضمیر صاحب سے کس طرح لوگوں نے بگڑوا دی۔

کو آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہکر پڑھیں۔ دونوں صاحبوں نے جواب میں ”انشاء اللہ“
اور ”بشرطِ فرصت“ کے معمولی الفاظ کہکر وعدہ کرلیا۔ مرزا صاحب کی مشقِ سخن اُن کے شباب کی
طرح زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے۔
ع ذرّہ ہے آفتاب دربو تراب کا۔ بیسویں[20] کو حسبِ معمول علے الصباح میر ضمیر صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا۔ حضور نے کچھ فکر فرمائی؟ فرمایا۔ مجھ کو اتنی فرصت کہاں۔ ایک مرثیہ
پہلے کا کہا ہوا ہے۔ اُسی میں مطلع اور چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں۔ وہی پڑھ دونگا۔ مرزا
صاحب نے اپنا نیا مرثیہ پیش کیا۔ اس کی زبان سلیس۔ بندش چُست۔ بیان دلکش۔ شوکت
الفاظ مؤثر وغیرہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور تعریف کی۔ مرزا صاحب نے عرض کی۔
یہ سب حضور ہی کا فیض اور تصدق ہے۔ اسے آپ پڑھیں۔ مَیں کچھ عذر کردونگا۔ میر ضمیر
صاحب نے انکار کیا۔ میر عابد علی صاحب بشیرؔ (شاگرد میر ضمیر صاحب یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کے
حاسدوں میں تھے) بولے۔ مَیں مرزا صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے شک
یہ بات نامناسب ہے۔ کہ شاگرد نیا مرثیہ پڑھے اور اُستاد پُرانا۔ میر ضمیر صاحب بولے
او میرا صاحب[1] ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ خیر تم کہتے ہو تو یونہی سہی۔
پھر ایک مرتبہ وہ مرثیہ دیکھ کر کہا۔ کہ اچھا اُوپر کا ٹکڑا جس میں فضائل ہیں تم پڑھو۔ اور
وہاں پریشان بھی کردیا۔ اخیر کا حصّہ جس میں مصائب ہیں مَیں پڑھونگا۔ مرزا صاحب بولے
بہت خوب۔ جہاں تک اُستاد نے حکم دیا تھا۔ وہ ورق پھاڑ لئے۔ باقی مرثیہ وہیں
چھوڑ آئے۔ اکیسویں[21] کو دونوں صاحب مجلس موصوف میں شریک ہوئے۔ افتخار الدولہ
نے اوّل مرزا صاحب سے کہا۔ اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا[2] نیا مرثیہ پڑھئے۔ اُنہوں نے کہا۔

---

[1] او میرا صاحب“ میر ضمیر صاحب کا گویا سخن تکیہ تھا۔ یہ روایت مَیں نے اپنا نا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کی زبانی لکھتا ہوں جو ان تمام معرکوں میں شریک تھے خود بھی انہوں نے تنقید آیات بحیات میر و اقعہ آب ہے ۲۷ سال پہلے ۱۳۰۳ھ میں لکھا ہے جو کتاب اُسی زمانہ میں مطبع حسینی لکھنؤ میں چھپ چکی ہے ۱۲ مؤلف

[2] یعنی کریم جب وعدہ کرتا ہے۔ تو وفا بھی کرتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب اُستاد قبلہ مدظلہ کا تو تصنیف مرثیہ ہے۔ نصف مَیں پڑھونگا۔ نصف جناب اُستاد
پڑھیں گے۔ یہ کہکر منبر پر گئے۔ حسب معمول دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے۔ ادھر میر عابد علی
بشیر نے میر ضمیر صاحب سے سرگوشی کی۔ اور کہا اول کا ٹکڑہ بہت چُست اخیر کا سُست
ہے۔ مَیں مرزا صاحب کو منع کئے دیتا ہوں۔ کہ یہ مرثیہ نہ پڑھیں اور کوئی مرثیہ پڑھ دیں۔ میر
صاحب نے فرمایا۔ اب یہ مناسب نہیں۔ مگر یہ کب مانتے تھے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی
آنکھ سے اشارہ کر چکے تھے کہ ذرا ٹھیریئے۔ وہ ممبر پر چُپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔
مجلس تصویرِ حیرت بنی ہوئی ہے۔ سناٹے کا عالم ہے۔ کہ میر بشیر نے قریب منبر پہنچ کر مرزا
صاحب کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جاکر آہستہ آہستہ کہا کہ اُستاد فرماتے ہیں۔
تم کوئی اور مرثیہ پڑھ دو۔ مرزا صاحب نے کہا۔ مَیں اور کوئی مرثیہ نہیں لایا۔ بااین ہمہ اگر اُستاد
کی یہی مرضی ہے۔ تو وہ خود مجھے آنکھ سے اشارہ فرمادیں۔ مَیں رباعیاں پڑھ کر ممبر سے
اُتر آؤں گا۔ تمہارے کہنے کا مجھے اعتبار نہیں۔ انہوں نے میر ضمیر صاحب کے کان میں
آکر کہا۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ آج ہی تو مجھ کو اُستاد کا امتحان منظور ہے۔ دیکھوں میرے
بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب یہ سُن کر آگ بگولا ہو گئے۔ ادھر مرزا دبیر ناکردہ گناہ
بار بار اُستاد کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ وہاں اشارہ کیسا۔ برافروختگی کے سبب سے سر زانو پر ہے۔
ناچار مرزا صاحب نے کچھ دیر کے بعد چند رباعیاں پڑھ کر وہی نیا مرثیہ شروع کیا۔ سامعین نے
تعریفوں کے پھول نثار کئے۔ سبحان اللہ۔ واہ وا۔ صلِّ علیٰ۔ ماشاء اللہ کے نعروں سے
تمام مجلس گونج اُٹھی۔ جہاں تک اُستاد کا حکم تھا پڑھے۔ آگے نہ بڑھے۔ منبر سے
اُترے۔ میر ضمیر صاحب تشریف لیگئے۔ فاتحہ پڑھ کر یہ فرماکر کہ یہ مرثیہ انہیں کا ہے۔
کسی پُرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اُتر آئے۔
مجلس کے بعد دو خلعت آئے۔ میر ضمیر صاحب کا غصّہ اُس وقت تک نہ اُترا تھا۔ اپنے
خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا۔ اُٹھا لے جاؤ۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب نے

دیکھئے اہلِ کمال کے کیسے کیسے ناز اُس زمانے کے اُمرا اُٹھاتے تھے۔ کہ میر صاحب نے خلعت پر ٹھوکر ماری اور افتخار الدولہ ایسے امیر کبیر نے اُف نہ کی ۱۲۔
مؤلف

یہ کہکر کہ جو اُستاد کے فائدے پر اپنے فائدے کو مُقدّم رکھے وہ ملعون ہے۔ اپنا خلعت بھی پھیر دیا۔ دُوسرے دن صبح کو حسبِ معمول اُستاد کی خدمت میں پہنچے۔ کہ حقیقت حال معلوم ہو۔ اُنھوں نے کم التفاتی فرمائی۔ پھر شب کو میر ضمیر صاحب کے یہاں شریک ہوئے۔ تو وہاں میر عابد علی بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے آوازے پھینکنا شروع کئے۔ مگر مرزا صاحب نے صبر و تحمل کو کام فرمایا۔ بعد ختم مجلس مع اپنے شاگرد میر ظہیر کے (جو اس کے راوی ہیں) اپنے گھر چلے۔ راستہ میں میر ظہیر سے کہا بھئی تم نے ان کی باتیں سنیں۔ ظہیر بولے۔ جناب اگر آپ تھوڑی دیر اور بیٹھے رہتے۔ تو مجھ سے کسی نہ کسی سے تلوار چل جاتی۔ دانتوں کے تلے اُنگلی دبا کر فرمایا۔ ہا۔ توبہ کرو۔ اُستاد کے گھر میں ایسی جسارت تمکو اتنی سی بات پر غصہ آگیا۔

مرزا صاحب کا عروج کمال

فصل ۶ زمانہ کا پلٹا کھانا اور مرزا دبیر کا عروج کمال ہے

اب زمانے نے دُوسرا پلٹا کھایا۔ مرزا صاحب نے (بمصداق اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ[۱]) خدا کا نام لیکر بے اصلاحی مرثیے پڑھنا شروع کر دئے۔ ہر مہینہ میں اپنے گھر کی گیارھویں کی مجلس[۲] میں ضرور نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ اُسی زمانے کے ایک سلام کا مقطع ہے۔ جس میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں ؎

دبیر اس کو سمجھو مہینہ ہمارا ✣ نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر مہ

اُدھر اکثر لوگوں کی صلاح سے ہر مہینہ کی تیرھویں کو ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں

۱؎ ظاہر الفاظ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ خدا کو میں نے اپنا کام سونپ دیا۔ وہ بندوں کے حال کو خوب دیکھتا ہے۔

۲؎ دیکھئے مرزا صاحب کیا خوش نصیب خوش عقیدت تھے۔ زندگی میں اُن کی ولادت کے دن مجلس ہوتی تھی۔ مرنے کے بعد روز وفات قبر پر مجلس ہوتی ہے۔ مگر از بسکہ روز وفات تیسوئیں[۳۰] ہے۔ اور چاند کبھی انتیس[۲۹] کا بھی ہو جاتا ہے۔ تو یا تیسویں یا پہلی کو مجلس ہوتی ہے یعنی چاند اگر ۳۰ کا ہے تو تیسویں کو ورنہ پہلی کو مجلس ہوتی ہے۔ ۱۲ مولف جعفر۔

میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد شہرت تخلص نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں میر ضمیر صاحب خود کہکر شہرت کو مرثیہ دیتے تھے۔ مگر (ع قبول خاطر و لطف سخن خداداد است شہرت ہونا بخت و اتفاق سے متعلق ہے) میاں شہرت کو شہرت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد مرزا صاحب کے یہاں مجلس میں جانے سے لوگوں کو منع کرتے تھے۔ مگر مثل مشہور ہے۔ الانسان حریص علے ما منع۔ لوگ زیادہ سُننے کو آتے تھے۔ مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار اُن کے مخالفوں سے کہتے تھے۔ کہئے صاحب اب تو کوئی یہ نہیں کہ سکتا۔ کہ اُستاد نے اصلاح دے کر سُست کلام کو چُست کر دیا۔ اس درمیان میں اور بھی کئی شاہزادے اور شاہزادیاں اور نواب زادے اور امیر و غریب ہر طبقہ کے اہل علم و اہل کمال میں سے اکثر مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار ہو گئے۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نثر و نظم میں حملے کرتے تھے۔ کوئی صاحب مرثیہ میں فرماتے تھے ع ہمنام دبیر فلک پیر مٹا دوں۔ کوئی صاحب نثر میں دل کے بخارات نکالتے تھے۔ مرزا صاحب کے طرفدار و شاگرد اُن کو جواب دیتے تھے۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے معتقدوں کو سمجھاتے رہتے تھے۔ کہ دیکھو۔ اُستاد کا مرتبہ باپ سے بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ کیسا ہی کوئی سخت کلمہ کہہ بیٹھے۔ تم کوئی بات خلاف تہذیب نہ کہنا۔ واقعہ واقعی بیان کر کے بس اتنا کہدینا۔ کہ دبیر کا قصور نہیں ہے۔ اگر حیات مستعار باقی ہے۔ تو یہ سب شورشیں اور سوزشیں آپ سے آپ مٹ جائینگی۔ بقول مصحفی ؎

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائینگے دن ✤ فصل گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے

آدمی شدائد و مصائب میں مستقل رہے۔ زمانہ خود پلٹا کھائیگا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائیگا۔ مرزا صاحب کی عادت تھی۔ کہ جب زمانہ مخالفت کرتا تھا۔ وہ سکوت اختیار فرماتے تھے۔ گویا ان اشعار جناب امیر علیہ السلام پر اُن کا عمل تھا ؎

جو جس چیز سے روکا جاتا ہے۔ اُس کے کرنے کو آدمی کا دل زیادہ چاہتا ہے ✤

اَلدَّھرُ یَخنِقُ اَحیَانًا قِلَادَتَہٗ + عَلَیکَ لَا تَضطَرِب فِیہِ وَلَا تَثِبِ
حَتّٰی یُفَرِّجَھَا فِی حَالِ مُدَّتِھَا + فَقَد یَزِیدُ اِختِنَاقًا کُلُّ مُضطَرِبِ

ماحصل اس کا یہ ہے۔ کہ زمانہ کبھی کبھی اپنا گلوبند تیری گردن میں چسپت جکڑ دیتا ہے۔ پس تو نہ گود نہ تڑپ۔ یہاں تک کہ خود بخود زمانہ ہی اُس کو پُرانا کرکے ڈھیلا کر دے۔ کیونکہ تیرے تڑپنے سے وہ گلوبند اور زیادہ تنگ ہو کر تجھ کو زیادہ تکلیف دیگا۔ اور پُرانا پڑتا جائیگا۔ ڈھیلا ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک دن تیری گلوخلاصی ہو جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ کہ چند سال کے بعد مرزا صاحب کی شہرت کمال کا آفتاب اطراف عالم میں چمک گیا۔ ایک دن وزیر اودھ نواب علی نقی خاں مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نیا مرثیہ پڑھنے کے لئے منبر پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک تو وزیر اودھ کی مجلس (جو مثل شاہ اودھ مرزا صاحب کے قدرشناس و فدائی تھے)۔ دُوسرے مرزا صاحب کا پڑھنا۔ گویا تمام شہر کے شہزادے۔ نواب زادے عمائد اہل کمال۔ سخنور سخن شناس۔ سخن سنج لوگوں کا مجمع تھا جناب میر ضمیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جو غالباً بانی مجلس کی طلب پر تشریف لائے ہونگے۔ اس مجلس میں تمام شاہزادے اور جلیل القدر حکام مع حضور عالم (وزیر اودھ) شہ نشین پر تھے۔ اول مرزا صاحب نے ایک نظر سے تمام حاضرین کو دیکھا۔ پھر بآواز بلند فرمایا۔ کہ حضرات یہ مجلس عزا کسی بادشاہ دُنیا کا دربار نہیں۔ بلکہ شاہنشاہ دین و دُنیا کا دربار دُربار ہے۔ آپ حضرات جو شاہ نشین پر ہیں۔ بے تکلف ہو کر زیر منبر تشریف لائیں۔ اب کس میں طاقت تھی۔ جو تعمیل حکم نہ کرتا حضور عالم نے سبقت فرمائی۔ اُن کے پیچھے پیچھے تمام شہزادے اور عمائد زیر منبر آ بیٹھے۔ مرزا صاحب نے چند رباعیاں اور چند شعر سلام کے پڑھ کر یہ مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے۔

فصل ۱۰
اُستاد سے صفائی کی نوبت آئی

اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق[1]

حاضرین نے تعریفوں کے پھول نچھاور کئے۔ حضور عالم نے جب ایک موقع پر باواز بلند بہت تعریف کی۔ تو مرزا صاحب نے میر ضمیر صاحب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ یہ سب تصدق اور فیض جناب اُستاد کا ہے۔ مرثیہ ختم ہونے پر مرزا صاحب منبر سے اُترے۔ تو میر ضمیر صاحب نے اُٹھ کر گلے سے لگایا۔ وہیں سے مرزا صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ سب اگلی پچھلی باتیں دُہرائی گئیں۔ میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب بولے۔ اب یہ شخص اس لائق نہیں۔ کہ ہمارے یہاں آئے۔ مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کی۔ کہ ان کی خطا بھی میری خطا کے ساتھ ہی معاف فرمائیے۔ میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا۔ اور کچھ نادم ہوئے۔ پھر کوئی رنجش باقی نہ رہی۔ اور میر ضمیر صاحب کی گھر کی مجلس میں جو ماہواری ہوتی تھی مرزا صاحب پڑھا کئے۔ اور میر ضمیر صاحب کے سوم کی مجلس میں بھی میر انیس صاحب کے اصرار سے مرزا صاحب پڑھے[2]۔ نانا مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ یہ مجلس سرائے معالی خاں میں (ماہواری) میر ضمیر صاحب کرتے تھے۔ اور تبرک مجلس میں میں خود تقسیم کیا کرتا تھا۔ دیکھئے مرزا صاحب کی نیک طینتی۔ کہ میر عابد علی بشیر کی خطا بھی معاف کرائی۔ انتقام لینا تو کیسا۔ یہ انسانیت کے جوہر خداداد ہیں۔ میں نے اس مضمون کو ایک رباعی میں نظم کیا ہے۔ جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ رباعی

عادت اچھی نہیں بدی کرنے کی + خصلت بد ہے جلی کٹی کرنے کی
نیکی کے لئے بنا ہے تو اے ثابت + ممکن ہو تو دشمنوں سے بھی کریگی

---

[1] دفتر ماتم کی جلد ساتویں میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ پہلا یہ مطلع ہے ؎ قرآں سے فضیلت در و مرجاں کی عیاں ہے +۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس کا مفصل ذکر انشاءاللہ اپنے مقام پر ہوگا +۱۲ مؤلف حقیر۔

اس کے بعد میر عابد علی صاحب بشیر اور اکثر میر ضمیر صاحب کے شاگرد اُن کے حکم سے
اپنا اپنا کلام مرزا دبیر صاحب کو دکھایا کرتے تھے ۔ ع دشمن بھی دوست ہو گئے خلق
حسن یہ ہے ۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے جو حکایت آب حیات میں اس باب میں لکھی
ہے وہ غلط ہے ۔ اور اگر آزاد مرحوم اُس کے بعد مجنون نہ ہو جاتے ۔ تو غالباً آب حیات
ہی میں اُس حکایت کی وہ تصحیح فرما دیتے ۔ جیسا کہ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا
اور میں نانا مرحوم کی کتاب تنقید آب حیات اور شمس الضحٰے بھی اُن کو بھیج دیتا ۔ مگر گُل
آخر مرا ہوں باوفا تھا ع یہ کام اب ہونا تھا اب ہوا ۔ اس موقع پر آب حیات کا نام
آ گیا ہے ۔ اس لئے میں اور واقعات غلط مندرجہ آب حیات کی صحت بھی کر دوں ۔
آب حیات کے ساتھ تنقید آب حیات کے مضامین (مختصر عبارت میں) لکھے دیتا ہوں
امید کہ مولانا آزاد دہلوی اور حضرت ظہیر لکھنوی کی رُوحیں خوش ہو ہو کر مجھے دعائیں
دیتی ہوں گی ÷

تنقید بعض مضامین آب حیات

"ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح مرزا دبیر کو پسند نہ آئی ۔ شیخ ناسخ کے
پاس گئے ۔ اُنھوں نے کہدیا ۔ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی ۔ اُنھوں نے کہا ۔ کتاب میں
تو یُوں لکھا ہے ۔ یہ ملاحظہ فرمائیے ۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ۔ اے تو کتاب کو کیا
جانے ۔ ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے ۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب
بن گئے ہیں ۔ ایسے غصہ ہوئے ۔ کہ لکڑی لیکر اُٹھے ۔ یہ بھاگے ۔ دروازہ تک اُن کا
تعاقب کیا ۔" میر ظہیر مرحوم فرماتے ہیں ۔ یہ بہتان عظیم ہے ۔ خود یہ عبارت پیر بخارا
کے پاک شہدوں کی بولیوں کا سماں دکھلاتی ہے ۔ اخلاق ذمیمہ کی بو آتی ہے ۔ کبھی مرزا
صاحب شیخ ناسخ کے پاس نہیں گئے ۔ حالانکہ اُن کو حسرت رہی ۔ شیخ ناسخ مرحوم کے
اخلاق کی شان کے یہ حکایت شایاں ہے ۔ اور شیخ ناسخ صاحب کے پاس مرزا صاحب

حکایت بے اصل ، مندرجہ آب حیات

٭ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے ÷

کے نہ جانے کی یہ وجہ تھی۔ کہ میر ضمیر صاحب سے اور شیخ صاحب سے چشمک تھی۔ کہ میر ضمیر صاحب مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور شاگردان مصحفی شیخ صاحب کو تنہا شاگرد مصحفی کا تعلیم یافتہ بتاتے تھے۔* شیخ صاحب اور اُن کے تمام شاگردوں کو اس سے انکار تھا۔ ایسی ایسی لاگ ڈانٹ مانع تھیں۔ نواب حسین علی خاں اثر کے یہاں شیخ ناسخ آتے تھے۔ مرزا صاحب کو رغبت سے سُنتے تھے۔ وہاں بھی کبھی اس قسم کی (خلاف انسانیت) گفتگو کا موقع نہیں آیا۔ یہ تو میر ظہیر مرحوم کے ارشاد کا خلاصہ تھا۔ اب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی پیدائش سنہ ۱۲۱۸ھ کی۔ اور صاحب شمس الضحے کی تحریر سے اور لکھنؤ کے معمر آدمیوں کی تقریر سے ثابت ہے کہ بارہ برس کی عمر میں مرزا صاحب میر ضمیر صاحب کے شاگرد ہوئے۔ اس کو سنہ ۱۲۳۰ھ سمجھئے۔ ادھر تحصیل علوم ادھر مشق سخن کرتے رہے۔ چار پانچ برس ہی میں خوب شہرت ہوگئی۔ پس سنہ ۱۲۳۵ھ کا یہ زمانہ ہوا۔ اسی سال نواب اودھ کو شاہ کا خطاب ملا۔ اور نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ پس اس زمانہ میں مرزا صاحب کی ایسی شہرت ہوگئی تھی۔ کہ وہ اُستاد مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ جیساکہ فسانہ عجائب کی عبارت مذکورہ شاہد عادل ہے کہ اُس میں ضمیر وخلیق وغیرہما کے ساتھ ساتھ دبیر کا نام بھی ہے۔ اچھا اب شیخ ناسخ مرحوم کے حالات پر خیال فرمائیے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے آب حیات کے صفحہ ۳۲۱ پر لکھا ہے۔ کہ خود شیخ ناسخ فرماتے تھے۔ کہ میں غزل لیکر گیا۔ مگر میر تقی میر مرحوم نے اصلاح نہ دی۔ میں غزل کہتا تھا۔ اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد غزل دیکھتا۔ اور خود

---

* گو اگرچہ مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ میں شیخ ناسخ کو یکے از دوستان محمد عیسٰے تنہا لکھا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ وہ تنہا کے شاگرد نہیں تھے دوست ہونا اور بات ہے شاگرد اور چیز ہے۔ اُس زمانہ کے لوگ جس کے پاس زیادہ آمدورفت و دوستی ہوتی تھی اُس کا شاگرد خیال کیا کرتے تھے۔ شاید اسی بنا پر شاگردان مصحفی نے شیخ صاحب کو شاگرد تنہا کہا ہوگا۔ اور غالباً اسی دوراندیشی سے مرزا صاحب کبھی شیخ ناسخ کے گھر پر نہیں گئے۔ جیساکہ میر ظہیر مرحوم نے تنقید آب حیات میں لکھا ہے میر ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے گیارہ بارہ برس کی عمر میں شاگرد ہوئے۔ مدۃ العمر ساتھ رہے۔ وہ مرزا صاحب کی زندہ تاریخ تھے۔ اللھم اغفرھما ۱۲ مؤلف حقیر۔

اصلاح کرتا اور رکھ دیتا تھا۔ غزل (مشاعرہ میں پڑھنا تو درکنار) کبھی کو سُناتا نہ تھا۔ سید انشا۔ جرأت۔ مصحفی سب کو مشاعرہ میں سُنتا تھا۔ مگر وہاں خود کچھ نہ کہتا تھا۔ انشا و مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے۔ اور زمانہ سارے ورق اُلٹ چکا۔ اور میدان صاف ہوگیا۔ تو مَیں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ یہ روایت جناب رغمی کی زبانی پروفیسر آزاد نے بہت وثوق سے لکھی ہے۔ جو رغمی شیخ صاحب کے شاگرد تھے۔ اب اس پر آپ غور فرمائینگے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ شیخ صاحب نے مصحفی کے مرنے پر یا کم سے کم بالکل اخیر زمانہ میں غزل مشاعرہ میں پڑھنا شروع کی تھی۔ اور مصحفی کا سال وفات آبحیات میں سنہ ۱۲۴۰ ہجری ہے شیخ صاحب مدت سے پوشیدہ مشق فرما رہے تھے۔ آدمی ذہین وذی علم وصاحب ثروت تھے۔ برس دو برس ہی میں شہرت ہوگئی۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ سنہ ۱۲۳۵ھ سے سنہ ۱۲۴۰ھ تک جو زمانہ مرزا دبیر کی شہرت کا ہے۔ وہی تو شیخ صاحب کی شہرت کا ہے۔ فرق اس قدر ہے۔ کہ مرزا صاحب سنہ ۱۲۴۰ھ میں بائیس ۲۲ سال کے جوان تھے۔ اور شیخ صاحب قریباً چالیس پچاس ۵۰ برس کے تھے۔ مگر یہ کب ہوسکتا ہے۔ کہ ایک شاعر اپنے معاصر کو گو وہ نوجوان ہی کیوں نہ ہو اس طرح پھٹکارے اور دُھتکارے۔ اور ایسے ایسے کلمات تحقیر کہے۔ "گدُّ ارے تو کتاب کو کیا جانے"۔ "ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے"۔ اور لکڑی لیکر مارنے کو دوڑے اور معاصر نوجوان بھی وہ کہ جس کے علم وتقدس کا بھی شہرہ ہو۔ شاگرد بھی بڑے بڑے شہزادے اور شہزادیاں اور نواب ونواب زادے اور اہل علم ہوں۔ کہ یہ امر بھی آدمی کے اقتدار کا باعث ہوُا کرتا ہے۔ یہ حکایت ضرور کسی ایسے شخص کی تراشی ہوئی ہے۔ جو شیخ ناسخ کی متانت و تہذیب اور مرزا صاحب کے تقدس وکمال بلکہ حال سے بھی ناواقف تھا۔

فصل ۹

شیخ صاحب کے دل میں جو وقعت مرزا صاحب کی تھی۔ اُس کا اندازہ ناظرین کتاب کو حکایت ذیل سے ہوگا جو نا مرحوم (میر ظہیر) اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔

بیت حکایت صحیحہ

حکایت صحیحہ۔ مَیں ایک روز محلہ ٹکسال میں ایک مجلس پڑھنے گیا۔ جو شیخ صاحب کے پڑوس

میں تھی۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ اُس وقت تک سامعین میں سے کوئی نہ آیا تھا۔ میں بانیٔ مجلس سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ تمکو جناب شیخ صاحب یاد فرماتے ہیں۔ میں پہنچا۔ دیکھا جناب شیخ ناسخ ایک کھارُوے کی لنگی باندھے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر مونڈھوں پر خواجہ وزیر۔ میر علی اوسط رشک وغیرہ شاگرد حاضر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔ بھئی محمد رضا تم تو مہینوں نظر نہیں آتے۔ میں نے عرض کی کیا عرض کروں۔ فرصت نہیں ہوتی۔ فرمایا آج یہاں تم اپنے اُستاد کا کوئی نیا مرثیہ پڑھوگے۔ میں نے عرض کی۔ حضور ایسا ہی ارادہ ہے۔ فرمایا۔ افسوس گرمی بہت ہے۔ میں مجلس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اچھا تم میرے حصہ کے ایک دو بند کسی مقام سراپا یا چہرہ کے یہیں مجھے سُنادو۔ میں نے اس خیال سے سکوت کیا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ میں کوئی بند پڑھوں۔ یہ کہ دیں۔ مرزا نے یوں نہیں یوں کہا ہوگا۔ اور اس پردہ میں یہ اعتراض کریں۔ مرزا صاحب کو خبر ہو۔ وہ جواب دیں۔ بات کا بتنگڑ ہو جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے جناب میر خلیق کے دو مصرعوں پر شیخ صاحب درپردہ دو اعتراض فرما چکے تھے جن کی اُس زمانہ میں بہت شہرت تھی۔ (۱) لیلاف بڑھا جب کہ اُسے دُودھ پلایا۔ (۲) اکبر علی اللہ نگہبان تمہارا۔ مصرع اوّل کو یوں بنایا تھا کہ ع بڑھ بڑھ کے لایلاف اُسے دودھ پلایا۔ اور مصرع دویم کو یوں پلٹا تھا۔ ع پیارے مرے اللہ نگہبان تمہارا۔ اور پھر خود ہی کہدیا تھا کہ میر خلیق نے بھی یوں ہی کہا ہوگا۔ میر خلیق تو سُن کر چپ ہو گئے تھے۔ مرزا دبیر جن کے بازوؤں میں علم کی قوت ہے۔ ذہن بھی اقبال بھی حافظہ بھی شباب اوراوج پر ہے۔ چپ ہونے والے نہیں ہیں۔ ضرور جھگڑا ہوگا۔ اِدھر میں چپ۔ اُدھر پھر شیخ صاحب نے فرمایا۔ ہاں بھئی پڑھو نا۔ میں نے پھر عرض کی۔ میں مرثیہ باواز بلند پڑھونگا۔ یہاں تک میری آواز آئیگی۔ ذاکر کے پڑھنے کا مقام منبر ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے

وارد حضور اُسی وقت سُن لیں۔ شیخ صاحب بولے۔ اس وقت تو دل بھی چاہتا ہے۔ اچھا تم سراپا میں سے ایک ہی بند پڑھ دو۔ اِدھر میر علی اوسط رشک اُدھر خواجہ وزیر بولے۔ جناب فرماتے ہیں ایک بند پڑھ دیجئے۔ مَیں نے اُسی مرثیہ میں سے جو پڑھنے والا تھا حسب ذیل ایک بند پڑھا:۔

گردش چشم کا مضمون

کیوں مدّ نظر چشم کو گردش ہے ہر اکبار + پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردم بیمار
ابرو کے قرینے سے کھُلا چشم کا اسرار + ہیں نور کے گھوارے میں عیسیٰؑ خوش اطوار

یاں پنجۂ مریمؑ کہوں پنجے کو پلک کے
گھوارے میں عیسےٰؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے

یہ بند سُن کر شیخ ناسخ اُچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانہ میں چلے گئے تین چار منٹ میں ایک کتاب لیکر آئے۔ فرمایا دیکھو یہ ظہیر فاریابی کا دیوان ہے۔ ظہیر نے بھی یہ دعوےٰ کیا تھا۔ اور پُتلی کو عیسےٰؑ سے تشبیہ دی۔ مگر وہ ثابت نہ کر سکا۔ مرزا نے کمال کیا ہے۔ پنجہ پلک کو پنجۂ مریمؑ کہکر ثابت کر دیا۔ کہ ع گھوارے میں عیسیٰؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے۔ پھر فرمایا۔ کہ سلامت علی سا طبیعت دار خلّاق مضامین نہ ہُوا ہے نہ ہوگا۔ بلاکی طبیعت پائی ہے۔ لطف تخئیل یہی ہے۔ کہ شاعر جو دعوےٰ کرے۔ اُس کو ثابت کر دے۔ کیا ثابت کیا ہے*

اسی طرح دُوسری حکایت خواجہ حیدر علی آتش کے متعلق آب حیات میں بے اصل لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خواجہ صاحب نے مرزا صاحب کی زبانی ایک پہلوان کی طولانی لڑائی سُن کر فرما دیا۔ کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی۔ آتش مرحوم تو شیخ

یہ بند اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے۔ اُس زمانہ میں یہ مرثیہ مرزا صاحب نے نیا کہا تھا۔ جلد اوّل دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے

(حاشیہ: شیخ ناسخ کی لسان کی پسندیدگی)

(حاشیہ: فصل ۱۰ حکایت ۲ بے اصل متعلق آتش مرحوم)

ناسخ کی شہرت سُن کر فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے تھے سان کا زمانہ شہرت تو مرزا صاحب کے بھی بعد کا ہے۔ گو عمر میں یہ بھی مرزا صاحب سے بڑے تھے۔ مگر ان کا اور مرزا صاحب کا خاندان شاعری ایک تھا۔ یہ بھی مرزا صاحب کی بہت قدر و عزت فرماتے تھے۔ ان کی شرکت مجلس کی کیفیت نانا مرحوم یوں بیان فرماتے تھے۔ کہ جس مجلس میں مرزا صاحب اشتہار دے کر اپنا غیر منقوط مرثیہ پڑھے تھے۔ اُس میں میر ضمیر مرحوم اور خواجہ آتش مغفور بھی تشریف لائے تھے۔ سامنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ میں (ظہیر) نے بے نقط سلام پیشخوانی میں پڑھا تھا۔ پھر مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا جس کا مطلع مشہور یہ ہے

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع۔ بعد ختم مجلس خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر یہ کلمہ کہا تھا کہ یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ آپ کا حصّہ ہے۔ یا فیضی کی تفسیر سُنی تھی۔ یا آج یہ مرثیہ سُنا۔ اس آواز کے سُننے والے ابھی کچھ اور لوگ بھی باقی ہیں[1]۔ یہ حکایت

آتش مرحوم کی قدردانی کی دوسری حکایت

ثانی (جس سے آتش مرحوم کی قدردانی ظاہر ہے) اور بھی سُن لیجئے۔ مرزا احمد صاحب ظہور مغفور مجھ سے ناقل تھے۔ کہ جس مجلس (عہد محمد علی شاہ یا امجد علی شاہ) میں مرزا صاحب یہ مرثیہ پڑھے تھے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل[2]۔ اُس میں خواجہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ جب مرزا صاحب نے یہ بند اسپ جناب علی اکبرؑ کی شان میں (جس کا نام عقاب تھا۔ اور جو جناب رسول خدا صلعم کی سواری کا گھوڑا تھا) پڑھا۔

---

[1] افسوس آج نہ مرزا صاحب ہیں نہ خواجہ صاحب نہ میر ظہیر نہ آزاد مرحوم۔ اور کچھ دنوں بعد راقم آثم بھی نہ ہوگا سلام بے نقط کلیات دفتر ماتم میں موجود ہے۔ جس کا انتخاب جلد دوم حیات دبیر میں حقیر نے بھی کیا ہے۔ مگر مرثیہ نہ چھپا ہے نہ تقسیم ہوا ہے۔ جناب استاذ مکرم حضرت اوج مدظلہ سے حقیر نے التماس کیا تھا کہ یہ چھپوا دیجئے۔ فرمایا وصیت جناب (دبیر) مرحوم کی مانع ہے۔ میں یہ کہکر چُپ ہو گیا۔ ع رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ ۱۲ اثابت +

[2] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں چھپا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال ✦ نکھ سکھ سے درست اور جواں بخت وجواں سال

جادو کی نری آنکھ۔ فقط معجزے کی چال ✦ خورشید کے سُم۔ برق کی دُم۔ سنبلہ کی یال

قوت کی طبیعت تھی۔ دلیری کا جگر تھا

سُرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر فرمایا۔ کہ بھئی سلامت علی خدا تمکو سلامت رکھے۔ کون کہتا ہے۔ کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو تم سے بہتر کوئی دُوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہ سکتا ✦

فصل ۱۱ متفرق مضامین آبحیات کی تنقید و تصحیح

ناظرین آئیے۔ حضرت آزاد و جناب ظہیر مرحومین کی رہبری سے چشمۂ آبحیات کے کنارے کنارے ذرا تھوڑی دُور آور چلئے۔ جواہرات رول لائیے۔ پتھر پھینکتے جائیے ✦

(۱) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ مرزا صاحب نے بے نقط مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ ع ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا۔ مگر تحقیق یہ ہے۔ کہ یہ مرثیہ مرزا صاحب کے ایک شاگرد آغا محمد تقی خاں اختر مرحوم کا ہے۔ جنہوں نے بعد کو مرزا صاحب کی شاگردی سے انکار کر دیا تھا۔ مرزا صاحب کا بے نقط وہی مرثیہ مذکورہ بالا ہے ✦

(۲) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ کہ کم سے کم مرزا صاحب نے تین ہزار مرثیے کہے ہونگے۔ یہ شاید صحیح ہو۔ مگر اس وقت تو ہمکو ایک ہزار مرثیے بھی اُن کے نہیں ملتے۔ بلکہ بمشکل چار یا پانچ سو مرثیہ پائے جاتے ہیں۔ مگر مرزا صاحب کے ہزاروں مرثئے مشہور ہونے کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) واقعی سیکڑوں مرثئے اُنہوں نے لکھکر دُوسروں کو دیدئے۔ پھر وہ مرثئے نہ اُن کے پاس رہے نہ آج دستیاب ہو سکتے ہیں۔ گویا معدوم ہو گئے ✦

(۲) بہت سے مرثئے دُوسروں کے تخلص ڈال کر دئے۔ یا دُوسروں کی فرمائش

سے ایسے کہدئے۔ کہ جس رنگ کو وہ زیادہ پسند نہ فرماتے تھے۔ مثلاً لکھنؤ میں مجھے دسمبر ۱۳۳ء میں معلوم ہؤا۔ کہ سلطان عالیہ کی فرمائش سے مرزا صاحب نے اُنکو چالیس پچاس مرثئے ایسے کہدئے۔ جن میں محض سلاست بندش اور لطف زبان ہے۔ استعارات اور صنائع و بدائع کا نام نہیں ہے۔ وہ مرثئے اُن کے عزیزوں میں کوئی بیگم صاحب ہیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ مَیں نے کوشش بھی کی۔ مگر اُن مرثیوں کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔

(۳) مرزا صاحب کے بعض کامل شعراء مرثیہ گو شاگرد منیر شکوہ آبادی۔ قدیر الدولہ قدیر۔ مولوی فقیر حسین عظیم۔ شیخ گوہر علی مشیر۔ نظیر لکھنوی۔ میر صفدر علی صفدر وغیرہ کے سیکڑوں مرثئے ہیں۔ جن کو عام لوگ مرزا صاحب کے مرثئے سمجھ رہے ہیں۔

(۴) مرزا صاحب کا ایک خاص ایجاد یہ ہے۔ کہ ایک ایک مرثیہ میں موقع موقع سے چار چار پانچ پانچ مطلع کہدئے ہیں۔ کہ ذاکر جس موقع سے چاہے پڑھ دے۔ اس صورت میں اگر ایک ہزار مرثیہ بھی کہے۔ تو خواہ مخواہ چار پانچ ہزار مرثئے مشہور ہو سکتے ہیں۔

(۳) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو انتقال فرمایا۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری کو رحلت فرمائی۔ عمر تخمیناً لکھی ہے۔ وہ کچھ غلط نہیں ہے۔ اس لئے کہ ۷۴ سال کی عمر قمری حساب سے تھی۔ ہر ۳۶ سال میں شمسی و قمری حساب کی مطابقت سے ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ پس ۷۴ سال کے ۷۲ سال بحساب شمسی باقی رہ جاتے ہیں۔

(۴) باقی آزاد مرحوم نے جو انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں لکھی ہیں۔ وہ بطور مزاح ہیں۔ اور آخر میں خود فیصلہ فرما دیا ہے۔ اور منصفی کی زبانی فیصلہ دیا ہے۔ کہ دونوں اچھے۔ اس لئے اس پر مَیں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ میر انیس مرحوم کے حال کے اخیر میں بلکہ گویا آب حیات کے خاتمہ پر جو فقرہ لکھا ہے۔ اُس کو مَیں یہاں لکھ کر کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ فقرہ یہ ہے "یہ بات درست ہے۔ کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی

لیکن حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ اُن کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے"۔ میں اس فقرہ کی دل سے داد دینے کو طیار ہوں۔ مگر اُس کے ساتھ اتنا اور کہونگا۔ کہ غالباً مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو مرثیہ پڑھتے ہوئے کبھی سُنا نہ تھا۔ ورنہ وہ جس طرح میر صاحب کا چشم دید مرثیہ پڑھنا آب حیات میں لکھ چکے ہیں۔ مرزا صاحب کا سُننا بھی ضرور لکھتے۔ میں نے میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں بزرگوں کو سُنا ہے۔ حقیقت میں میر صاحب کا پڑھنا لاجواب تھا۔ وہ خود گویا مضمون کی تصویر بن جاتے تھے۔ ایسا بتاتے تھے* اور مرزا صاحب کا کم بتلانا اور وہ اُس کی سادگی۔ ایک ایسی قدرتی چیز تھی۔ کہ جس پر تمام مجلس تصویر حیرت بن جاتی تھی۔ میں نے میر صاحب کے سُننے کے بعد حاضرین مجلس کو یہ کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ کہ آج مرزا صاحب کو بھول گئے۔ اور مرزا صاحب کے سُننے کے بعد اُنہیں لوگوں کو یہ کہتے سُنا۔ کہ میر صاحب کو بھول گئے۔ اگر مرزا صاحب کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی۔ تو سامعین و حاضرین ایسا فقرہ کیوں کہتے تھے۔ ہاں یہ بات مولانا آزاد ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا مرثیہ اور بھی کوئی پڑھتا ہے۔ تو زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میر صاحب کا کلام ایک طرز خاص کے بتانے کا محتاج ہے۔ اور مرزا صاحب کا کلام اکثر اداؤں (موشنس) کو خود ادا کرتا ہے۔ اور مرزا صاحب کے مرثیوں پر مجلسوں میں خواہ وہ سوز میں پڑھے جائیں خواہ تحت لفظ۔ رقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا آزاد نے یہ رائے بہت تجربہ کے بعد غالباً قائم فرمائی تھی۔ کیونکہ مجھ سے حکیم

---

* میں نے میر صاحب کے خاندان کے اکثر ممبروں کو اور اُن کے شاگردوں میں شیخ امیر علی مرحوم کو سُنا ہے۔ اپنے اپنے مقام پر سب اچھا پڑھتے تھے۔ مگر میر صاحب کا طرز خاص بجز اُن کے چھوٹے صاحبزادے میر محمد صاحب سلیس کے اور کسی میں نہ پایا۔ لکھنؤ محلہ ٹکسال میں میر محمد صاحب مرحوم خوب خوب مجلسیں پڑھتے تھے۔ وہ صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں۔ کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں ۱۲۔ ثابت حقیر۔

محمد حسین صاحب دہلوی (جن کا ابھی شاید دو سال ہوئے بمقام ڈبائی ضلع بلند شہر انتقال ہوا ہے) بیان فرماتے تھے۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء والد ماجد آزاد مرحوم جناب مولوی مرزا محمد باقر صاحب مرحوم بڑی سیر چشمی اور خوش اعتقادی سے مجلس کرتے تھے۔ اُس مجلس میں آزاد مرحوم میر صاحب کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اور اَور ذاکر کوئی میر صاحب کا کوئی مرزا صاحب کا کلام پڑھتا تھا۔ ان مجلسوں میں غالباً آزاد مرحوم کو اس بات کا اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ مرزا صاحب کے مرثیہ پر مجلس میں رقت زیادہ ہوتی ہے*

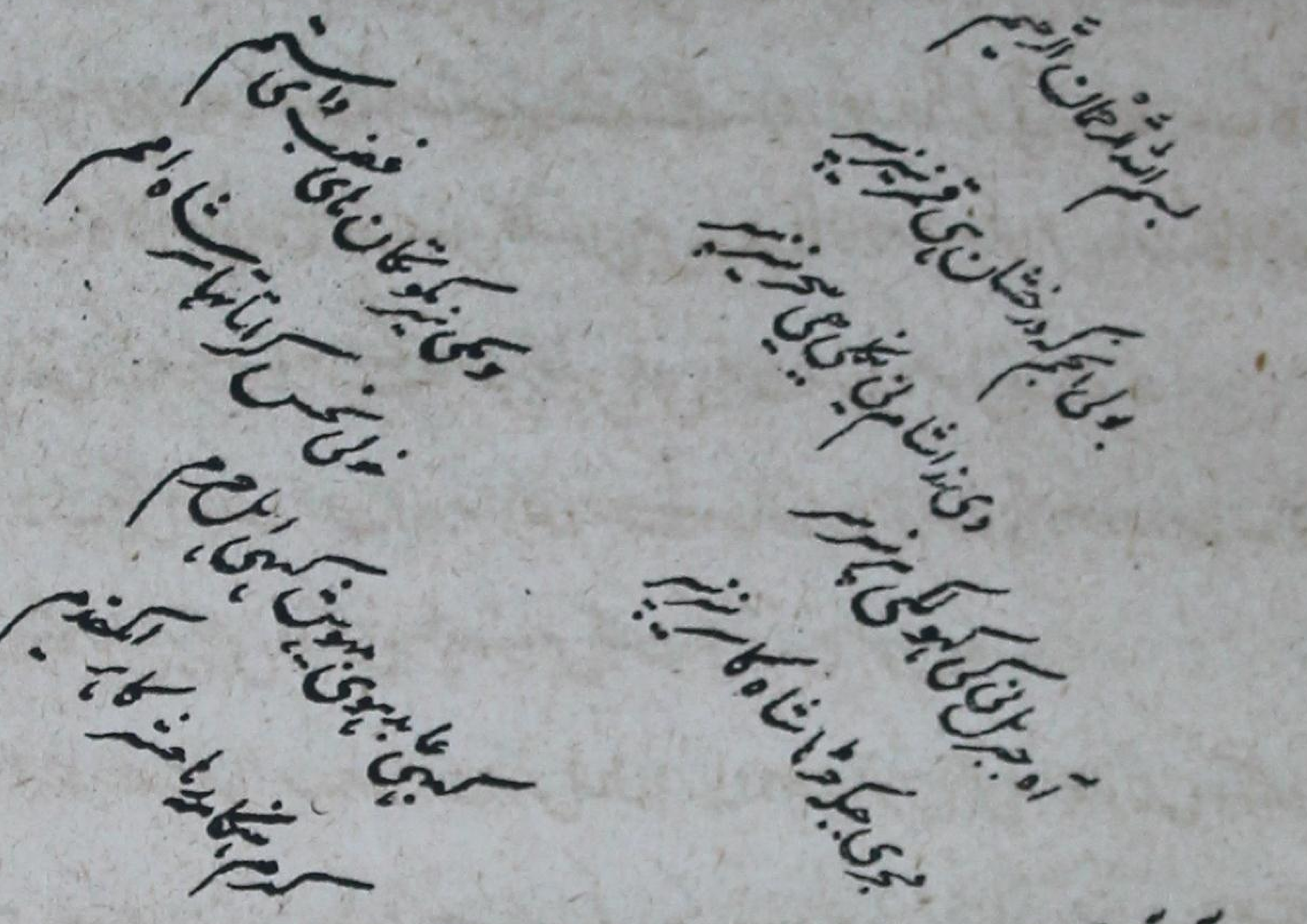
اب مَیں میر صاحب اور مرزا صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد اور جناب ظہیر مرحوم کی پاک رُوحوں پر بھی فاتحہ خیر پڑھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں*

خطّ۔ مرزا صاحب نہایت خوش خط اور باوصف خوش خطی زود نویس تھے۔ چنانچہ ایک مخمس کے چار بند اُن کے دست مبارک کے لکھے ہوئے جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلّہ نے مجھے مرحمت فرمائے۔ مَیں نے اپنے عنایت فرما مولوی نظیر حسین صاحب سخا دہلوی مشنری اسلام و فوٹوگرافر کو دکھائے۔ اُنہوں نے اُس کا فوٹو لیا۔ جو ہدیہ ناظرین کرتا ہوں*

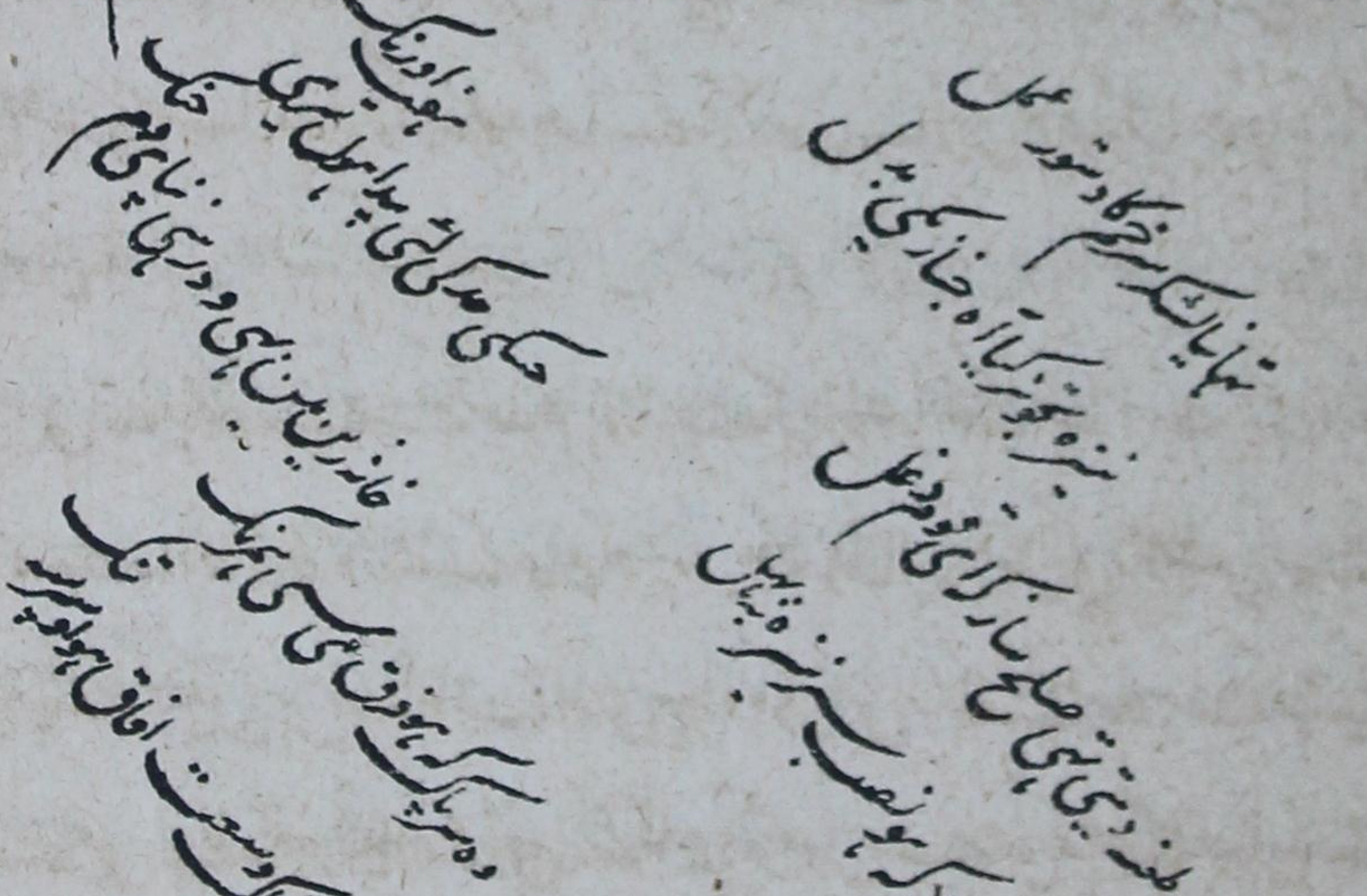
وصل ہے
خط مرزا صاحب مرحوم

اس خط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کا خط بہت پختہ اور روشن و باقاعدہ ہے۔ اور اُس زمانے کے عام آدمیوں خصوصاً ایرانیوں کی روش پر ہے۔ کہ تمام حرفوں پر نقطے نہیں ہیں۔ نہ کاف فارسی پر دو مرکز ہیں۔ بلکہ نقطے وہ بہت کم دیتے ہیں۔ اس سے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اُن کے قلمی مرثیوں سے جن کم علم کاتبوں نے اوّل اوّل نقلیں لی ہونگی بعض لفظوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر تصرّف کیا ہوگا۔ اور یہیں سے تحریف کی ابتدا ہوئی۔ پھر نقل در نقل مرثیوں میں اکثر الفاظ بدلتے گئے۔ یہی سبب ہے۔ کہ اکثر مرثیوں کے الفاظ میں آج ہم بہت اختلاف و فرق پاتے ہیں*

خط قلمی جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر مرحوم کا عکس جو مولوی نظیر حسین صاحب سخا مشنری اسلام فوٹوگرافر نے فوٹو لیا مئی ۱۹۱۲ء میں بمقام ریاست کوٹہ +



آفتاب آیا قیامت کا نظر نیزہ پر — گیا خورشید لی تا شام سفر نیزہ پر



نہ کہ ہو باغ نبوت کا ثمر نیزہ پر — جانہ باقی رہی اوس سر کو مگر نیزہ پر

اصل ورق عطیہ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مؤلف حقیر کے پاس ہے +

نوٹ:- مرزا صاحب کے خط کے فوٹو کا ٹریس منشی محمد اسمٰعیل کاتب ونقاش لاہوری نے چھپنے کے واسطے لیا +

باب چہارم۔ انداز تصنیف

مرزا صاحب اکثر باوضو جانماز پر بیٹھ کر تصنیف فرماتے تھے۔ کبھی کبھی بعد نماز شب اور کبھی بعد نماز صبح اور کھانا کھانے کے بعد گیارہ بجے دن کے کہا کرتے تھے بعض بعض مصرعوں پر ایسا وجد طاری ہوتا تھا۔ کہ جھوما کرتے تھے۔ اور اکثر بین کے مضامین پر مسلسل آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ع موتی کی اک لڑی تھی کہ آنکھوں سے گر گئی[1]۔ اُس عالم وجد و جوش میں کہنے کا اثر اُن کے کلام میں سخن سنجوں کو نظر آتا ہے۔ جب تک طبیعت حاضر نہ ہوتی تھی۔ نہ کہتے تھے۔ اور جب حضور قلب کا عالم ہوتا تھا۔ کہتے تھے۔ اور جلد جلد کہتے تھے۔ جس کی تصدیق آپ کو ذیل کی روایت سے ہو جائیگی۔

جو میرے محسن جناب ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب لندنی بہرسری عالم علوم مشرقی و مغربی سابق ممبر کونسل کورٹ وجے پور نے اپنے خط مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھ کر مجھے بھیجی ہے:۔

"آپ کا خط جس وقت مجھے پہنچا۔ اس وقت میر باقر حسین صاحب بہرسری جو یہاں (جے پور میں) وکالت کرتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے کلام سے بہت انس رکھتے ہیں۔ اور مرثیہ خواں بھی ہیں موجود ہیں۔ مَیں نے آپ کا خط اُن کو سُنایا۔ تو کہنے لگے۔ کہ سنہ ۱۸۷۱ء یا سنہ ۱۸۷۲ء میں میر وزیر حسین صاحب (مؤلف چہل مجلس شبیر وغیرہ) لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ مَیں محرر رجسٹری تھا۔ اُنہیں کے پاس رہتا تھا۔ اُس اثنا میں ایک مجلس میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں ہوئی۔ مرزا صاحب مرحوم نے نیا مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ مقتل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد[2] سا ہجوم کی یہ کیفیت تھی کہ

---

[1] یہ سب باتیں اپنے انا مرحوم اور جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور معمر آدمیوں کی زبان سے سُنی ہوئی ہیں لکھ رہا ہوں جو ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھی تھیں +

[2] جلد دوم دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے +

چھتوں پر لوگ لدے ہوئے تھے۔ اور منڈیروں پر مثل گھوڑے کے سوار تھے۔ اور درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی۔ تو میر وزیر حسین صاحب نے جو مجلس میں موجود تھے مرزا صاحب سے درخواست کی۔ کہ مرثیہ جو ابھی پڑھا ہے مجھکو مرحمت ہو۔ مرزا صاحب نے وعدہ فرمایا۔ کہ بہت اچھا۔ دو تین روز بعد میر وزیر حسین صاحب نے مجھکو مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ تاکہ وعدہ کو یاد دلاؤں۔ میں جس وقت مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ دوپہر یعنی دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مرزا صاحب خاصہ نوش فرما کر پلنگ پر استراحت فرماتے تھے۔ دو کاتب پلنگ کے اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بعد آداب کے میر وزیر حسین صاحب کا پیغام عرض کیا۔ فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ مرثیہ لے جانا۔ میں بیٹھ گیا۔ مرزا صاحب کاتبوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور دونوں کاتبوں کو تصنیف دو مرثیہ لکھوانے لگے۔ کبھی اس کاتب کو دو تین مصرع بتا دیتے تھے کبھی اُس کاتب کو بعض مصرع یا بیت پر اُن کو ایسا جوش آجاتا تھا۔ کہ بیٹھ جاتے تھے۔ چار بجے تک یہی سماں رہا۔ چار بجے نماز (ظہرین) کے واسطے اُٹھے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ہر کاتب نے ساٹھ ساٹھ بند دو مرثیوں کے لکھے ہیں۔ ایک مرثیہ حال حضرت علی اکبرؑ میں اور دوسرا امام حسینؑ کے حال میں تھا۔ میرا بھی جی ایسا لگا۔ کہ چار گھنٹے ایک آن میں ختم ہو گئے۔ نماز سے پیشتر مرزا صاحب نے مرثیہ موعود مجھکو دیدیا۔ اور یہ کہا۔ کہ راتوں رات یا کل تک نقل کر کے دے جانا۔ میں مرثیہ لیکر چلا آیا"۔

ناظرین دیکھئے ایسی آمد آپنے کسی شاعر کی طبیعت میں دیکھی ہے۔ جو چار گھنٹہ میں ایک سو بیس بند کہ ڈالے۔ دوسرا شخص اتنی جلدی نثر بھی تو اس قدر نہیں لکھوا سکتا۔ ع

بحر رواں تھی یا کہ طبیعت دبیر کی۔ اور پھر اُس پر طرّہ یہ کہ کلام اچھا۔ یہ ممکن ہے۔ کہ ہر روز طبیعت میں ایسی روانی نہ ہو۔ مگر پھر بھی جو شخص ہفتہ میں ایک دن ڈیڑھ ڈیڑھ سو بند کہتا ہو۔ اُس کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں پر پہنچ جانا ممکن ہے۔ جبھی تو اکثر واقفان راز فرماتے ہیں۔ کہ یہ بیس جلدیں جو دفتر ماتم کی چھپی ہیں۔ کلام مرزا صاحب کا دسواں

حصہ ہے۔

فصل ۴ حکایت ثانی طبیعت کی روانی

اب ایک دُوسری حکایت مرزا صاحب کی روانی طبیعت کی سن لیجیے۔ میرے کرم فرما جناب میر دستور علی صاحب بلگرامی سابق منصرم چیف سیکرٹری راجہ صاحب جہانگیر آباد جنوری یا فروری ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ فرماتے تھے۔ کہ مَیں ایک روز ماہ رمضان میں والد مرحوم کے ہمراہ صبح کے وقت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ وہ اُس دن داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے یہاں مجلس پڑھنے کو جانیوالے تھے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میر واجد علی صاحب کاتب سے فرما رہے تھے۔ کہ وہ ٹیپ جو مَیں نے پہلے کہی ہے ذرا سُست ہے۔ وہ کاٹ دو۔ اور یہ ٹیپ لکھ دو ؎

تابوت اُٹھانے کی توانائی نہیں ہے ✦ بیٹوں نے علیؑ کے سحری کھائی نہیں ہے

یہ ٹیپ رات کو سوچی ہے۔ مَیں نے دیکھا۔ کہ مرزا صاحب کے پڑھنے کا مرثیہ میر واجد علی کاتب نے کھولا۔ اُس کے ہر صفحہ پر نہایت جلی قلم سے ایک بند لکھا ہُوا تھا پہلے کی ٹیپ اُنہوں نے کاٹ کر بخط جلی یہ ٹیپ مذکورہ لکھ دی۔

مرزا صاحب والد ماجد (میر محمد رضا صاحب بلگرامی) سے باتیں کرنے لگے۔ کہ یکایک ایک صاحب آئے۔ اور بعد معمولی آداب تسلیمات کے اُنہوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ کہ مجھے اس وقت بارہ تیرہ بند اس حال میں کہہ دیجئے۔ کہ بعد شہادت علی اصغرؑ علی اصغرؑ کی ماں قبر علی اصغرؑ پر آئیں۔ کہ مَیں آج ہی اُن پر سوز رکھ کر کل اُن رئیس (نام رئیس کا یاد نہیں رہا) کے یہاں پڑھوں۔ کہ اس حال کا مرثیہ پڑھنے کی اُن رئیس نے مجھ سے فرمائش کی ہے۔ مرزا صاحب بولے۔ جناب اب تو مَیں مجلس میں جا رہا ہوں۔ اس وقت تو معاف فرمائیے۔ اُنہوں نے عرض کی۔ حضور میرے رزق کا معاملہ ہے۔ اگر ایسا مرثیہ نہ پڑھونگا۔ تو شاید مجھے نقصان پہنچ جائے۔ فرمایا تو اچھا۔ لکھتے جائیے۔ کھڑے کھڑے چودہ یا پندرہ بند کہدئے۔ وہ سوز خواں لکھتے گئے۔ اور اُن کے ساتھ ساتھ

میں لکھتا گیا۔ مرزا صاحب نے اپنے پاس اُس کی کوئی نقل نہیں رکھی۔ اس طبیعت حاضر اور زود گوئی پر والد ماجد کو اور مجھ کو سخت تعجب ہوا۔ وہ بند اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ نہ دفتر ماتم میں چھپے ہیں اور نہ مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایسے ایسے سیکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے منتشر یا تلف ہو گئے۔ جن کی نقل مجھے اُن کے گھر میں نہیں رہی +

فصل ۴

اصلاح دینے کا طریقہ ۔ میر فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی (جو غزل میں مرزا غالب و سحر لکھنوی کے اور مرثیہ میں مرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے) اپنے تذکرہ مطبوعہ جلد دوم جلوہ خضر میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شاگرد سے اُس کا کلام سُنتے جاتے تھے۔ اور جس مصرع یا بند پر اصلاح دینا ہوتا تھا۔ تو مرثیہ لیکر اپنے ہاتھ سے بنا دیتے تھے۔ اور اکثر مرثئے تو خود دیکھ دیکھ کر بناتے تھے[1]۔ اور میں نے اُن کے اور شاگردوں سے سُنا ہے۔ کہ جو لفظ کاٹتے یا بناتے تھے۔ اُس کی وجہ اگر وہ شاگرد حاضر ہوتا تھا۔ تو زبانی بتا دیتے تھے۔ ورنہ حاشیہ پر بطور اشارہ لکھ دیتے تھے۔ ایسے لفظ رکھ دیتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا ساده کار نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا +

حکایت

میر واجد حسین مرحوم جو اخیر کو نثر پڑھنے لگے تھے۔ مجھ سے بمقام آگرہ ۱۸۸۱ء میں ناقل تھے۔ کہ ایک مرثیہ کسی شاگرد کا کہا ہوا[2] مجھے مرزا صاحب نے دیا۔ کہ اس کو صاف کر دو۔ حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ تھا۔ اُس موقع پر کہ جب حضرت عباسؑ خیمے سے باہر برآمد ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب نے اصلاحاً یہ ٹیپ لکھی تھی ؎

شاگرد کرنے کا طریقہ

[1] اور جس وقت کوئی شاگرد ہوتا تھا تو وہ کچھ شیرینی لاتا تھا جس پر باب مدینۂ علم جناب امیرؑ کی نذر دیکر اس شاگرد کو اور تمام شاگردوں اور خاص خاص دوستوں کو تقسیم فرما دیتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ میر واجد حسین پہلے مرثیہ پڑھتے تھے مرزا صاحب کے شاگرد تھے پھر نثر پڑھتے تھے۔ میر فدا علی صاحب فدا مشہور اُستاد نثار کے شاگرد تھے۔ اکثر عشرہ محرم میں گوالیار جا کر پڑھتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے

اقبالؔ سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے

مجھے جو شرارت سوجھی۔ تو مَیں نے دُوسرا مصرع یُوں لکھ دیا۔ ہاں فتح سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے۔ مَیں گردن جُھکائے ہوئے لکھ رہا تھا۔ کہ مرزا صاحب آہستہ آہستہ آکر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مجھے خبر نہ ہوئی۔ اس ٹیپ کو پڑھ کر ہنسے۔ اور فرمایا واہ میر واجد حسین صاحب آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دیدی۔ اب مَیں نے گردن اُٹھائی۔ دیکھا کہ مرزا صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ مَیں چُپ۔ فرمایا کیا اقبال سے آپ فتح کو اس موقع پر ترجیح دیتے ہیں۔ مَیں نے عرض کی۔ جی نہیں۔ اس وقت میرے خیال میں یوُنہیں آگیا۔ مَیں اب اس کو مٹائے دیتا ہوں۔ کپڑا پانی میں ڈوبا ہوا سامنے رکھا تھا مَیں نے اُٹھایا۔ فرمایا ذرا ٹھیرو۔ سمجھ تو لو۔ لفظ فتح میں کیا بُرائی اور اقبال میں کیا خوبی ہے۔ مَیں نے کہا فرمایئے۔ فرمایا۔ اُقبال اُردو میں مذکر اور فتح مؤنث ہے۔ پس جب شاعر اچھے شگون کے خیال سے یہ کہتا ہے۔ کہ عورت نہ کوئی سامنے آئے۔ تو فتح کا جو مؤنث ہے سامنے آنا کب مناسب ہوگا۔ اس کے سوا اقبال کے لفظی معنے پر غور کرو۔ اقبال کے خود معنے آگے آنے کے ہیں۔ لفظ فتح میں یہ بات کہاں"۔ مَیں نے عرض کی "درست ہے"۔ فرمایا "اکثر بزرگوار (ذاکر) از بسکہ میرے مرثیوں میں الفاظ کی خوبی اور اثر کو نہیں سمجھتے۔ اپنی سمجھ کے موافق الفاظ بدل دیتے ہیں۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے مصنف نے یوُ ہیں کہا ہوگا۔ وہ اعتراض کرتا ہے۔ اُس کو کیا خبر کہ دبیر کے اصلاح دینے والے

مویؔ اس مرثیہ میں ٹیپ ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع ہمراہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ یہ مرثیہ نظیر برادر دبیر مرحوم کی تصنیف ہے اور دبیر مرحوم کا اصلاحی ہے۔ نولکشور کے مطبع میں جلد اول میں یہ مرثیہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ غلطی ہے۔ پورا بند یہ ہے! غازی نے جو پردہ در دولت کا اٹھایا۔[۱] اصطبل سے دوڑا ہوا ہمکا اجل آیا۔[۲] رہوار کو چمکار تا دروازے پہ لایا۔[۳] اور شور نقیبان ادب نے یہ مچایا[۴]

آپ آتے ہیں عورت کوئی سامنے آئے[۵] اقبال سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے[۶] ٹیپ مرزا صاحب نے اصلاحاً کہی تھی ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۲۴۲ نولکشور پریس مرثیہ ہائے دبیر مرحوم

بے انتہا ہیں"*

مَیں عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت اکثر ذاکروں نے مرزا صاحب کے الفاظ اپنی سمجھ کے موافق بدل دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قلمی مرثیوں میں بیحد اختلاف ہیں۔ اور چھاپہ میں جو کاپی لکھنے والے یا مصلح سنگ نے اصلاح دی ہے۔ وہ مزید بر آں۔ اس لئے بعض لفظ کو گھنٹوں بعض کو منٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے کیا کہا ہوگا۔ ایسی حالت میں بعض ناواقف معترضوں کا یہ کہدینا کہ ہر جگہ چھاپہ کی غلطی کا عذر نہیں چل سکتا کس قدر ظلم کی بات ہے۔ میر علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ والبقاہ (یادگار خاندان میر انیس مرحوم) ایک روز برسبیل تذکرہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ آپ دیکھئے۔ قرآن شریف مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اُس کی صحت کا کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اہل ہنود صاحبوں کے مطبعوں میں عموماً کاتب قرآن مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جو صحت کو اپنا ایمان سمجھ کر بہت کوشش کرتے ہونگے۔ کہ یہ کلام اللہ صحیح چھپے۔ مگر پھر بھی ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ پھر کلام دبیر و انیس (علیہما الرحمہ) پر معترض کا اعتراض کرنا اور یہ بتانے پر کہ اُن مرحوم نے یُوں نہیں یُوں کہا تھا۔ یہ جواب دینا کہ چھاپہ کی غلطی کا عُذر ہر جگہ نہیں چل سکتا کس قدر نامناسب اور سینہ زوری ہے۔ خدا ایسے معترضوں کو ہدایت نیک دے*

فصل ۵ پڑھنے کا انداز*

پڑھنے کا انداز۔ جوش معرفت میں سینہ کے زور سے پڑھتے تھے۔ اور مجلس میں جب کبھی پڑھنے کو جاتے تھے وضو کر کے جاتے تھے۔ اکثر با وضو مرثیہ پڑھتے تھے۔ آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ فطرتی طور پر کہیں خود بخود ہاتھ اُٹھ جاتا تھا تو اُٹھ جاتا تھا۔ ورنہ منبر پر بیٹھ کر بتلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے۔ آنکھ اور ابرو کا اشارہ بھی اُسی قدر ہوتا تھا۔ جتنا باتوں میں ہوتا تھا[۱]۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ ارتھ موسیقی میں داخل ہیں۔ مگر

[۱] اس موقع پر میرے مکرم جناب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے وہ بات فرما دی ہے جو اس فن کی اصل اصول (یورپ میں) سمجھی جاتی ہے۔ حقیقتاً اُسی قدر بتانے کو اس فن کے عالم اچھا سمجھتے ہیں۔ جتنا آدمی باتوں میں بتاتا ہے زیادہ بتائیگا تو وہاں بھی عیب سمجھا جائیگا۔ میں کہتا ہوں۔ اس میں کبھی باہم آدمیوں کی عادتوں میں اختلاف و فرق ہے۔ کوئی باتیں کرنے

سوزخوانی میں بھی بتانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ پس مرثیہ خوانی سے بتانے کو کیا علاقہ ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اس مضمون کو وہ کہہ بھی گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:-

ناحق کا نہ چیخنا نہ چلانا ہے + بیکار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ابنِ شہِ مرداں کا ثناخواں ہوں میں + صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے

اُنہوں نے کبھی کسی اپنے شاگرد کو اپنے پڑھنے کا طرز نہیں سکھایا۔ نہ کسی شاگرد کو بجز ایک شخص آغا حیدر[1] مرحوم کے اُن کا طرز آیا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے میں ایسا وقار تھا۔ کہ سُننے والا ہمہ تن گوش اور محوِ حیرت ہو جاتا تھا۔ اور پھر تعریف کرنے پر آمادہ بلکہ مجبور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میر محمد شاہ صاحب مرحوم حدیث خواں مجھ سے بیان فرماتے تھے۔ کہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ (چوک لکھنؤ) میں ایک مرتبہ مرزا صاحب مرحوم مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بڑا مجمع تھا۔ میں منبر سے دور اندر کے درجہ میں تھا۔ میرے پاس ایک نواب زادے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو میر انیس صاحب سے بہت حسن عقیدت رکھتے تھے۔ اور ایسے پکے انیسئے تھے۔ کہ مرزا صاحب کی تعریف کرنا گویا گناہ اخلاقی سمجھتے تھے۔ بعض مصرع سُن سُن کر تعریف کے بدلے مجھ سے چپکے چپکے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھئے اس موقع کو میر صاحب کہتے تو یوں نہ کہتے۔ میں اُن کو منع کرتا تھا۔ کہ حضرت (حضرت) کیا کسی دبیرئے سے لڑوائیگا۔ اگر آپ کو کلام پسند نہیں۔ تو خیر چپکے سُنا کیجے۔ اب وہ میرے تین چار بار کے کہنے سے چپ ہو گئے۔ اور دیر تک چپ چاپ

(بقیہ نوٹ نمبر۱) میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ کوئی کم بتلاتا ہے کوئی زیادہ۔ آخر مجبور ہو کر یہی عقل سلیم فیصلہ کرتی ہے۔ کہ متوسط درجہ اچھا ہے۔ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرو۔ ۱۲ مؤلف۔

[1] آغا حیدر مرحوم مرزا صاحب کے شاگرد رشید آغا حسن انس مرحوم کے بڑے بھائی تھے سُنا ہے کہ اُنکی آواز ہو بہو مرزا صاحب سے مشابہ تھی اور اُسی طرز سے پڑھتے بھی تھے اور خود بھی کہتے تھے۔ اور آغا حسن انس مرحوم میر احسن صاحب مؤلف واقعات انیس کے نانا تھے ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ مرحوم زیادہ تر میر صاحب کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ اور اکثر میر چھبر تنکر مرزا صاحب کے کلام پر مزاحاً اعتراض کرتے تھے جس کے جواب میں اور سید مرتضیٰ صاحب ان کے ہاں نچے کلام مرزا صاحب پر اعتراض کیا کرتے تھے ع عجب ہنسی تھی تعصب عجب وقت تھا۔ ۱۲ مؤلف۔

سُنا گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب پڑھتے پڑھتے اس موقع پر پہنچے:۔

ناگاہ آئے شمر و عمر رُو برُوئے شاہ — بولے سپاہ کیا ہوئی؟ اے شاہ کم سپاہ
کیوں؟ ہم ہوئے تباہ کہ اب تم ہوئے تباہ — اس لشکرِ قلیل پہ۔ یہ تھا غرور۔ واہ

ہرگز نہ بندگانِ خلیفہ سے ڈرتے تھے
اس فوج کے بھروسے پہ بیعت نہ کرتے تھے

شہ نے کہا نہ تم میں ہے انصاف نے حیا — یہ فوج۔ کیسی فوج۔ کہ جرّار۔ باوفا
اس بیکسی میں بھی ہے۔ وُہی حوصلہ مرا — بندہ جائیں ہات بیووں کے یا سر ہوں بے ردا

واللہ ہات دُونگا نہ۔ فاسق کے ہات میں
سر جائے گا۔ پہ فرق نہ آئیگا بات میں*

ظالم پکارے سر نہ کٹاؤ تو کیا کرو — اب اختیار کیا ہے جو قصدِ دغا کرو
بیعت کرو حسنؑ کی طرح تو بجا کرو — تیغِ بنی امیہ غضب ہے۔ ڈرا کرو

ہاشم کے خاندان میں تو سب ولی ہوئے
لشکر شکن ہوئے تو فقط اک علیؑ ہوئے

شہ بولے تم سمجھتے ہو ناچار ہے حسینؑ — مختار و سبطِ احمدِؐ مختار ہے حسینؑ
کرار و ابنِ حیدرِ کرار ہے حسینؑ — قہر و جلالِ قادر و قہار ہے حسینؑ

---

* اس مرثیہ کے یہ بند ہیں۔ جس کا مطلع یہ ہے ”پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی“۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد ہشتم میں چھپ چکا ہے۔ دیکھئے۔ یزید کے لشکریوں کے جیسے خیالات تھے ویسے ہی مضامین اُنکی حرف سے ادا کئے۔ وہ یزید کو خلیفۂ رسول اور اُس کی بیعت کو ایک فرض سمجھتے تھے۔ اسی اُن کے خیال بجس کو اُنہیں کے الفاظ میں ادا کر دیا۔ امام حسین علیہ السلام جس آن بان سے حق پر مرتے دم تک قائم رہکر بیعت سے انکار کرتے رہے۔ اُس کو حضرتؑ کے جواب میں دکھایا۔ مقتضائے حال کے موافق یہ کلام ہے۔ اور پھر کس قدر مختصر لفظوں میں یہ عین شانِ بلاغت کی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اچھا۔ بھلا۔ کھڑے تو رہو۔ تم۔ میں آتا ہوں

اک فاقہ کش* کے دُودھ کی طاقت دکھاتا ہوں

تصویر جنگ۔ لفظوں میں

شہ اک قدم بڑھے تھے کہ وہ دونوں ہٹ گئے
اُلٹی جو آستین دو عالم اُلٹ گئے

رکھا جو ہات قبضے پہ دل سب کے پھٹ گئے
ہر سمت پیک دوڑے کہ طالع پلٹ گئے

بے پیرو۔ بھاگو۔ تم کو قسم اپنے پیر کی

کھنچتی ہے ذوالفقار جناب امیرؑ کی

اُوپر کے چار مسلسل بند اور پانچویں بند کے چاروں مصرع تو وہ چپ چاپ سُنا گئے۔ مگر جب پانچویں بند کی ٹیپ مرزا صاحب نے جوش میں آکر زوردار آواز سے پڑھی تو بیتاب ہو کر چلّائے۔ اے سبحان اللہ۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جواب نہیں۔ میں آہستہ سے بولا۔ ہائیں یہ کیا؟ آپ تو تعریف کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کہا۔ میر صاحب۔ واللہ دل بے قابو ہو گیا۔ حقیقت میں میر صاحب اپنی طرز کے بادشاہ ہیں۔ یہ اپنے رنگ میں کامل و یکتا ہیں۔ بس بات وہی ہے۔ جو میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اُن کے کم بتلانیکے سبب سے حاضرین اپنی پوری توجہ سے مخاطب رہتے تھے۔ اور سُنتے سُنتے محو حیرت ہو جاتے تھے۔ اور تمام واقعات کی تصویر خود اُن کا کلام کھینچ دیتا تھا۔ اسی طرح میر دستور علی صاحب بلگرامی منصرم حجی و سیکرٹری جناب راجہ تصدق رسول صاحب راجہ جہانگیر آباد سلمہ اللہ والقاہ مجھ سے ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ ناقل تھے۔ کہ میں اپنے والد ماجد میر محمد رضا صاحب

مرزا صاحب کے پڑھنے کی نسبت دوسری حکایت

*یہاں پر فاقہ کش کے لفظ مصنف لائے ہیں۔ یہی وہ کنایہ و اشارے ہیں۔ جو کلام دبیر میں حج اہرات سمجھے جاتے ہیں۔ اگر اس موقع پر بنت نبی یا اور کوئی شاندار لفظ لاتے تو ہرگز سامعین و ناظرین کے دلوں پر یہ اثر نہ ہوتا۔ یہی چیزیں مرثیہ کی جان ہیں۔ جناب سیّدہ کی فاقہ کشی ہر لئے باعث افتخار ہے کہ وہ دُوسروں کو اپنا کھانا کھلا کر خود بھوکی رہتی تھیں جسکو ایثار کہتے ہیں۔ یہ سخاوت کی اعلیٰ قسم ہے پس یہ کنایہ ہیچ ہے۔ کہ فاقہ کش کی لفظ سُنتے ہی ذہن اُن کے ایثار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

بلگرامی (رضا تخلص) مرحوم کے ساتھ غالباً ۱۸۷۲ء میں (جن دنوں کیننگ کالج میں پڑھتا تھا) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے امام باڑہ (واقعہ گولا گنج لکھنؤ) کی مجلس میں پہنچا۔ میری عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس قدر وہاں مجمع ہو گیا تھا۔ کہ صدر پھاٹک کے سامنے جو دیوار پردہ کی تھی۔ اُس کو تڑوا دیا گیا تھا۔ پھر بھی ایک آدمی سے ملا ہُوا دُوسرا آدمی بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی*۔ وہ مرثیہ سُن کر والد ماجد تعجب سے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھو بعض ناواقف کہتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب سلیس نظم نہیں کہتے۔ صرف مضمون آفرینی طبیعت میں ہے۔ دقیق نظم ہی کہتے ہیں۔ اس مرثیہ میں دیکھو۔ کس قدر زبان میں سلاست اور بندش میں صفائی ہے۔ اور واقعات کی تصویریں دیکھو کس عمدگی سے کھنچی ہیں۔ یہ بھی خیال کرو۔ کہ ان کا پڑھنا کس قدر دلوں پر مُوثر ہے۔ کہ تمام مجلس تصویر بنی ہوئی ہمہ تن گوش ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب اس موقع پر پہنچے۔ کہ حضرت زینبؑ اپنے بچوں پر خفا ہو رہی ہیں۔ کہ تم نے شمر سے بات کیوں کی۔ اُس موقع پر یہ ایک مصرع مرزا صاحب تین طرح سے پڑھے۔ ع کیوں تم نے میرے بھائیؑ کے قاتل سے بات کی۔ ہر مرتبہ مصرع کے ایک نئے معنی سامعین کے ذہن میں آئے۔ (۱) گھُرکی کے لہجہ میں۔ کیوں۔ تم نے میرے بھائیؑ کے قاتل سے بات کی؟ (۲) استفہامیہ طور پر۔ کیوں؟ تم نے میرے بھائیؑ کے قاتل سے بات کی؟ (۳) تاسف و حسرت کے لہجہ میں۔ کیوں! تم نے میرے بھائیؑ کے قاتل سے بات کی! اس قدر اس مصرع پر رقّت ہوئی۔ کہ مرثیہ آگے نہ پڑھ سکے۔ والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا۔ اب کہو۔ مرزا صاحب سے بہتر کوئی شخص کلام کو ادا کر سکتا ہے۔ ایک ہی مصرع کو تین طرح پڑھ کر تین معنی پیدا کر دئے۔ یہ محض پڑھنے کی خوبی ہے یا نہیں۔ مَیں نے کہا بیشک کمال ہے۔ خاص کر بین کے مقامات پڑھنے

*۔ جلد اوّل دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہیں مرزا صاحب کو جو کمال حاصل تھا۔ شاید وہ کسی دوسرے ذاکر کو ہو۔ جناب استاذ مکرم (مرزا اوج صاحب قبلہ) فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ بنارس میں ایک ایرانی سوداگر نے مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلس کی تھی کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اوّل پیش خوانی میں میں نے پڑھا مجلس بالکل ٹھس تھی۔ اکثر آدمی صورت دیکھتے ہیں۔ نہ آہ ہے نہ واہ مجھے سخت تعجب ہوا۔ کہ بظاہر ان میں اکثر پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں۔ یہ بات کیا ہے۔ میرے بعد جناب مرزا (دبیر) صاحب منبر پر گئے۔ اور خوب جی لگا کر یہی مرثیہ (پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی) الخ اخیر اس مطلع سے پڑھا ”جوشن ہیں دو۔ پر ایک صغیر اک کبیر ہے“ مگر مجلس گم صُم۔ میں حیرت میں یا اللہ یہ بات ہی کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے لڑائی ختم کی۔ اب بین کے موقع پر جب وہ پہنچے۔ تو فرمایا۔ اس کا سبب۔ میں سمجھ گیا۔ کہ آپ لوگ کیوں متاثر نہیں ہوتے۔ خیر اب آپ یہ چند بند بین کے بھی سُن لیجے۔ اور آپ کو قسم ہے اگر آپ روئے۔ اور مجھے یہ قسم ہے کہ میں آپ کو رُلاؤں۔ یہ کہکر جو بین پڑھنا شروع کیا۔ تو ایک کہرام برپا تھا۔ سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے پیٹتے پیٹتے غش آگیا۔ بعد ختم مجلس کچھ آدمیوں نے مرزا صاحب سے آکر عفو تقصیر چاہی۔ اور صاف اقرار کیا۔ کہ ہم میں آپس میں یہ عہد ہو چکا تھا۔ کہ کیسا ہی اچھا کلام کیوں نہ ہو۔ ہم نہ تعریف کرینگے۔ اور نہ روئینگے۔ ہمارے دل آپ کی نظم کے مزے اُٹھا رہے تھے۔ اور لب گویا سِئے ہوئے تھے۔ جب آپ نے بین کے بند پڑھے۔ دل بے قابو ہو گئے اوّل آہستہ آہستہ اور پھر مجبوراً باواز بلند ہم روئے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ع میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا۔ مگر انیسیت اور دبیریت کا ایسا خیال ایمان کا بگاڑنے والا ہے۔ آئندہ کیلئے آپ خدا سے توبہ کیجئے۔ اور کبھی کسی ذاکر کے پڑھنے میں ایسا تعصب نہ کیجئیگا۔[۱]

[۱] یہ لوگ پکّے انیسئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس صاحب کو بھی کبھی ایسا موقع پیش آیا تھا چنانچہ وہ اسکی شکایت

فصل ۶ قوت حافظہ

قوت حافظہ۔ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ ایک دن دیوان خانہ میں دس یا
نو بجے صبح کے میں پہنچا۔ مولوی کمال الدین[1] صاحب مرحوم بھائی مرزا محمد جعفر (اوج
مد ظلہ) کو پڑھا رہے تھے۔ وہ مشکل مقام تھا۔ شاید حکمت کا کوئی دقیق مسئلہ تھا۔ مرزا
صاحب نے مولوی صاحب ممدوح سے کہا۔ کہ حضت (حضرت) ہمکو تو ہمارے اُستاد
نے یوں سمجھایا تھا۔ بڑی دیر تک مولوی کمال الدین صاحب سے بحث ہوئی۔ مرزا
صاحب نے مرزا محمد جعفر سے فرمایا۔ کہ ذرا اندر جاکر ہماری کتابوں میں سے یہ کتاب اُٹھا
لاؤ۔ جس میں ہم نے پڑھا تھا۔ جب تک وہ کتاب لائیں لائیں۔ مرزا صاحب کے
قول کو مولانا کمال الدین نے قبول فرمالیا تھا۔ مولوی کمال الدین صاحب نے وہ کتاب
لی۔ اور وہ مقام نکالا۔ تو حاشیہ پر بالکل وہی مضامین لکھے ہوئے تھے۔ جو مرزا صاحب
نے بیان فرمائے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ مرزا صاحب کیا آپ نے زمانہ قریب میں اس
کتاب میں یہ بحث دیکھی تھی؟ فرمایا۔ نہیں جب پڑھا تھا جبھی کا یہ مضمون یاد
تھا۔ مولوی کمال الدین مرحوم اور میں اس حافظہ پر تعجب کرتے تھے۔ کہ اس یاد کا کیا
ٹھکانہ ہے۔ ۴۰ سال بعد وہی یاد رہا ہے۔ جو پڑھا تھا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ
افسوس جابجا سے یہ کتاب دیمک کھا گئی۔ اور بہت سے حاشیہ ضائع ہو گئے۔ ورنہ یہ
کتاب محمد جعفر کے بہت کام آتی۔ میں نے اکثر موقع پر حاشیہ لکھے تھے۔ یہ بھی نانا مرحوم

قوت حافظہ کی دوسری حکایت

(بقیہ نوٹ نمبر۱) ایک مرثیہ میں یوں نظم کر گئے ہیں ؎ خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں۔ اشکوں کے ٹپک پڑنے سے
مجبور ہوئے ہیں۔ خدا ایسے طرفداروں کو توفیق دے۔ کہ وہ کلام کی خوبی طرفداری و تعصب کی عینک اُتار کر دیکھا کریں۔ ۱۲۔ مؤلف

ف۱ مولوی کمال الدین مرحوم لکھنؤ کے چوٹی کے عالموں میں سے ایک عالم تھے مفتی میر عباس صاحب اور وہ ساتھ ساتھ
سید العلما اور سلطان العلما سے پڑھے تھے۔ ان دونو صاحبوں میں مدت مدید تک مباحثہ اور مناظرہ ہوا کیا ہے جبکہ لکھنؤ کے
بڈھے بڈھے اہل علم بیان کیا کرتے ہیں سلطان العلما اعلی اللہ مقامہ نے پھر وہ مباحثہ موقوف کرا دیا۔ لکھنؤ کے اکثر مجتہدین اور علما
ان دونوں صاحبوں کے پڑھائے ہوئے تھے۔ اور آج بھی بالواسطہ ان کے کئی شاگرد مجتہد ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بیان فرماتے تھے۔ کہ مرزا صاحب سے منشی دلگیر مرحوم کو بہت محبت تھی۔ اور وہ بہت قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں جو شاید میر علی صاحب سوزخواں ہی کے امام باڑہ میں تھی۔ میر صاحب موصوف نے سوز میں منشی دلگیر مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا۔ سامعین میں مرزا صاحب بھی تھے۔ شام کو حسبِ معمول مرزا صاحب کے مکان پر مجمع ہوا۔ ایک صاحب حاضرین میں سے بولے۔ کہ میر علی صاحب نے آج جو مرثیہ پڑھا بے مثل تھا۔ مرزا صاحب نے بھی تعریف کی۔ کہ درحقیقت ایک ایک مصرع موتیوں میں تولنے کے قابل تھا۔ وہ صاحب بولے۔ بڑی مشکل یہ ہے۔ کہ اب جب تک میر علی صاحب اس کو نہ تقسیم کر دیں جناب منشی دلگیر کسی کو نہ دینگے۔ (یہی منشی دلگیر مرحوم کا قاعدہ تھا) اور میرا دل اس مرثیہ کو چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ مرثیہ کے کل پندرہ سولہ بند تھے۔ اگر کسی کی قوت حافظ اچھی ہو۔ تو وہ ایک۔ دو حد تین مرتبہ غور سے سُنکر یاد کر سکتا ہے۔ میر علی صاحب ابھی تو کئی مرتبہ پڑھینگے۔ اُنہوں نے کہا حضت (حضرت) یہ ممکن نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا ذرا آپ لکھئے تو سہی۔ اب جو وہ لکھنے بیٹھے۔ تو مرزا صاحب نے ایک ایک بند کر کے وہ سب بند لکھوا دئے۔ اُنہوں نے مرثیہ لیکر بجائے شکریہ ادا کرنے کے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ حضت (حضرت) لوگ کہا کرتے ہیں کہ منشی دلگیر اور آپ مل کر مرثیہ کہا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ استغفر اللہ۔ جھوٹے ہیں۔ جو ایسا کہتے ہیں۔ بھلا جناب دلگیر ایسے مشاق کو مجھ سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مرثیہ مجھے دیجئے۔ اُنہوں نے مرثیہ دیدیا۔ مرزا صاحب نے وضو کے لوٹے میں جو پاس رکھا ہوا تھا اُس مرثیہ کو ڈبو دیا۔ اُنہوں نے کہا۔ ہائیں قبلہ یہ آپنے کیا کیا۔ فرمایا۔ آپ مجھے بدنام کرتے۔ اور جا بجا کہتے پھرتے۔ کہ دبیر نے منشی دلگیر صاحب کا مرثیہ مجھے زبانی لکھوا دیا۔ وہ جناب دلگیر کو مدد دیتا ہے۔ جناب دلگیر کو خبر ہوتی۔ اُن کو صدمہ ہوتا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ کہ میں اُن کا دل دکھاؤں۔ اور ایک کامل فن کی

تنقیص کی شہرت کا باعث ہوں۔

فوت حافظ کی تیسری حکایت مرزا احمد مرحوم ظہور تخلص کی زبانی

مرزا احمد صاحب ظہور تخلص جن کا انتقال زمانہ قریب میں ابھی تین برس ہوئے جب ہوا ہے مجھ سے ناقل تھے۔ کہ ایک دن میر صفدر علی صفدر مرحوم میری موجودگی میں اپنا کہا ہوا مرثیہ سُناتے جاتے تھے۔ اور مرزا مرحوم سُن سُن کر جا بجا اصلاح دیتے جاتے تھے۔ کہ اُنھوں نے ایک مقام پر تلوار کی تعریف میں یہ ٹیپ پڑھی ؂

سدِ سکندری کو تپ لرزہ آتی تھی ✦ دیوار قہقہہ بھی کھڑی تھرتھراتی تھی

فرمایا۔ اس کو یوں بناؤ ؂

سدِ سکندری پہ جو بھڑکی گھُلا دیا ✦ دیوار قہقہہ پہ جو کڑکی رُلا دیا

میر صفدر علی مرحوم نے وہ اپنی کہی ہوئی ٹیپ کاٹ دی۔ اور یہ ٹیپ لکھ دی۔ مجھے اُن کی ٹیپ بھی یاد ہو گئی تھی۔ گھر آکر لکھ لی۔ بتیس پچیس ۲۵ برس کے بعد ایک اپنے مرثیہ میں وہی میر صفدر علی مرحوم کی ٹیپ (نظری) میں نے لکھ دی۔ وہ مرثیہ جب میں نے مرزا صاحب مرحوم کو سُنایا۔ تو وہ اس ٹیپ کو سُن کر کچھ سوچنے لگے۔ اور پھر فرمایا۔ یہ ٹیپ تو میں نے کبھی سُنی ہے۔ نہ معلوم کس نے پڑھی تھی۔ اور میں نے اس کو کٹوا دیا تھا۔ مجھے اُن کے اس حافظہ پر سخت تعجب ہوا۔ اور پھر میں نے صاف حال بیان کیا۔ کہ یہ ٹیپ میر صفدر علی نے کہی تھی۔ اور آپ نے اسکو کاٹ کر یہ ٹیپ بنائی تھی۔ مجھے اُن کی ٹیپ پسند آئی۔ میں نے لکھ لی تھی۔ وہی ٹیپ میں نے اپنے اس مرثیہ میں لکھی ہے۔ فرمایا اسے کاٹ دو۔ اور پھر کہو۔

فصل ، پابندی اوقات

پابندی اوقات۔ مرزا صاحب کے اوقات مقرر تھے۔ سرِ شام سے ۹ بجے تک وہ نماز مغربین اور تعقیبات سے فارغ ہوتے تھے۔ پھر بارہ بجے رات تک احباب اور شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بڑے بڑے شاہزادے اور نواب اور حکام در دولت پر حاضر ہوتے تھے۔ علمی چرچے رہتے تھے۔ مگر اُن کی صحبت میں جب کوئی کسی کی غیبت کرتا تھا۔ تو اس کو فوراً روک دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی کے شعر پر اعتراض کرتا

تھا۔ تو وہ اس کو ایک علمی بات سمجھ کر اپنے کسی شاگرد سے فرماتے تھے۔ کہ اس کا جواب دو۔ وہ جواب دیتا تھا تو خود سُنا کرتے تھے۔ ورنہ خود جواب دیتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ جناب میر انیس صاحب مرحوم کی تنقیص[1] کرے۔ میر صاحب سے اُن کو دلی محبت تھی۔ اور وہ اُن کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ حقیقت میں سچ کہتے ہیں۔ اِنَّ اَھْلَ الْفَضْلِ یَعْرِفُ اَفْضَلَہٗ[2] کامل ہی کامل کی قدر سمجھتا ہے۔ (بقول مصنف حقیر) سہ

سخنور جانتے ہیں واقعی قدر سخنور کو ✤ پرکھ لیتے ہیں مثلِ جوہری ہم اہلِ جوہر کو

آدھی رات کو جب یہ مجمع برخاست ہوتا تھا۔ تو پھر مرزا صاحب نماز شب میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ٹھیک حال نہیں معلوم کہ رات میں کس وقت سے کس وقت تک سوتے تھے۔ نماز صبح کا سلسلہ دو گھڑی دن چڑھے ختم ہوتا تھا۔ پھر کھانا کھاتے تھے۔ دوپہر کو اکثر اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ اور کبھی خود بھی وہ اسی وقت کہ لیتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں یہ اس کثرت سے تصنیف فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے۔ کہ وہ مداحی اہل بیتؑ کو بھی عبادت خدا سمجھتے تھے۔ اکثر تعقیبات کے وقت بھی مناقب و مصائب اہلبیتؑ کہتے تھے۔

---

[1] یہی حال جناب میر انیس مرحوم کی محبت کا جناب مرزا صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں مختلف لوگ کہتے تھے اور خصوصاً سید سجاد حسین صاحب رئیس سہیرہ سادات ضلع مظفر نگر مشہور مناظر و مصنف کتب مناظرہ نے بمقام پنڈراول ۱ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ ہجری کو مجھ سے بیان فرمایا۔ کہ بارہ تیرہ برس ہوئے جب کہ اول ضلع مظفر نگر میں جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم میر عنایت حسین صاحب کے یہاں مرثیہ پڑھنے کو تشریف لائے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں خود میں نے ان سے پوچھا کہ جیسے میر صاحب و مرزا صاحب کی نسبت باہم اختلاف لوگوں میں ہے۔ کیا ان دونوں صاحبوں میں بھی کوئی اختلاف تھا۔ یا ایک دوسرے کو کسی دوسری نظر سے دیکھتا تھا۔ تو جواب میں فرمایا کہ میر (انیس) صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص صراحتاً یا اشارتاً کسی قسم کی تنقیص جناب مرزا دبیر مغفور کی کر سکے۔ اور ایسا ہی حال جناب مرزا صاحب مغفور کا تھا۔ اُن کے یہاں بھی کوئی شخص کوئی کلمہ نامناسب کسی طرح پر میر صاحب کی نسبت نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک صاحب کو دوسرے صاحب سے بہت محبت تھی اور قدر کرتے تھے اور ایک صاحب دوسرے صاحب کی نسبت فرماتے تھے کہ ایسا صاحب کمال شاید پھر پیدا ہو ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یعنی تحقیق کہ اہل فضل اہل فضل کو پہچانتے ہیں ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۸ مہمان نوازی

مہمان نوازی بھی مرزا صاحب کی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اکثر باہر کے اہل کمال ان کے در دولت پر ٹھیرتے تھے۔ اور مہینوں رہتے تھے۔ مرزا صاحب مہمانوں کے گویا مشتاق رہتے تھے۔ اور آنکھیں بچھاتے تھے۔ جناب سید الطاف حسین عزت نواب ... ہمشیرزادہ نواب دولہ مرحوم رئیس شمس آباد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اس صفت میں وہ ایسے سرگرم تھے۔ کہ میری دانست میں کوئی مہمانی حیثیت سے بے کھانا کھائے یا بے حصول مقصود ان کے دولت خانہ سے خالی کبھی نہ آیا ہوگا۔ بلکہ علیحدہ ٹھیرنے والوں کو بھی اکثر ان جنس الفاظ سے مدعو کر کے کہ "کل نان خشک آپکی خدمت میں پہنچیگی" عمدہ سے عمدہ کھانوں کے خوان بھیجتے تھے۔ اور عموماً پردیسیوں کی وہ عزت و تعظیم فرماتے تھے۔ اگر مجلس میں کوئی صاحب باہر کے ہوتے تھے۔ تو ان کو محبت سے بلا کر عزت سے قریب منبر بٹھلاتے تھے جہاں بعض وقت بڑے بڑے لکھنؤ کے امیروں کو جگہ ملنا دشوار ہوتا تھا[1]۔

فصل ۹ سخاوت

سخاوت۔ مرزا صاحب کی سخاوت سے لکھنؤ کا ہر خاندان واقف ہے۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ میں آج تک دھوم ہے۔ ان کو جس قدر مال دنیا حاصل ہوا شاید کسی شاعر یا مداح کو آج تک ملا ہو۔ سالانہ لاکھوں روپیہ ملتا تھا[2] سب اہل حاجت کو دیدیتے تھے۔

---

[1] چنانچہ سید علمدار حسین صاحب واسطی ۱۷ نومبر ۱۹۱۱ء کے عنایت نامہ میں لکھتے ہیں کہ میرے دادا سید امیر علی صاحب مرحوم (جو ایک ذی علم بزرگ تھے) لکھنؤ میں گئے۔ مرزا صاحب بہت تپاک سے ملے۔ (اسی طرح جناب میر صاحب بھی خلق سے پیش آئے تھے) مرزا صاحب کے مرثیہ سننے کی انھوں نے خواہش ظاہر فرمائی۔ تو انھوں نے ایک مجلس کا پتہ دیا جس میں وہ زمانہ قریب مرثیہ پڑھنے والے تھے۔ چنانچہ وہ مجلس میں پہنچے۔ تو مرزا صاحب نے باواز بلند یہ فرما کر کہ صاحبو ایک مومن پنجاب سے مجھے سننے کو تشریف لائے ہیں براہ مہربانی ان کو آگے آنے دیجئے زینہ منبر پر انھیں بٹھا لیا۔ اور یہ بھی وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب کے تبحر علمی زہد و اتقا و اعتقاد در الکلامی کا حال بیان کیا کرتے تھے۔ دادا صاحب مرحوم ... ہو جاتے تھے۔ یہ سید علمدار حسین صاحب منور ریاست پٹیالہ کے رہنے والے اور بالفعل سررشتہ اسپیشل مجسٹریٹی ریاست مذکور میں ہیں۔ ایک علم دوست ذی علم ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مشفق مکرم مسٹر طالع علی خاں صاحب نے نواب ... مرزا صاحب کے صاحبزادوں وغیرہ سے تحقیق کر کے فرمایا تھا کہ علاوہ

اپنے واسطے صرف مایحتاج (خرچ ضروری) رکھ لیتے تھے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء جب ٹپہ عظیم آباد
جانا ہُوا۔ اُن کے اکثر ملنے والے نہایت عسرت میں بسر کرتے تھے۔ اور سوال کرنا تو درکنار اُن
لوگوں کو کچھ دیتے ہوئے بھی حیا آتی تھی۔ مرزا صاحب بنارس کے پارچہ ریشمی و زریں اکثر لاتے
تھے۔ اور ایسے دوستوں کو بطور تحفہ دیتے تھے۔ اگر کوئی صاحب دختر ہوتے۔ تو اُن سے
کہدیتے تھے۔ کہ یہ میری بھتیجی کے جہیز کے اسباب میں شامل فرما دیجیگا۔ دبیرِ ثانی نے بالاتفاق
مرزا صاحب کی سخاوت کی مجھ سے سیکڑوں روایتیں بیان کرتے تھے۔ اگر اس زمانہ میں وہ تمام
حکایتیں لکھی جائیں۔ تو نہ معلوم نئے تعلیم یافتہ اُن کو غپیں (گپیں) سمجھیں یا کیا۔ مگر اس لئے
کہ اگر سب کو نہ بیان کروں۔ تو سب کو چھوڑنا بھی نامناسب۔ اور اُن لوگوں کی دل شکنی کا
باعث ہوگا۔ جو ایسی روایات سُننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں سے
بخیلوں کو بھی کچھ نہ کچھ حوصلہ سخاوت کا ہوتا ہے۔

وصل ۶ حکایت سخاوت

(۱) نانا مرحوم ناقل تھے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء میر محمد جعفر نام ایک میرے ملنے والے
مجھ سے ایک روز بولے۔ کہ بھائی ایک جن ہمارے والد ماجد کے پاس رات میں چاندرات
کے چاندرات آیا کرتا تھا۔ اور اُن کو پانچ روپے دے جاتا تھا۔ کل والد ماجد کا انتقال ہوگیا
اب وہ آمدنی بھی غالباً گئی۔ میں نے کہا۔ وہ جن شاید اُن کے مرنے پر مطلع نہ ہُوا ہو۔ آج
چاندرات ہے۔ شاید آئے کس وقت آتا ہے۔ وہ بولے۔ دوپہر رات گئے کے قریب
قریب میں نے کہا۔ آج تم ضرور جاگنا۔ وہ بولے بھئی میں اکیلا ڈرونگا تم میرے پاس آج رات میں رہ جانا
میں رات کو اُن کے پاس رہا۔ آدھی رات گئی ایک شخص نے زنجیر ہلائی۔ اُنہوں نے چپکے سے
مجھ سے کہا۔ تم دروازہ پر جاؤ۔ میں پہنچا۔ دروازہ کھلنے پر ایک ہاتھ اُس نے بڑھایا۔ میں

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۲) ماہواری تنخواہ کے (سلطان عالیہ کی ماں) ملکہ زمانی زوجہ نصیر الدین حیدر دویم شاہ اودھ عشرہ محرم میں دس
ہزار روپیہ مرزا صاحب کو نذر پیشکش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں سے جو ملتا تھا وہ اس سے بدرجہا زیادہ تھا۔ اور اور محلات اور امرا جو پیشکش
کرتے تھے۔ اُن تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے۔ تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

نے اُس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ روپیہ چھن سے زمین پر گر گیا۔ گھبراہٹ میں مَیں نے ہاتھ پکڑ کر جو اُس کو اس خیال سے گھسیٹا۔ کہ یہ مجھے اُڑا نہ لے جائے۔ تو وہ شخص گر پڑا۔ اب جو مَیں دیکھتا ہوں۔ تو مرزا دبیر مرحوم ہیں۔ فرمایا۔ ہائیں میر محمد رضا۔ یہ کیا حرکت تھی؟ مَیں نے اُن سیّد کے مرنیکا حال کہا۔ اور محمد جعفر نے اور مَیں نے عفو تقصیر چاہی۔ مرزا صاحب نے مجھے اور محمد جعفر کو قسم دی۔ کہ جب تک مَیں زندہ رہوں۔ اس واقعہ کو تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جب دُوسرے دن تخلیہ میں مَیں نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو فرمایا کہ میر صاحب بڑے غیور فاقہ کش تھے۔ اگر مَیں اُن کو بظاہر دیتا۔ تو نہ لیتے۔ اس لئے پوشیدہ طور پر دیا کرتا تھا۔ یہ واقعہ ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے مرنے کے بعد اکثر بیان فرمایا کرتے تھے ✤

فصل ۱۰ مطلب براری

بندگان خدا کی مطلب برآری۔ اس عبادت کو مرزا صاحب سب عبادتوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ وہ آدمی نہیں ہے۔ جو دُوسروں کے کام نہ آئے ✤ شاہی زمانہ میں جب کبھی کوئی اہل حاجت اُن سے اپنی حاجت بیان کرتا تھا۔ تو وہ اگر خود اُس کو روا کر سکتے تھے۔ تو خود دیتے تھے۔ ورنہ کسی بیگم یا شاہزادہ یا شاہزادی کو رقعہ سفارشی لکھ دیتے تھے۔ اُن کا رقعہ پراَمیسری نوٹ یا ہنڈی کا کام دیتا تھا۔ اور کبھی خود پینس میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اور سفارش کر کے دلواتے تھے۔ یا جو حاجت ہوتی تھی روا فرماتے تھے ✤

حکایت اوّل ۱

مولوی سردار مرزا صاحب سلمہ خلف مفتی نواب مرزا صاحب مرحوم مجھ سے ناقل تھے۔ کہ جناب میر انیس مرحوم کے ایک شاگرد نے ایک روز زمانہ شاہی لکھنؤ میں مرزا صاحب سے آکر کہا۔ کہ مجھے ملکہ زمانی کی مجلس میں آج پڑھوا دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا۔ اپنے پاس سے تمام قیمتی شاہی کپڑے اُن کو پہنوائے۔ ایک پینس[1] میں خود دُوسری میں

[1] پینس عام طور پر تمام ہندوستان میں بولا جاتا ہے۔ اور شاید یورپ کی کسی زبان کا یہ لفظ ہے۔ بعض اہل علم فنس کہتے ہیں۔ جو میرے نزدیک بنائی ہوئی لفظ ہے۔ مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ؎ پینس میں گذرتے ہیں جو کوچہ

انکو سوار کراکے ہمراہ لیگئے۔ سلطان عالیہ و ملکہ زمانی سے تعریف کی۔ اور پڑھوایا۔ وہاں سے دو شالے
اور شالی رومال اور شاید پانچ سو روپیہ نقد اُن کو ملے۔ گھر واپس آکر وہ مرزا صاحب کے
شالی کپڑے اُتارنے لگے۔ فرمایا۔ آپنے شاہزادی کا ہدیہ تو قبول فرمالیا۔ اب یہ فقیر کا
ہدیہ کیوں رد فرماتے ہیں۔ اُن شالی کپڑوں کے ساتھ دو سو روپیہ اپنے پاس سے اور
دئے۔ سچ ہے ع مدّاح بھی کریم کا ایسا کریم ہو[1]

خلق اُنکی مطلب براری کی دوسری حکایت

جناب سید حسن صاحب مضطر وکیل آگرہ شاگرد جناب میر مونس مرحوم مجھ سے اس
واقعہ کو بمقام لکھنؤ ۱۹۰۹ء میں بیان فرماتے تھے۔ کہ (بعد غدر ۱۸۵۷ء) ایک سید صاحب
نے مرزا صاحب سے آکر کہا۔ کہ آپ خود چل کر میری سفارش (ایک رئیس کا نام لیکر کہا) اُن سے
دو سو روپیہ کے واسطے (کہ میں کربلائے معلّے جانا چاہتا ہوں) فرمادیجیے۔ مرزا صاحب نے
جواب دیا۔ کہ وہ جناب میر انیس صاحب سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ بہتر ہوگا۔ کہ آپ
جناب میر صاحب کے پاس جائیے۔ اُن کی سفارش مؤثر ہوگی۔ مجھ سے اُن سے ربط
نہیں ہے۔ اُنہوں نے اصرار کیا۔ کہ مجھے استخارہ واجب آیا ہے۔ میں تو آپ ہی کو
تکلیف دونگا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ آپ کو استخارہ آیا ہے۔ مجھے تو نہیں آیا۔ اُنہوں
نے کہا۔ اچھا آپ بھی استخارہ فرمائیے۔ مرزا صاحب نے استخارہ کیا۔ اچھا آیا۔ اُن
سید صاحب سے فرمایا۔ آپ تشریف لے چلئے۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔ وہ آگے

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۱) سے ہمارے۔ کاندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے۔ میں پنیس کو فصیح سمجھتا
ہوں جو کثرت سے بولا جاتا ہے۔ اور اصلی لفظ ہے۔ اور حضرت غالب مرحوم نے نظم فرمایا ہے۔ جو اہل دہلی و
لکھنؤ بلکہ تمام اہل ہندوستان میں مستند و معتبر شاعر مانے جاتے ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[1] جناب میر اصغر حسین صاحب ساکن لکھنؤ کاظمین نے مجھ سے ۱۳۲۳ ہجری میں بیان فرمایا کہ یہ میرے والد ماجد
میر امجد حسین صاحب مرحوم پر مرزا صاحب نے احسان فرمایا تھا۔ انکو ملکہ زمانی مرحومہ کے یہاں پڑھوایا تھا۔ یہ میر صاحب معز سلامت ہیں۔ اور
نہایت ثقہ بزرگوار ہیں۔ ان کے والد ماجد میر صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد پینس میں سوار ہو کر مرزا صاحب پہنچے۔ دن کے دس یا گیارہ
بجے کا وقت تھا۔ وہ رئیس گھر میں کھانا کھانے کو گئے تھے۔ بیٹھک کے کمرے میں مرزا
صاحب بیٹھے۔ مہری نے اطلاع کی۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب تشریف لائے ہیں کہا
ہائیں۔ پھر دریافت کیا کون صاحب ہیں۔ پھر اُس نے یہی جواب دیا۔ اب تو اُنہوں نے
کھانا چھوڑ دیا۔ فوراً ہاتھ دھو کر باہر آئے ملے۔ پوچھا حضور نے کیوں زحمت
فرمائی۔ فرمایا۔ یہ سید صاحب مجھے لے آئے۔ اپنے دادا کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں
دو سو روپیہ درکار ہیں۔ نواب صاحب اندر گئے۔ چار سو روپیہ لا کر اُن سید صاحب کو
دئے۔ اور فرمایا میر صاحب! یہ دو سو روپیہ تو آپ کے مطلوبہ ہیں۔ اور دو سو روپیہ
اس شکریہ میں نذر سادات کرتا ہوں۔ کہ جناب مرزا صاحب قبلہ کفش خانہ پر تشریف
لائے ۔۔ ناظرین دیکھئے۔ دبیر و انیس کی یہ وقعتیں رئیسوں کے دلوں میں تھیں۔
جن انیسیوں کو مرزا دبیر سے جلنے والا اور مٹانیوالا لوگ سمجھتے تھے۔ اور جن دبیریوں کو
میر انیس سے منحرف لوگ سمجھتے تھے۔ وہ بھی دل سے اُن سے ایسی محبت رکھتے تھے۔

ہائے وہ لوگ کہاں گئے ع

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کے سناٹے + مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

بندگان خدا کی حاجت برآری کی تیسری حکایت

یہ بھی جناب میر الطاف حسین عرف نواب منی صاحب سلمہ اللہ والبقاہ تحریر فرماتے
ہیں۔ کہ جب میرے والد مرحوم نے ۱۲۶۹ھ میں انتقال فرمایا۔ تو میرا سن اڑھائی برس کا تھا۔
جناب مرزا صاحب مرحوم مجھ کو خود بادشاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے دربار میں
لیکر گئے۔ اور میرے باپ کی جگہ (کہ سواروں میں اُن کا اسم تھا) میرا نام لکھوا دیا* پھر
میں اُسی عمر میں شمس آباد (ضلع فرخ آباد) میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ چلا آیا۔ یہاں ایک

* ان کے والد ماجد میر شرف الدین مرحوم مرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ بے مثل پڑھتے تھے آج تک لکھنؤ میں ان کے پڑھنے کی
دھوم ہے۔ دس بارہ بند پڑھتے تھے کہ مجلس میں ٹس پڑ جاتی تھی۔ مقبول ذاکر تھے ۔۔ ۱۲ مؤلف حقیر

مدّت تک مرزا صاحب میری تنخواہ خزانہ شاہی سے لیکر بھجوایا کئے۔ مرزا صاحب سیرت و صورت میں فرشتہ صفات تھے +

مطلب برآری بندگانِ خدا کی چوتھی حکایت

ایک بزرگ مجھ سے ناقل تھے۔ کہ زمانہ شاہی میں مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا تھا۔ ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ تمام مرثیہ بالخصوص اس کا بین مرزا صاحب کو بہت پسند تھا۔ اکثر اُن کے شاگردوں اور دوستوں نے مانگا۔ مگر مرزا صاحب نے کسی کو نہ دیا۔ نواب محسن الدّولہ مرحوم جو لکھنؤ کے ایک فیّاض رئیس (اور شاہ اوّل اودھ غازالدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کے داماد تھے اس مرثیہ کے بہت مشتاق تھے۔ وہ کسی رئیس کے یہاں مجلس میں سُن چکے تھے۔ اور کلام مرزا صاحب کے گویا عاشق تھے۔ اُنہوں نے بارہا اپنے جلسہ میں فرمایا۔ کہ جو شخص یہ اصلی مرثیہ مرزا صاحب کا مجھے کسی ترکیب سے لادے۔ میں اُس کو پانچ سَو روپیہ انعام دوں۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی خبر ہو گئی۔ وہ مرثیوں کو اور خاص کر نئے مرثیوں کو بہت احتیاط سے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء ہو گیا۔ بعد غدر ایک سیّد صاحب مرزا صاحب کے پاس آئے۔ اور اُن سے کہا۔ کہ میں لڑکی کی شادی کرونگا۔ اور پھر کربلائے معلّے جاؤنگا۔ آپ پانچ سَو روپیہ کسی رئیس سے مجھے دلوا دیجئے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کی تباہی کا تھا۔ اکثر رئیس اپنے حال میں مبتلا تھے۔ مگر نواب محسن الدولہ کے پاس کئی لاکھ روپیہ کے نوٹ اور پنشن معقول اور جائداد تھی۔ مرزا صاحب نے کچھ سوچ کر اُن کو اپنا یہی مرثیہ دیدیا۔ اور کہا۔ کہ آپ نواب محسن الدولہ کی ڈیوڑھی پر جاکر اطلاع دیجئیگا۔ کہ میرے پاس یہ مرثیہ ہے ع کس شیر کی آمد الخ۔ اور یہ بھی کہدیگا۔ کہ میں نے سُنا ہے۔ کہ آپ کا اشتہار ہے۔ کہ جو شخص یہ مرثیہ لادے میں اُس کو پانچ سَو روپیہ دونگا۔ اب مجھے ۵۰۰ روپیہ دیجئے۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے تو محسن الدولہ مرحوم سمجھے کہ صرف وہ مطلع ہے۔ اور کسی نے اور بند اُس کے لگائے ہیں۔ مگر جب اُن سیّد صاحب نے کہا۔ کہ آپ تو اُن کے خط کو پہچانتے ہیں (اور وہ واقعی

خط کو پہچانتے تھے۔ کہ اُن کی زوجہ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں) تو انہوں نے خط پہچان کر مرثیہ کی نقل لے لی۔ اور ۵۰۰ دیدئے۔ اور اصل مرثیہ واپس دیدیا۔ سید صاحب نے یہ بھی پُوچھا۔ کہ یہ مرثیہ آپ کو کیونکر ملا۔ مگر اُنہوں نے کہا۔ یہ میں نہ بتاؤنگا۔

فصل ۱۱ متانت۔ خود داری۔ وضعداری۔ حاضرجوابی۔ وعدالت۔

متانت و خودداری اور وضعداری و حاضرجوابی و عدالت۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔ کہ جو وضع مرزا صاحب نے اختیار فرمائی۔ خدا کے فضل سے مرتے مرتے نباہ دی۔ چنانچہ وہ کبھی شہر میں پیدل نہیں پھرے۔ ہمیشہ لوگوں نے اُن کو پینس میں دیکھا۔ اور متانت ایسی تھی۔ کہ باوصف ایک شاعر و مرثیہ گو کی حیثیت میں رہنے کے بڑے بڑے صاحبان علم اُن کو اپنا قبلہ و کعبہ اور لائق احترام جانتے تھے۔ اور جن امور میں دبنا اور عجز کرنا غیر مستحسن ہے۔ اُن میں وہ کبھی کسی سے دب کر نہیں رہے[۱]۔

عدالت کا اس قدر خیال رکھتے تھے۔ کہ کبھی کسی غریب کے مقابلہ میں کسی امیر کی بدآبندو بداصل طرفداری نہیں کی۔ نہ کبھی کسی بادشاہ یا رئیس کی اُنہوں نے خوشامد کی۔

حاضرجوابی کی حکایت

[۱] چنانچہ یہ واقعہ میرے کرم فرما سید احمد صاحب نقوی جائسی زاد کرمہ جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ کے بھتیجے اور شاگرد جناب ممدوح سے سنکر لکھتے ہیں۔ کہ ایک روز جناب علیین مکان (سید العلماء میرن صاحب قبلہ) کی صحبت میں مَیں حاضر تھا۔ اور سید امداد علی صاحب مرحوم مصنف سحر المصائب جنکو انیسیت میں حد درجہ غلو تھا۔ اور اور چند اہل علم حاضر تھے۔ کہ مرزا صاحب کے اس مرثیہ کا ذکر ہوا۔ "کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے"۔ مولوی امداد علی صاحب مرحوم نے (خدا اُن کی مغفرت کرے) میرن صاحب قبلہ سے عرض کی۔ کہ دیکھئے حضور۔ اب تو مرزا صاحب نے حد درجہ غلو فرمایا ہے۔ کہ صفت قدم کو جو خدا سے مختص ہے آنحضرت صلعم سے منسوب کر دیا۔ اس پر میں نے کچھ اُن کے اعتراض کے جواب میں کہنا شروع کیا۔ کہ اتفاق سے مرزا دبیر صاحب بھی آگئے۔ اُنہوں نے غالباً مکان میں آتے آتے کچھ الفاظ اس بحث کے سُنے تھے۔ کہ جناب سید العلماء سے عرض کیا۔ کہ اس وقت حدوث و قدم کی کیا بحث تھی۔ مولوی امداد علی صاحب نے کہا۔ کہ جناب نے اپنے قدم کو صفات رسول مقبول صلعم سے متعلق فرمادیا۔ مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا۔ میں نے تو قدم نہیں بلکہ خوشبوئے قدم کا دعوےٰ کیا ہے۔ حق تعالےٰ تو ادنےٰ چیز کی نسبت قدم کا ارشاد فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ یٰس میں ہے۔ والقمر قدرناہ منازل حتیٰ

نہ لباس درباری سے کہیں نہ گئے۔ نہ مدۃ العمر کسی بادشاہ کو خداوند کہا۔ (حقیر ثابت) [۱]

رہے جہاں میں انساں آن بان کے ساتھ ❊ کہ جوہری جو ہیں۔ موتی کی آب دیکھتے ہیں

برکتِ شاگردی۔ نواب منّی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اس کو ہم خرقِ عادت کہہ سکتے ہیں۔ کہ جو اُن کا شاگرد ہوا۔ خوب پھلا پھولا ❊

فصل ۱۸ برکتِ شاگردی سے اور اس سے متعلق حکایت

درحقیقت مرزا صاحب کے شاگرد جس کثرت سے کامل و قابل ہوئے ہیں۔ ایسے کم (شاعروں کے شاگرد) نکلینگے۔ مَیں نے اسی خیال سے اُن کے بالواسطہ و بلاواسطہ اکثر شاگردوں کے سبھی حالات لکھ دئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا۔ کہ ملک کو اُن سے کس قدر فیض پہنچا۔ اس موقع پر نواب منّی صاحب کی زبانی یہ دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کے تلمذ کی برکت کس قدر تھی۔ اور وہ حفظ مبتدی کو بھی بتانے میں تامل نہ فرماتے تھے۔ نواب منّی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ایک بار میرے ماموں نواب دولھا صاحب شمس آبادی مرحوم ایک منّت ادا کرنے کی تقریب سے (کہ درگاہ حضرت عباس میں علم چڑھانا تھا) مع متعلقین کے لکھنؤ تشریف لیگئے۔ مرزا صاحب سے پہلے سے تعارف تھا۔ مرزا صاحب نے نواب صاحب کی اعلےٰ درجہ کی دعوت کی۔ اسی زمانہ قیام لکھنؤ میں نواب صاحب نے مجھ سے اور بھائی نواب پیارے صاحب [۲] اپنے منجھلے بیٹے سے فرمایا۔ کہ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ برکت کے لئے تمکو جناب مرزا صاحب کا شاگرد کرا دوں۔ ہم نے عرض کی۔ بہت

روایت منّی صاحب کی زبانی

(بقیہ نوٹ نمبر ۱) عاد کالعرجون القدیم۔ اس پر مولوی صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ اب تو میں مایوس ہو گیا۔ فوراً مرزا صاحب بولے آپ مایوس نہیں بلکہ آئس ہیں۔ اس پر تمام مجمع اہلِ علم میں ریشخند (ہنسی) ہوئی۔ اور جناب مرزا صاحب کی حسب تائید کی۔ (در حقیقت میں مایوس بجائے آئس غلط ہے کیونکہ عربی کے قاعدہ سے اس کے معنی پر آئس آتا ہے۔ مایوس اُس کا مفعول ہے) اور جب مرزا صاحب چلے گئے تو میرن صاحب قبلہ نے مولوی ملا علی صاحب سے فرمایا۔ کہ کچھ بھی کلامی تعبیہ ہوتا ہے۔ جو کہ اس وقت نصیب ہوا۔ اللہ اللہ کس پایہ کی معلومات تھی۔ اور کیا حاضر جواب طبیعت پائی تھی ❊ ۱۲ مولف حقیر۔

[۲] نواب پیارے صاحب کے بھی مختصر حالات تلامذہ مرزا صاحب کے سلسلہ میں (انشاءاللہ) لکھونگا ❊ ۱۲ مولف حقیر۔

مناسب ہے۔ چنانچہ ایک دن کچھ مٹھائی اور کچھ آدمی ساتھ کر کے ہم دونوں کو جناب مرزا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ ہم نے جا کر دیکھا۔ کہ اتنے بڑے نامی گرامی حضرت کی نشست گاہ میں (بشان اہل اللہ) چند چارپائیاں خالی پڑی ہیں۔ اور ایک تخت پر سفید بچھونا ہے۔ اُس پر جناب مرزا صاحب کچھ عبادت و اشغال میں مشغول ہیں۔ میرا اور بھائی پیارے صاحب کا سن غالباً نو دس برس سے زیادہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ کم عمر اپنے عزیز بچوں سے باتیں کرنے کا طریقہ ہے۔ اُس طرح کی دو چار باتیں کر کے مرزا صاحب نے بھائی پیارے صاحب سے پوچھا۔ تم کچھ موزون کر لیتے ہو؟ شاید اُنھوں نے "جی ہاں" کہا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کچھ کہو۔ بھائی نے یہ ایک مصرع موزون کر کے سُنایا۔ ع خوف غالب ہے آپ سے مجھکو۔ یہ سُن کے بہت عمدہ طرز سے کہ ناگوار نہ گذرے فرمایا۔ کہ بھائی "آپ سے خوف غالب ہے" کا محاورہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ محاورہ ہے۔ کہ "آپ کا خوف غالب ہے"۔ یہ سُنکر میں فوراً بول اُٹھا۔ کہ ع خوف غالب ہے آپ کا مجھکو۔ یہ سُن کر میری طبیعت اور بھائی پیارے صاحب کی موزونیت کی تعریف کی۔ بس دو ایک باتوں کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے۔ مگر صرف اُس برائے نام شاگردی کا یہ اثر ہے۔ کہ بھائی پیارے صاحب اُن کے مرثئے وغیرہ دیکھ کر ایسے تاریخ گو شاعر ہوئے۔ کہ اس وقت ضلع فرخ آباد کو کیا اور اضلاع میں بھی ایسا جلد و خوب تاریخ کہنے والا شاعر دُوسرا نہ ہوگا۔ اور کمترین راقم صاحب کو صرف مشہور درسی فارسی کتب کی استعداد ہے۔ بایں ہمہ اپنی حیثیت سے زیادہ نظم و نثر لکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس کو دیکھکر عقل اس کی قائل ہوئی۔ کہ یہ صرف اُنہیں کی شاگردی اور دعائے خیر کی برکت ہے *

دُوسرے کو احمق بنانے کی عادت سے نفرت

دُوسرے کو احمق بنانے اور ہجو ملیح کرنیکی بعض حضرات کو عادت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کو اس سے کمال نفرت تھی۔ اور وہ ایسی تعریف کو منافقانہ کہا کرتے تھے *

حسد سے جلن

حسد اور رشک سے بھی اُن کو جلن تھی۔ اور اکثر اپنا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

مذہب میں مرے رشک خفی شرک جلی ہے ✣ واللہ کہ یہ ولولۂ حُبِّ علیؑ ہے

ایفائے وعدہ

ایفائے وعدہ۔ آندھی آئے مینہ آئے۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔ وہ سنو کام چھوڑ کر وعدہ ضرور وفا فرماتے تھے۔ چنانچہ جناب مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا و مقتدانا سید علی حسن صاحب قبلہ دام ظلہٗ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ مجلس میں مرزا صاحب نے ایک نیا مرثیہ پڑھا۔ جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ مرزا صاحب سے مانگا۔ فرمایا بر وزِ روانگی وطن آپ کو ملیگا۔ مَیں عشرہ محرم ہمیشہ جائس میں کیا کرتا تھا۔ آخر ماہ ذیحجہ میں جب لکھنؤ سے قصدِ روانگی وطن کیا۔ تو مَیں نے شہر کے ناکے پر اپنے پہنچنے سے پہلے مرزا صاحب کی پالکی موجود پائی۔ مرزا صاحب ملے۔ تو وہی مرثیہ ہاتھ میں تھا۔ مجھے عنایت فرمایا۔ مَیں مرثیہ لیکر وطن کو روانہ ہوا[۲] ✣

دلجوئی

دل جوئی۔ مرزا صاحب کبھی اپنے دشمن کی بھی دل شکنی گوارا نہ فرماتے تھے۔ اور دل آزاری کو بدترین خصائل ذمیمہ سمجھتے تھے۔ اور خلاف حیا و مروّت اُن سے کوئی بات ظہور میں نہ آتی تھی۔ یہ اُن کا شعر بالکل اُن کے حسب حال ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو ✣ مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

میر ضمیر صاحب سے جب لوگوں نے بگڑوا دی ہے۔ تو کیسے کیسے لوگوں نے حملے کئے۔ مگر میر ضمیر صاحب کی شان اقدس میں تو کوئی کلمہ کہنا مرزا صاحب کفر سمجھتے تھے۔ اُن لوگوں کی زبان درازیاں سُن سُنکر بھی زبان نہ ہلائی۔ اور کہا تو بس یہ کہا۔ کہ جو بالکل زمانہ کے حسب حال

---

[۱] صدر الافاضل جناب مولوی سید سبط حسن صاحب جائسی جو آجکل محدث و ذاکرِ بے عدیل لکھنؤ اور ہندوستان میں مانے جاتے ہیں۔ انہیں کے نواسے اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ع قیاس کُن زگلستانِ من بہار مرا ✣ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] آج یہ مرثیہ بھی نہیں ملتا۔ نہ معلوم جناب قبلہ و کعبہ سے کون لے گیا۔ ایسے ایسے سیکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے بے پتہ ہیں۔ کہ جن کے مصرع لوگوں کو یاد ہیں ✣ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ اور اپنے دلی خیال کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ؎

برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے ✦ آئینہ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے

آستینوں اور زمینوں والے سلام پر جو طرفداران میرانیس مرحوم نے ایک جھگڑا کھڑا کر دیا تھا جس کا بیان اس کتاب میں اپنے مقام پر ہوگا۔ اُس زمانہ میں بھی کسی کو کوئی کلمہ جناب میرانیس مرحوم کی تحقیر کا نہیں کہنے دیا ✦

خوش اخلاقی کی وجہ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ محمدؐ و آل محمدؐ علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے اخلاق و عادات کتب احادیث وسیر میں دیکھتے دیکھتے اور اُن کے مناقب و فضائل نظم کرتے کرتے اخلاق حسنہ نے مرزا صاحب کے دل پر پُورا پُورا اثر کیا تھا جس طرح بعض تصوّف کی کتابوں میں محبوب کے ہمرنگ ہونیکی تشبیہ مذکور ہے۔ کہ لوہا باوصفیکہ آگ نہیں ہے۔ مگر جب آگ میں پڑیگا۔ تو آگ کا ہمرنگ و ہم اثر ہو جائیگا۔ کہ جو شخص اُس وقت چھو لیگا۔ جل جائیگا۔ پس آگ کی صحبت نے لوہے کو اپنا ہمرنگ و ہم اثر بنا دیا۔ یہی حالت مرزا صاحب کی ہو گئی تھی۔ کہ محمدؐ و آل محمدؐ کے اخلاق حسنہ نے اُن کے دل میں (ولاے محمدؐ و آل محمدؐ کی طرح) اپنا گھر کر لیا تھا۔ وہ آل محمدؐ کے ایسے غلام تھے۔ کہ جس غلام میں آقا کی صحبت کی بدولت آقا کی عادتیں سرایت کر جاتی ہیں۔ اُن کے اکثر پرانے شاگرد جن کو اخیر زمانہ میں یہ شکایت رہتی تھی۔ کہ نیا مرثیہ نہیں ملا۔ ایسے ایسے ذریعوں سے اپنا مطلب نکال لیتے تھے چنانچہ

لطیفہ ایک سیّد صاحب کی حکایت

نانا مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ کہ ایک روز نگینہ کی طرف کے ایک کہن سال سیّد جو شاید نوّے اور سو برس کے درمیان میں ہونگے۔ مرزا صاحب کے پاس (بعد زمانہ دراز غدر ۱۸۵۷ء کے) آئے۔ مَیں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا بیٹھک کے مکان میں آتے ہی پوچھا۔ دبیر کس کا نام ہے؟ مرزا صاحب بولے۔ فرمائیے حقیر ہی دبیر ہے۔ خیر بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بولے۔ میرا نام حسین بخش ہے۔ اور مَیں صحیح النسب سیّد ہوں۔ میرے نام کا سجع کہہ دیجئے۔ مرزا صاحب بولے۔ کہ آپ کا نام ایسا مسجّع اور اچھا

ہے۔ کہ اُس کے واسطے پہلے سے سجع موجود ہے*۔ پُوچھا وہ کیا؟ فرمایا ع یارب گناہِ ما
بطفیلِ حسینؓ بخش۔ بڑے میاں خوش ہو گئے۔ مرزا صاحب کو دعائیں دے کر کہا۔ کہ ذرا ایک
پرچہ پر اسے اپنے ہاتھ سے لکھ بھی دو۔ شاید مَیں بھول جاؤں۔ مرزا صاحب نے جلی قلم سے
لکھ دیا۔ کہا اب مَیں چوک میں جاتا ہُوں۔ اور اس مصرع کو حکّاک سے ایک عقیق کے نگینے
پر کھدوا کر ابھی انگوٹھی بنواتا ہُوں۔ یہ مصرع آپ کا یادگار میرے پاس رہیگا۔ یہ کہکر تشریف
لیگئے۔ مَیں (محمد رضا ظہیر) کچھ دِنوں سے نیا مرثیہ مرزا صاحب کے نہ دینے کے سبب سے ملول
تھا۔ اُن کے بعد اُٹھا۔ بڑے میاں آہستہ آہستہ جریب ٹیکتے ہُوئے نخاس کی سڑک
کے قریب پہنچے تھے۔ کہ مَیں بھی برابر پہنچ گیا۔ وہ بار بار اُس لکھے ہُوئے مصرع سجع کو دیکھتے
اور خوش ہوتے جاتے تھے۔ مَیں نے پُوچھا۔ حضت (حضرت) کہاں تشریف لے جائیگا۔
فرمایا۔ بس ذرا چوک تک۔ وہی سجع کا مصرع کندہ کراؤنگا۔ کیوں میاں لاجواب مصرع ہے؟
مَیں نے سر جھکا کر کہا۔ جی ہاں! آپ کی پسند ہے۔ ہم تو اس کو کیا کہیں۔ کیسا سمجھتے
ہیں۔ بڑے میاں بولے۔ کیوں صاحب آپ اس کو کیسا سمجھتے ہیں۔ مَیں بولا۔ جناب
آپ اس کے کچھ معنی بھی سمجھے۔ کہا۔ ہاں میاں یہی معنی ہیں۔ کہ اے خدا میرے گناہ امام
حسین علیہ السلام کے صدقہ سے بخش دے۔ مَیں نے کہا جی ہاں یہ تو سیدھے سادے
معنی ہوئے۔ مگر دُوسرے معنی بھی آپ سمجھے۔ اُنہوں نے کہا۔ وہ تم کہو۔ مَیں نے کہا۔
ایک اس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اے خدا۔ مَیں نے حسین بخش
کی طفیل یعنی سبب سے گناہ کئے ہیں وہ بخش دے۔ یہ مرزا صاحب نے آپ سے مزاح فرمائی
ہے۔ بُڈھا یہ سُنکر آگ بگولا ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ ہاں میاں واقعی یہ معنی بھی ہو تو سکتے
ہیں۔ مگر مَیں تو سنو برس کا بڈھا ہُوں۔ کیا مجھ سے بھی مرزا صاحب نے دل لگی کی۔ مَیں بولا۔

* پہلے سے سجع موجود ہونا شاید اس خیال سے فرمایا ہو کہ شیخ ناسخ مرحوم کا سجع خود اُنہیں کا کہا ہُوا بہت مشہور ہے ع یارب گناہِ ما بطفیل
امام بخش۔ ناسخ مرحوم کا نام امام بخش تھا۔ ان سید صاحب کا نام حسین بخش تھا۔ یہ خفیف فرق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب آپ کیا سمجھتے ہیں ہم شہر والوں کی عادت ہوتی ہے ۔ بیرونیوں ۔ دیہاتیوں کو الو بناتے ہیں ۔ وہ بزرگوار اُسی پاؤں پھر کر مرزا صاحب کے پاس آئے ۔ مرزا صاحب بیٹھے ہوئے تھے ۔ پرچہ اُن کے سامنے غصہ میں پھینک دیا ۔ اور کہا ۔ مرزا صاحب افسوس کا مقام ہے میرے پوتے تمہارے برابر ہیں ۔ مَیں سید ۔ تم مغل تمکو شرم نہیں آتی ۔ مجھ سے دل لگی کرتے ہو ۔ میرے طفیل میں تم نے کون کون سے گناہ کئے ہیں جنکی معافی خدا سے چاہتے ہو ۔ اب مرزا صاحب ہیں کہ گردن جھکائے تصویر حیرت بنے ہوئے چپ بیٹھے ہیں ۔ (بقول مؤلف حقیر) ہراک کے شکوۂ بے جا پہ سرنگوں رہنا ۔ پسند آئی یہ پیرِ فلک کی چال مجھے جب وہ بزرگوار خوب دل کے پھپولے پھوڑ چکے ۔ تو مرزا صاحب نے سر اُٹھا کر فرمایا ۔ بھلا میر صاحب ۔ مَیں آپ ایسے مقدس معمر بزرگ سے دل لگی کرونگا ۔ پہلے یہ فرمائیے ۔ یہ معنی آپکو کس نے بتلائے ۔ وہ جو صاحب ابھی یہاں آپکے برابر بیٹھے ہوئے تھے ۔ کیا انھوں نے یہ معنی سمجھائے ہیں ۔ بڈھا اس کلمہ سے اور بھی بھڑک اُٹھا ۔ گویا جلتی ہوئی آگ پر تیل پڑا ۔ بولا سبحان اللہ ۔ کیا آپ نے مجھے گندہ ناتراش ہی سمجھ لیا ۔ آپ لکھنؤ والوں میں یہ بھی سخت عیب ہوتا ہے ۔ کہ سمجھتے ہو ۔ بس ہم ہی پڑھے لکھے ہیں ۔ ہمیں سمجھتے ہیں ۔ بیرونی ۔ دیہاتی تو سب احمق ہی ہوتے ہیں ۔ جناب گلستاں ۔ بوستاں ۔ شاہنامہ ۔ سکندرنامہ ۔ یوسف زلیخا ۔ سہ نثر ظہوری ۔ پنج رقعہ ۔ وقائع نعمت خاں عالی سب چاٹے بیٹھا ہوں ۔ جاہل مطلق نہیں ہوں ۔ گاؤں کا رہنے والا ہوں ۔ آپکی طرح تڑاق پڑاق زبان چلانا نہیں آتا ۔ مرزا صاحب نے بہت منت سماجت سے اُن سید صاحب کو راضی کیا ۔ بااین ہمہ اس کے معنی اُن کے ذہن نشین ایسے ہو چکے تھے ۔ کہ جبتک دوسرا مصرع صحیح مرزا صاحب نے نہ کہدیا وہ وہاں سے نہ اُٹھے ۔

جب حسب معمول میں رات کو پہنچا ۔ مرزا صاحب بولے ۔ کیوں بھئی میر محمد رضا ؟ اب تم ایسی ایسی رہزنیاں کرنے لگے ۔ اُلٹے پلٹے معنی سمجھا کر سادات کی دل شکنی کے مرتکب

ہوتے ہو۔ اور مجھے گالیاں سنواتے ہو۔ مَیں نے کہا۔ جناب! یہ محمد رضا بھی سیّد ہے۔
چمار نہیں ہے۔ اس کی دلشکنی چھ مہینہ سے ہو رہی ہے۔ اس کا آپ کو خیال ہی نہیں
کیا گاؤں میں رہنے سے اُن کی سیادت سندی ہو گئی۔ اور میرا رتبۂ سیادت شہر میں رہکر گھٹ
گیا۔ فرمایا۔ تم یہ تو سوچو۔ اب تک برابر سالانہ تمکو دو تین مرثئے ایسے دیتا رہا۔ کہ
پھر جب تک تم اُس مرثیہ کو عام طور پر تقسیم کرنیکی رائے نہ دیتے تھے۔ مَیں سب شاگردوں
اور دوستوں کو نہ دیتا تھا۔ اب کچھ محمد جعفر اور محمد ہادی حسین کا بھی حق ہے یا نہیں۔ کچھ
ان کے واسطے رہنے دو۔ مَیں نے کہا حضرت (حضرت) بھائی محمد جعفر* ماشاءاللہ
چشم بددور ابتدائے مشق میں خود اچھا کہنے لگے ہیں۔ چند روز میں اور اچھا کہینگے۔ آپ
اُن کی فکر کیوں فرماتے ہیں۔ بھلا انصاف فرمائیے۔ یہ بھائی محمد جعفر کی کسر یا یہ کی ہے

کانٹا جو گل سے نوک کی لیتا ہے خوار ہے ✦ سبزہ۔ فروتنی سے چمن کی بہار ہے

ہم تو مر کے بھی جی اُٹھیں۔ جب بھی ایسا نہیں کہ سکتے۔ یہ آپ کی دعائے نیم شبی کا اثر
ہے۔ فرمایا محض خدا کی عنایت ہے۔ یہ فرما کر اندر سے حبیب ابن مُظاہر اسدی (رفیق
امام حسینؑ) کے حال کا مرثیہ لائے۔ اور فرمایا۔ لیجئے۔ مگر یہیں بیٹھ کر دیکھ لیجئے۔ پھر آپ گھر
پر لے جاکر دوپہر کے بعد مسودہ کر کے مرثیہ واپس لائیگا۔ اور فرمائیگا۔ کہ دُوسرا مرثیہ
دو۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ تو مَیں نہ مانونگا۔ یہ مرثیہ میرا سُنا ہُوا تھا۔ مَیں نے ایک
دو بند دیکھ کر کہدیا۔ حضرت امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ مجھے چاہئے۔ فرمایا۔ کیوں۔
مَیں نے کہا۔ وجہ کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ تم ان کے مرتبہ سے واقف ہو۔ یہ کون بزرگوار
ہیں۔ یہ جناب رسول خدا صلعم کے وفادار صحابی۔ جناب امیرؑ کے غمگسار۔ امام حسینؑ کے
جاں نثار ہیں۔ یہ مرثیہ بہت اچھا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ سب سہی (صحیح) مگر امام حسینؑ
نہ تھے۔ میرے پڑھنے سے ان کے حال پر لوگ بہت کم روئینگے۔ اکثر یہ سوچینگے۔ کہ نزلیسٹھ

---

* یہ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کا اسم سامی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

سال کے بُڈھے تھے۔ امام حسینؑ پر سے صدقے ہو گئے۔ مجھے تو وہ مرثیہ دیجئے۔ "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے"۔ فرمایا۔ یہ سب خیالات بیہودہ و جاہلانہ ہیں۔ حبیب ابن مُظاہر اسدی کے مرتبہ کو بڑے سے بڑا عالم و محدث و مجتہد بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ وہ بزرگوار تھے۔ جن کی نسبت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پر نثار ہوں[1]۔ میں نے عرض کی۔ خیر ان کے مرتبہ میں مجھے کلام نہیں۔ مجھے تو وہی مرثیہ چاہئے۔ مرزا صاحب نے وہی مرثیہ "اے دبدبۂ نظم الخ" دیا۔ اور پھر جب تک میں نے اجازت نہ دی عام طور پر (مرزا صاحب نے) تقسیم نہیں فرمایا۔ اللھم اغفرہ +

غیرت اور آن بان۔ (لمؤلفہ)

فصل ۱۴ غیرت اور آن بان

رہے جہاں میں انساں آن بان کے ساتھ + کہ جوہری جو ہیں موتی کی آب دیکھتے ہیں

یہ بات بھی لکھنؤ میں مشہور ہے۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت اُن اسباب سے نہیں ہوئی۔ جن کو عرف میں کوشش و سعی وغیرہ کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے جب ابتداءً قریباً ۱۲۳۰ھ میں مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اُس زمانہ میں اکثر مرثیہ گو شاعر گویا سوزخوانوں کے دست نگر تھے۔ اور ایک بڑے کامل سوزخواں میر علی صاحب[2] موجود تھے۔ جن کے در دولت پر بڑے بڑے شاہزادے

---

[1] بابی انتم و اُمّی کی طرف اشارہ ہے جو فقرہ زیارت ماثورہ میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی وارد ہے۔ کہ وہ جناب شہدائے کربلا سے خطاب فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پر نثار ہوں۔ اللہ اللہ کیا مرتبہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مرزا محمد جان مرحوم (جو بعد غدر ۱۸۵۷ء لکھنؤ سے ٹونک میں آ رہے تھے اور اکثر کوٹہ میں مخدومی ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب جعفری زقبلہ البغنی ہیر سری کے یہاں عشرہ محرم میں پڑھنے کو آتے تھے ابھی چار پانچ برس ہوئے کہ ٹونک میں انتقال کر گئے) میر علی صاحب کے جوانی مجھ سے کہتے تھے کہ میر علی صاحب خواجہ میر درد دہلوی کے نواسے تھے محسن الدولہ نے بہت کوشش کی کہ میر علی صاحب میرے یہاں آ کر پڑھیں مگر وہ نہ گئے۔ اکثر حالات میر علی صاحب کے متعلق مجھے انہیں سے معلوم ہوئے۔ مرزا محمد جان مرحوم اس زمانہ میں خوش گلو اور فن سوزخوانی کے ماہر اُستاد بلکہ اخیر زمانہ میں لاجواب سوزخواں تھے۔ آب حیات میں میر انشا مرحوم کے حالات میں کچھ حال میر علی صاحب کا پروفیسر آزاد مرحوم نے لکھا ہے۔ اور صحیح لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور حکام سُننے کو آتے تھے۔ اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ میر علی صاحب زیادہ تر
منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز رکھتے تھے۔ کہ جن کے کلام میں قدرتی طور پر
سوز بہت ہے۔ اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیہ میر علی صاحب کے پاس لے جاتے
تھے۔ جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی صاحب ایک مرتبہ پڑھ دیتے تھے۔ تمام لکھنؤ
میں اور دُور دُور اُس کی شہرت ہو جاتی تھی۔ مرزا دبیر کی شہرت سُن کر میر علی صاحب نے کہلا
بھیجا۔ کہ میاں اپنے ایک دو مرثئے میرے پاس بھیج دو۔ مرزا صاحب نے شاید تین[۳]
مرثئے یکے بعد دیگرے (۱) باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے (۲) بخدا تاج سر عرش
خدا ہے شبیر (۳) جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر۔ بھیجے۔ اور میر صاحب نے سوز
رکھ کر پڑھے۔ اور خوب رنگ ہوا۔ ان مرثیوں کی زبان اور بندش میر صاحب کو بہت
پسند آئی۔ اتفاق سے ایک روز درگاہ یا کربلا میں کسی شخص نے انہیں مرثیوں میں سے
ایک مرثیہ منبر پر پڑھ دیا۔ میر علی صاحب بھی موجود تھے۔ اُن ذاکر سے پوچھا۔ یہ مرثیہ تمکو
کس نے دیا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب کا نام لیا۔ میر علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔
اپنے کسی بازو یا جوابی کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ صاحبزادے۔ میر علی امام
حسینؑ کے تصدق سے وہ شخص ہے۔ کہ جس مصنّف کا مرثیہ پڑھ دے۔ وہ تمام ہندوستان
میں مستند مرثیہ گو مانا جاتا ہے۔ منشی دلگیر اتنے بڑے مشّاق مرثیہ گو ہو کر جو مرثیہ مجھکو دیتے
ہیں۔ وہ تین برس تک بغیر میری اجازت کے دُوسرے کو نہیں دیتے۔ تم نے یہ مرثیہ جو
میر علی کو دیا تھا۔ دُوسرے کو کیوں دیدیا۔ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا چاہتے۔ آئندہ
اگر تمکو یہ منظور ہو۔ کہ تمہارا کلام میر علی پڑھے۔ اور تم مرثیہ گو مستند ہو۔ تو جو مرثیہ مجھکو دینا
وہ تین برس تک دُوسرے کو نہ دینا۔ مرزا صاحب نے یہ پیام سُن کر (اُن بازو یا جوابی کو)
جواب دیا۔ کہ میری طرف سے اداب عرض کیجئیگا۔ اور عرض کیجئیگا۔ کہ آپ اوّل[۱] تو سید
دُوسرے[۲] بزرگ۔ تیسرے[۳] ذاکر۔ ہر طرح واجب التعظیم ہیں۔ میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں

مگر یہ جو ارشاد ہوا۔ کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو۔ تو جو مجھے مرثیہ دینا وہ تین سال تک دوسرے کو نہ دینا۔ اس کا یہ جواب ہے۔ کہ ؎

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت[۱] ✦ حقا کہ با عقوبت دوزخ برابرست

مَیں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں۔ تو امام حسینؑ کی امداد اور اپنی محنت و طبع خداداد سے۔ اور یہ بات شاید میری مروت سے بھی دور ہوگی۔ کہ کوئی ذاکر وغیرہ مجھ سے مرثیہ مانگے۔ اور مَیں یہ کہکر اُس کی دل شکنی کروں۔ کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں۔ اس لئے مرثیہ مَیں نہیں دے سکتا مجھ سے یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ مَیں مجبور ہوں ✦

اُس دن سے پھر میر علی صاحب نے مرزا صاحب کی تصنیف کوئی اور مرثیہ نہیں پڑھا۔ مگر تین مرثیوں کے پڑھنے سے مرزا صاحب کے کلام نے ایسا اُن کے دل پر اثر ڈالا تھا۔ کہ اُن کا دل مرزا صاحب کی بندشوں اور دلکش اور دردانگیز الفاظ اور اشاروں کو یاد کیا کرتا تھا۔ اپنی وضعداری سے مجبور تھے۔ آخر الامر یہ ترکیب کی۔ کہ مرزا صاحب کے اصلاحی مرثیوں پر (جو مرزا صاحب کے شاگرد کہتے تھے) منگا منگا کر سوز رکھے۔ اور پڑھے۔ چنانچہ یہ مرثیہ ع بے چین تھی صغرا جو فراق پدری سے۔ بشیر (رام پرشاد)[۲] سے منگوایا۔ اور سوز

شاگرد مرزا دبیر کا مرثیہ میر علی صاحب نے سوز میں پڑھا۔

---

[۱] اس شعر کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ دُوسرے کی کوشش و محنت کی بدولت جنت میں بھی آدمی گیا تو غیرتمند کیواسطے وہ دوزخ کے برابر ہے۔ سچ ہے اپنے اعمال سے جنت میں بھی جانا اچھا ہے۔ یا خدا کی رحمت دستگیری کرے ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] رام پرشاد بشیر نواب افتخار الدولہ مرحوم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ سلام و مرثیہ کہتے تھے۔ منا ہے۔ کہ جب یہ مرثیہ بشیر نے مرزا صاحب کے روبرو اصلاح کو پیش کیا۔ تو اُس کے مطلع ہی میں ایک لفظ نظر آئے جسکو مرزا صاحب ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اور وہ لفظ نتھ اُٹھ تھے۔ چنانچہ پورا بند مطلع کا یہ ہے ؎ بے چین تھی صغرا جو فراق پدری سے۔ نت اُٹھ یہی کہتی تھی نسیم سحری سے ✦ اے باد صبا مرتی ہوں درد جگری سے۔ کہیو جو ملے تو مرے بابا سفری سے ✦ نرگس کی طرح چشم سوئے در نگراں ہے۔ جلد آؤ کہ ہستی کا چمن صرف خزاں ہے ✦ مرزا صاحب نے فرمایا۔ نت اُٹھ تو ٹکسال باہر ہے۔ نت نیا صرف ایک محاورہ ہے جس کو بعض شعرا وقت ضرورت باندھتے ہیں۔ بشیر نے عرض کی حضور مَیں کالستہ ہوں

رکھ کر پڑھا۔ جو آج تک بعض سوزخواں پڑھتے ہیں۔ ازبسکہ یہاں ایک نامی گرامی سوزخواں کا ذکر آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اور بھی چند سوزخوانوں کا حال لکھوں۔ اور یہ بھی کہ مرزا صاحب کے مرثیے سوزخوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں +

سُنا ہے۔ کہ میر علی صاحب کا شہرہ کمال سُن کر میر احمد صاحب لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ کے لئے تشریف لائے۔ یہ بھی علم موسیقی میں یکتائے فن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ایک آنکھ کچھ دبا کر دیکھتے تھے۔ لوگ کانا کہتے تھے شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم نے کس خوبصورتی سے اس عیب کی طرف ایک مرثیہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ جو قابل داد ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ع میر احمد کانِ علم موسیقی۔ مگر میر احمد صاحب کے لکھنؤ میں آتے ہی میر علی صاحب نے بستر اُٹھایا۔ سچ ہے ۔

عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر + کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

میر علی صاحب کے بعد تین سوزخوانوں نے نام نکالا۔ (۱) میر احمد صاحب۔ (۲) احمد علی خاں صاحب۔ (۳) میر زکی صاحب۔ میر احمد صاحب نے عموماً مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوزخوانی کے لئے چھانٹا۔ حسب ذیل مرثیوں پر ان کے سوز رکھے ہوئے سُنے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اس لفظ سے میری اصلی زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کو میرا تمغائے قومی سمجھ کر رہنے دیجئے۔ مرزا صاحب نے رہنے دیا۔ یہ بشیر تو مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ دوسرے بشیر (میر عابد علی صاحب) میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے۔ میر ضمیر صاحب سے صفائی ہو جانے کے بعد وہ بشیر بھی مرزا صاحب ہی کو اپنا کلام دکھانے تھے۔ رام پرشاد بشیر نے شاید اسی خیال سے یہ لفظ رہنے دئے۔ کہ اُن کے مرثیہ کو کوئی شخص میر عابد علی بشیر کا مرثیہ نہ سمجھے + ۱۲ مؤلف

سے مشیر مرحوم کے مرثیوں میں لکھنؤ کے اکثر اہل کمال کا اسی طور پر بیان ہے۔ افسوس کہ اس لعل بے بہا کی کوئی قدر و محافظت نہیں کرتا۔ ہزاروں بازاری محاورات نظم ہیں۔ جو دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے۔ چند روز میں زبان اردو کے طالب چراغ لیکر ڈھونڈینگے۔ تو وہ لعل شب چراغ نہ ملینگے۔ مشیر ارشد تلامذہ دبیر تھے۔ اور تمام اصناف سخن میں ان کا کلام ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر اور اہل علم زمانہ محمد علی شاہ و امجد علی شاہ و واجد علی شاہ میں ایک سے ایک بہتر ان کے شاگرد تھے۔ سراپا سخن ہیں

زرا صاحب کے مرثیے سوزخوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں

میر احمد صاحب سوزخواں

جاتے ہیں۔(۱) آمدِ ہند کا غل عترتِ شبیر ہیں ہے۔(۲) ہند جس وقت محل سے سُوئے زنداں آئی۔(۳) جب یزید اپنے گناہوں سے پشیماں ہُوا۔(۴) دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔(۵) عابد کو جب یزید سے بابا کا سر مِلا۔ میر احمد صاحب کے شاگردوں میں میر علی حسن صاحب اور میر بندہ حسین صاحب۵۴ (دونوں بھائی) بڑے نامی گرامی سوز خواں ہُوئے۔ اِن دونوں صاحبوں کی رئیس مرشد آباد نے بڑی قدر و عزت کی۔ مرشد آباد یا لندن میں یا جہاں کہیں رہے۔ پاس رکھا۔ خصوصاً میر بندہ حسین صاحب کو ایک دم جدا نہ کرتے تھے۔(۱) میر مہدی حسین۔(۲) محمد مرزا خاں۔(۳) سید سجاد حسین۔(۴) نواب اچھے صاحب خویش جناب اوج مدظلہ (۵) نادر صاحب۔ یہ سب اس زمانہ کے نامی گرامی سوز خواں بلا واسطہ یا بالواسطہ انہیں دونوں بھائیوں کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔

(۲) احمد علی خاں مرحوم بھی اُس زمانہ میں ایک کامل سوز خواں مشہور تھے۔ یہ مرزا صاحب کے گویا فدائی تھے۔ ان کے یہاں ۱۴-۸ تاریخوں میں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں بڑی دُھوم دھام کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ جس کا مفصل بیان مَیں نے دوسرے مقام پر اسی کتاب میں کیا ہے۔ انہوں نے بھی مرزا صاحب کے بعض سلام اور مرثیوں پر سوز رکھے۔

(۳) میرزکی مرحوم۔ یہ نہایت خوش الحان۔ خوش گلو۔ حسین آدمی سُنے جاتے ہیں۔ واجد علی شاہ مرحوم کے مصاحب ہونے کے سبب سے ان کی بڑی شہرت و عزت تھی۔ بڑی دُھوم دھام کی مجلسیں کرتے تھے۔ اور بخشو کاغذی کے تعزیہ کے مقابلہ پر بڑی شان و شوکت سے تعزیہ اُٹھاتے تھے۔ مجلس میں خود پڑھتے تھے۔ اور پلاؤ کی چوٹی دار رکابی

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۳) ابھی مشیر کے بعض تلامذہ نظر آتے ہیں۔ شیعہ پارٹی میں مشیر کی شہرت دبیر و انیس سے کچھ کم نہیں ہے ۱۲۔ مؤلف

۵۴ میر بندہ حسین صاحب مرحوم حقیر مؤلف کے خسر تھے۔ اپنے زمانہ میں اہلِ فن تھے۔ بایں ہمہ ان کے بڑے بھائی میر علی حسین صاحب ان سے بہتر تھے ۱۲۔ مؤلف حقیر۔

ایک مرتبہ تمام حاضرین مجلس کو بٹ جانے کے بعد جو خاص خاص ان کے ملنے والے بیٹھے رہتے تھے (غالباً ان کے کہنے سے بیٹھے رہتے ہونگے) اُن کو دستارخوان بچھوا کر کھانا بھی کھلاتے تھے۔ دُنیا کے لوگوں کا کس نے منہ پکڑا ہے۔ بعض حاسد لوگ یہ کہتے تھے۔ کہ ان کے پڑھنے پر جو لوگ زیادہ روتے ہیں۔ اُن کو یہ ڈبل حصّہ ملتا ہے۔ چنانچہ مشیر مرحوم کے ایک مرثیہ میں اسی خیال کی طرف اشارہ ہے ؎

جس سمت دیکھتا ہوں اُدھر کھاؤ کھاؤ ہے + پٹوائیگا یہ میرزکی کا پلاؤ ہے

ہائے دولت تیری چاٹ بھی نہ رہی۔ مگر زبانوں پر افسانے رہ گئے۔ وہ بھی اب چند روز میں نیست و نابود ہو جائینگے ؎

مٹا حسن خوبان دلخواہ کا + ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرزکی مرحوم کے شاید بھانجے اور شاگرد رشید میر محمود مرحوم اور میر محمود کے فرزند اور یادگار میر علی محمد صاحب مرحوم تھے۔

میر علی محمد بھی مرشد آباد میں ملازم تھے۔ اور بعد میر بندہ حسین صاحب کے یکتائے فن سمجھے جاتے تھے۔ میر علی محمد صاحب بھی مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ وہ سوزخواں بھی بہت اچھے تحت لفظ خواں بھی تھے۔ اور شاید سلام وغیرہ بھی کہتے تھے۔ میر علی محمد صاحب کے بھانجے اور داماد میر منجھو صاحب بھی فی زمانہ سوزخوانی میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ اور سوز واقعی خوب پڑھتے ہیں۔ المختصر یہ سوزخوانوں کے تمام گھرانے اس طرف جھک پڑے اور سبھوں نے مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوزخوانی کے لئے منتخب کیا۔ یہی سبب ہے۔ کہ مرزا صاحب کے مرثئے سوز میں جس کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے کسی مرثیہ گو شاعر کے مرثئے نہیں پڑھے جاتے۔ اور سنا ہے۔ کہ میر بندہ حسین صاحب اور میر علی محمد صاحب کا یہ قول تھا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے الفاظ اور ترکیبیں اور بندشیں سوز میں پڑھنے کے لئے جیسی مناسب واقع ہوئی ہیں۔ دوسرے کی نہیں ہیں۔ مرزا صاحب

کے مرثئے میں یہ ایک آسانی کتنی بڑی ہے۔ کہ ۲۰۰ یا ۱۵۰ بند کے مرثیہ میں سے ۱۵ یا ۱۲ بند سوز میں پڑھنے کو چھانٹ لو۔ مرثیہ بے ربط نہ ہوگا۔ جا بجا مطلع لگے ہوئے ہیں جس مطلع سے چاہو۔ مرثیہ شروع کردو۔ گویا ایک سنہری زنجیر ہے۔ جس کی کڑیاں پیوستہ و مسلسل بھی ہیں۔ اور الگ بھی ہیں حسب ضرورت چند کڑیاں لیکر چھوٹی چھوٹی کئی زنجیریں بن سکتی ہیں۔ ہر زنجیر خود عروس سخن کے لئے زیور بن جاتی ہے۔ ان کا مرثیہ ایسا خوشنما سانچہ ہے۔ جس میں سوز آسانی سے ڈھل جاتا ہے۔ اور جو سوز خواں اس فن کو تھوڑا بھی جانتا ہے۔ وہ بھی ان کے مرثیہ پر سوز آسانی سے رکھ لیگا۔ دُوسروں کے مرثیوں کا مختصر کرنا اور سوز رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں کوئی سوز خواں تحت لفظ خوانوں کی طرح چالیس چالیس پچاس پچاس بند پڑھے۔ تو مضائقہ نہیں۔ اوروں کے مرثیہ بھی خوب پڑھ سکتا ہے۔ عموماً سوز خوانوں کا یہ مقولہ اور عقیدہ ہے۔ کہ جس مجلس کو ہم درہم برہم دیکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ رنگ نہ ہوگا۔ اُس میں ہم مرزا صاحب ہی کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ وہی رنگ دیتا ہے۔ دُوسرے کا مرثیہ رنگ نہیں دیتا۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ فی صدی ۸۰ مرثیہ مرزا صاحب کے سوز میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور اصلی سبب مقبولیت من جانب اللہ ہے۔ سچ ہے۔ ع

قبول خاطر و لطف سخن خداداد ست

باب پنجم
فصل ۱
غزل اور مرزا صاحب

غزلیں بھی ابتدا میں مرزا صاحب نے کہیں۔ اور کثرت سے کہیں۔ مگر خود ہی اُن کے عدم شہرت کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے +

دُنیا کے شاعر متمنی رہتے ہیں۔ کہ ارباب نشاط اُن کی غزلیں گائیں۔ مگر مرزا صاحب اس سے بھاگتے رہے۔ سُنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی غزلوں کے تین دیوان تھے۔ اُن میں سے ایک یا دو دیوان میر بادشاہ علی بقا مرحوم اُس زمانہ میں مانگ لائے تھے۔ جب وہ مشق سخن کرتے تھے۔ باقی ایک یا دونوں دیوان مرزا صاحب نے تلف کردئے۔ وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب مرحوم کے یہاں (مکان لکھنؤ شاہ گنج میں)

جب آگ لگی۔ جب اور اسباب کے ساتھ جل گیا۔ آج مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہیں ملی۔ جو مَیں بالیقین کلام دبیر مرحوم کہکر ناظرین کے سامنے پیش کروں۔ اُن کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ اُن کی غزلیں گائی جائیں۔ چنانچہ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ قبل غدر ۱۸۵۷ء ایک شادی میں جناب مرزا صاحب بھی شریک تھے۔ مَیں بھی تھا۔ ازبسکہ محفل میں ارباب نشاط بھی تھے۔ صاحبِ خانہ نے ثقہ آدمیوں کے واسطے علیحدہ ایک مکان تجویز کر دیا تھا۔ باقی ہمہ شما سب محفل رقص و سرود میں تھے۔ مرزا صاحب ثقہ آدمیوں میں تھے۔ مجھے دس بجے رات کے بُلا بھیجا۔ مَیں دُوسری محفل میں سے گیا۔ تو دیکھا۔ کہ شعر و شاعری کے نکات بیان ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور مرزا صاحب کو اُس بحث میں محو دیکھکر۔ پھر دُوسری محفل میں چلا آیا جب باتوں سے مرزا صاحب کو فراغت ہوئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ پھر آدمی میرے بُلانے کو بھیجا۔ مجبور پھر مَیں محفل رقص و سرود میں سے گیا۔ فرمایا۔ ہم تو تمکو جنت کی طرف کھینچتے ہیں۔ تم بھاگتے ہو۔ مَیں اُن جناب کی خدمت میں بہت گستاخ تھا۔ عرض کی۔ کیا یہ محفل جنت ہے۔ فرمایا۔ اس وقت ایسی ایسی باتیں ہوئیں۔ کہ تم سُنتے تو رُوح خوش ہو جاتی۔ مَیں نے عرض کی۔ حضرت (حضرت) انما الاعمال بالنیات[1]۔ خدا بڑا بندہ نواز ہے۔ وہ چاہے۔ تو وہاں بھی بخشش کا وسیلہ پیدا کر دے فرمایا۔ توبہ کرو۔ استغفر اللہ محفل رقص کی نسبت ایسا کہتے ہو۔ الغناء اشد من الزناء[2]۔ مَیں نے عرض کی سُنئے تو سہی۔ مَیں تو خدا کی رحمت کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ چاہے۔ تو اُسی جگہ وسیلہ بخشش پیدا کر دے۔ فرمایا۔ بھلا مجھے سمجھائیے تو وہاں کیونکر وسیلہ بخشش ہو سکتا ہے۔ مَیں نے عرض کی۔ مثلاً آپ کا کلام منظوم کوئی طوائف گائے۔ اور ہمارا دل کسی شعر پر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ تو فرمایئے خدا دل کو دیکھتا ہے۔ ظاہر کو نہیں دیکھتا۔

---

[1] یعنی تمام عمل نیتوں کے ساتھ ہیں جیسی نیت ہوگی۔ ویسا ہی پھل ملیگا۔ یہ مشہور حدیث ہے +

[2] یعنی غنا شدید تر ہے زنا سے +

ممکن ہے گناہ بخش دے۔ فرمایا۔ یہ تو بناء فاسد علے الفاسد ہوئی۔ جب گانا حرام ہے
تو جو اشعار گائے جائینگے۔ چاہے وہ معرفت ہی میں ہوں۔ باعث مغفرت نہیں ہو سکتے۔
اور یہ کیا آپنے فرمایا۔ کیا میری غزل کسی طوائف نے گائی تھی۔ میں چپ ہوگیا۔ فرمایا سچ
کہو۔ مَیں نے کہا۔ جی ہاں۔ اور اُس غزل کا مطلع سُنا کر کہا۔ یہ غزل حسین باندی طوائف
نے گائی تھی۔ مرزا صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور کچھ وظیفہ پڑھ کر نماز شب پڑھنے
کے لئے کھڑے ہو گئے۔ خیر رات گئی بات گئی۔ دُوسرے دن جو مَیں نو دس بجے پہنچا۔
تو اُن کے آدمی نے کہا۔ کہ دیوان خانہ میں مرزا صاحب ہیں۔ اور حسین باندی طوائف ہے۔
کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ چاہے جائیے چاہے نہ جائیے۔
مَیں اُلٹے پاؤں پھر آیا۔ مگر دل میں کہتا تھا۔ کہ یا تو مرزا صاحب نے میرے قول کی تصدیق
کی غرض سے حسین باندی کو بُلایا ہوگا۔ یا اُس سے سیدھے سادے طور پر اپنی غزل سُنی
ہوگی۔ دُوسرے روز جو مَیں شاہ گنج میں ہو کر نکلا۔ تو حسین باندی کا لڑکا ملا۔ اُس نے
حسین باندی کا یہ پیام دیا۔ کہ آپ اجازت دیں۔ تو مَیں کسی وقت حاضر ہوں۔ مَیں نے
کہا۔ اچھا پانچ بجے شام کو آنا۔ شام کو جب وہ آئی۔ تو مجھ سے کہا۔ میر صاحب آپنے
مرزا صاحب سے یہ ذکر کر دیا۔ کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی۔ مَیں بولا۔ ہاں باتوں باتوں
میں مَیں نے کہا تو تھا۔ پھر کیا ہوا؟ کہا۔ مرزا صاحب نے اول تو مجھ سے پوچھا۔ تمکو میری
غزلیں یاد ہیں؟ مَیں نے جواب دیا۔ بس ایک غزل۔ اُنہوں نے مطلع پوچھا۔ مَیں نے
مطلع پڑھ دیا۔ پوچھا کے شعر یاد ہیں؟ مَیں بولی۔ نو دس شعر۔ پوچھا رات کو یہ غزل گائی
تھی؟ مَیں نے کہا۔ جی ہاں۔ یہ سُن کر وہ گھر میں اُٹھے ہوئے چلے گئے۔ اور ایک توڑہ
پانچسو روپیہ کا ایک رومال میں باندھ کر لائے۔ مجھ سے فرمایا۔ یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ
لو۔ آج سے اس غزل کو نہ گانا۔ مَیں نے بہتیرا کہا۔ کہ مَیں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤنگی۔

*۔ یعنی فاسد کی بُنیاد فاسد پر ہے +

آپ روپیہ رہنے دیجئے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا۔ نہیں۔ اب مَیں یہ روپیہ نکال چُکا۔ تم اس کو کسی کارِ خیر عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا جب قسم دیکر مجھے مجبور کر دیا۔ تو مَیں وہ توڑہ ڈولی میں رکھ کرلے آئی۔ اس حکایت کے لکھنے سے غرض یہ ہے۔ کہ خود مرزا صاحب نے کوشش کی۔ کہ اُن کا عاشقانہ کلام نہ مشہور رہو۔ اور ارباب نشاط نہ گائیں اور اُن کی خواہش و کوشش پُوری ہوئی ؛

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

فصل ۱۰ مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں حسبِ ذیل معلوم ہوئی ہیں:۔

(۱) ملکہ زمانی کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں عشرہ محرم میں بڑی شان و شوکت کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ بیگم نصیر الدین حیدر کی محل خاص تھیں[۱]۔ اور مرزا صاحب سے اعتقاد رکھتی تھیں۔ ان کے یہاں سے مرزا صاحب کو ماہواری تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اور مرزا صاحب کی سفارش پر سالانہ لاکھوں روپیہ اہل حاجت کو ملا کرتا تھا۔ ان کی فیاضی کا لکھنؤ میں شہرہ ہے۔ ان کی بیٹی سلطان عالیہ شاعرہ اہلبیتؑ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں۔ جو نواب ممتاز الدولہ مرحوم کی زوجہ تھیں ؛

(۲) افتخار الدولہ مرحوم کے یہاں جناب میر ضمیر مرحوم اور مرزا صاحب پڑھتے تھے جنکا ذکر خیر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بڑے خوش اعتقاد رئیس تھے۔ اور بڑے سخی رئیس گذرے ہیں[۲] ؛

---

[۱] جلد ۲ تذکرہ خم خانہ جاوید میں ان کا حال نصیر الدین حیدر بادشاہ دوئم اودھ کے حال میں لکھا ہے۔ کہ جس سے انکی دولت و ثروت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] افتخار الدولہ کی سخاوت کی مدح میں مرزا صاحب کی تصنیف میں ایک باعی ملی ہے وہ یہ ہے ؎ اس در پہ ہر ایک شاد ماں رہتا ہے۔ خنداں گل امید یہاں رہتا ہے۔ ہر فصل میں دست افتخار الدولہ نیساں کی طرح گہر فشاں رہتا ہے۔ آخر عمر میں یہ بزرگوار کربلائے معلیٰ میں جا کر بڑے حضرت (امام حسینؑ) کے کلید بردار ہو گئے تھے۔ وہیں سے سیدھے جنت میں گئے۔ ع کیا سخاوت کا ثمر پایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) حسین علی خاں اثر مرحوم خلف مرزا جعفر بیگ نائب آصف الدولہ کے یہاں تمام چہلم کی مجلسیں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ پھر جب عہد امجد علی شاہ میں میر انیس مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ تو ایک دن میر صاحب اور ایک دن مرزا صاحب اُن کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھے۔ یہ نواب خود بھی شاعر تھے۔ اور شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید تھے شیخ ناسخ مرحوم بھی انکے یہاں مجلسوں میں کبھی کبھی آتے تھے۔

(۴) میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقعہ لکھنؤ چوک میں پہلے تو پچیسویں کی مجلس میں مرزا ضمیر صاحب پڑھا کئے۔ پھر عہد محمد علی شاہ مرحوم سے مرزا دبیر صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ اور مدۃ العمر ۲۵ رجب اور ۲۵ ذیقعد کی مجلس میں پڑھا کئے۔ یہ دونوں مجلسیں بڑی شان و شوکت اور مجمع کثیر کے ساتھ ہوتی تھیں بعد زمانہ غدر میر اعظم علی مرحوم نے ۲۵ رجب کی ایک مجلس مقرر فرمائی۔ جو چوبٹیوں پر ہوا کرتی تھی۔ وہ مجلس اسی مجلس کے مقابلہ پر میر صاحب کے طرفداروں نے مقرر فرمائی تھی۔ اور میرے ہوش میں اُس مجلس میں میر خورشید علی صاحب نفیس دلآرام کی بارہ دری میں پڑھتے تھے۔ لمؤلفہ

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں ✦ کیسی کیسی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں

یہ مجلسیں بحمد اللہ آج تک دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ میں جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور اُدھر دولھا صاحب پسر میر نفیس مرحوم پڑھتے ہیں۔

(۵) وزیر خاں داروغہ دیوان خانہ شاہ اودھ کے یہاں (مفتی گنج احاطہ مرزا علی خاں میں) ہر مہینہ کی تئیسویں کو عہد واجد علی شاہ مرحوم میں مرزا صاحب اور اُن کے مقابلہ پر محمد خاں داروغہ فیل خانہ شاہی کے یہاں اُسی تاریخ اُسی محلہ میں میر صاحب پڑھتے تھے۔

(۶) جواہر علی خاں خواجہ سرائے ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں محلہ گولا گنج میں ہر مہینہ کی بائیسویں کو اور نواب ناظر فیروز الدولہ خواجہ سرائے شاہی کے یہاں ہر مہینہ کی بارھویں کو مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ فیروز الدولہ کا مکان بھی گولہ گنج میں اُس ترابہ سڑک پر تھا جہاں

سے اب ایک سڑک شفاخانہ ورنبجے سنگھ کو جاتی ہے۔ یہ مجلسیں بھی عہد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ہُوا کرتی تھیں۔ اب نہ مکینوں کا نام ونشان ہے۔ نہ کوئی مکان ہے۔ خدا کی شان ہے۔ لمؤلفہ

فلک نے پیس کے برباد کردئے وہ محل ✢ اجل یہ کس کی نظر کھا گئی مکینوں کو

(۷) ہر مہینے کی گیارھویں کو جو مرزا صاحب کی ولادت کا دن ہے خود مرزا صاحب کے مکان پر مجلس برسوں ہُوا کی۔ اور اب اُن کی قبر پر تیسویں یا پہلی کو (بروز وفات) مجلس ہوتی ہے ✢

(۸) ہر مہینے کی تیرھویں کو اور ماہ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علی خاں سوز خواں مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے۔ اُدھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انہیں تاریخوں میں میر صاحب پڑھتے تھے ✢

چنانچہ جناب مجتہد العصر مولانا السید علی حسن صاحب قبلہ علامہ جائسی مدظلہ العالی یک سال کی اٹھارھویں ماہ صفر کی نسبت یُوں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ احمد علی خاں مرحوم زمانہ شاہی میں قریبًا پچاس مجلسیں کیا کرتے تھے۔ امام باڑہ آغا باقر مرحوم کے قریب اُن کا مکان تھا۔ جو مکانات اب بالکل کھد گئے ہیں۔ ہر روز اُن کے یہاں ایک ذاکر کامل پڑھتا تھا۔ اٹھارھویں صفر کو پچاسویں مجلس ہوتی تھی۔ اُس مجلس میں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ اور کچھ فاصلہ پر میر صاحب حیدر خاں مغفور کے یہاں پڑھتے تھے۔ دونوں مجلسیں بالمقابل ایک وقت پر ہوتی تھیں۔ میں اور میرے اُستاد جناب سیّد العلماء (سیّد حسین عرف میرن صاحب قبلہ علیئین مکان طاب ثراہ) بھی احمد علی خاں کے یہاں شریک ہُوا کرتے تھے۔ ایک روز مرزا صاحب مرحوم حیدر خاں کے یہاں کچھ پہلے پڑھ چکے۔ تو وہاں کے اکثر سامعین بھی یہاں آئے۔ یہاں یہ آدمیوں کی کثرت تھی۔ کہ زانو بدلنا مشکل تھا۔ اُوپر نیچے کے تمام مکانات شائقین سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک کنواں جو صحن مکان میں تھا۔ اُس پر تخت پڑا ہُوا تھا۔ اور

اُس تخت پر بھی آدمی تھے۔ جب آدمیوں کے بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر لگا دی تھی۔ اب جو دوسری مجلس کے آدمی آئے اُنھوں نے باہر سے زور لگایا۔ تڑاق سے زنجیر ٹوٹ گئی۔ اکثر آدمی اندر چلے آئے۔ آدمیوں کے جزرو مد سے ایسا کچھ تلاطم ہُوا۔ کہ مرزا صاحب منبر پر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ بالآخر جہاں تہاں کر کے اُس مجمع کو بھی مجلس میں لے لیا۔ مجلس تو برہم ہو چکی تھی۔ مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال۔ بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں۔ کہ مجلس ہمہ تن گوش تھی۔

(رباعی ۱)

یاں مجھ کو بچھانا تھا ضرور آنکھوں کا + اس پردے میں تھا عین سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ + آنکھوں کے عوض بچھاؤنگا نور آنکھوں کا

(رباعی ۲)

ہر عضو سے سر بلند گو آنکھیں ہیں + پر فرش کی ہو کمی تو لو۔ آنکھیں ہیں
کس کس کے زیر پا بچھاؤں ہیں دبیر + ہم چشم بہت ہیں اور دو[2] آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اور حسینوں لوگوں میں اُس مجلس کے چرچے ہُوا کئے +

اس مجلس میں مرزا صاحب ہمیشہ ایک رباعی اس قافیہ و ردیف میں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ حقیر آیا ہے۔ دبیر آیا ہے۔ چنانچہ دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں جو رباعیوں کی جلد ہے، جس قدر رباعیاں اس ردیف و قافیہ میں ہیں۔ وہ اسی مجلس کی نسبت ہیں۔ دو[2] تین[3] رباعیاں اس موقع پر لکھتا ہُوں:۔

(۱) تیرھویں تاریخ کی مجلس کی نسبت ہے

کیوں آج یہ انبوہ کثیر آیا ہے + ہاں حضرت مقبل کا نظیر آیا ہے
ہو گا مہ چاردہ کا منبر پہ کمال + تاریخ ہے تیرھویں[13] دبیر آیا ہے

(رباعی ۲)

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + ہونے کو مرید چرخ پیر آیا ہے
چودہ معصوم کے موالی ہیں جمع + تاریخ ہے تیرھویں دبیر آیا ہے

رباعی (۳) اٹھارھویں کی مجلس کی نسبت فرماتے ہیں

مضمون سے وہ معنیٔ پرضو نکلا + ٹھنڈا جس سے قمر کا پرتو نکلا
ہر مصرعِ گُنبہ کی چمک پر یہ غل + اٹھارھویں تاریخ مہ نو نکلا

انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں تو مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ اس مجلس کے آنے والوں سے رستہ میں بعض اُدھر کے آدمیوں نے یہ کہنا شروع کیا۔ کہ آج تو مرزا صاحب احمد علی خاں کی مجلس میں نہیں آئے۔ شاید وہ مجلس آج نہ ہو۔ اس فقرے میں آکر کچھ آدمی جو اس مجلس میں آرہے تھے۔ حیدر خاں مرحوم کی مجلس میں چلے گئے۔ کچھ اپنے گھر پھر گئے۔ بعض آدمی یہاں آئے۔ تو مرزا صاحب کو موجود پایا۔ راہ کی کہانی بیان کی۔ مگر پھر بھی اس مجلس آدمی بہت آگئے تھے۔ مرزا صاحب منبر پر گئے۔ تو اول یہ رباعی پڑھی:۔

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + سُننے کو بھی انبوہ کثیر آیا ہے
کیوں راہ میں بہکاتے ہیں مشتاقوں کو + یہ کون ہے۔ جو نہیں دبیر آیا ہے

ایک سال اس مجلس میں مرزا صاحب پڑھ رہے تھے۔ کہ یکایک بہت سے آدمی آگئے۔ اُن میں سے اکثر نے قریب منبر جانا چاہا۔ جو لوگ پہلے سے منبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو بُرا معلوم ہؤا۔ آپس میں تکرار ہوگئی۔ قریب تھا کہ مار پیٹ کی نوبت پہنچے۔ کچھ لوگوں نے اصلاح کرادی۔ اتنی دیر میں مرزا صاحب نے منبر پہ یہ رباعی کہہ لی۔ اور جب اہل مجلس مطمئن ہوئے۔ تو یہ رباعی پڑھ کر پراگندہ مجلس کو متوجہ کر لیا۔ ؎

دریائے ثواب میں تلاطم۔ کیسا + مجلس میں تاخُّر و تقدُّم کیسا
بھیجا ہے غبار اشکباروں کے لئے + پانی موجود ہے۔ تیمم کیسا

قبلہ وکعبہ فرماتے ہیں۔ کہ افسوس جب زمانہ شاہی نہ رہا۔ اور احمد علی خاں مرحوم کی بھی وہ حالت نہ رہی۔ اور اٹھارھویں صفر کی مجلس ہوئی۔ تو اُس مجلس میں بھی میں شریک تھا۔ یہ چھوٹی سی مجلس تھی۔ حاضرین وہ مجمع عہد شاہی یاد کر کے افسوس کر رہے تھے۔ کہ مرزا صاحب نے منبر پر جاکر یہ رباعی حسب حال پڑھی۔ جو غالبًا فی البدیہہ کہی تھی +

(رباعی)

پھر چرخ پر آسمان پیر آیا ہے + ہر کوچہ میں وقت دار و گیر آیا ہے

اگلا سا نہ مجمع ہے نہ اگلے سے وہ لوگ + یاں آن کے حیرت میں دبیر آیا ہے*

احمد علی خاں مرحوم کے یہاں کی یہ گویا آخری مجلس تھی۔ ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو + بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۹) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم بھی مرزا صاحب کے ایک معتقد بلکہ فدائی بالواسطہ وبلاواسطہ شاگرد تھے۔ یعنی اوّل اوّل وہ شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر خود مشیر مرحوم نے ان کو مرزا صاحب کا شاگرد کرا دیا تھا۔ غزل میں یہ جناب اسیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ کہ مرزا صاحب کو غزل پر اصلاح دینے کی فرصت نہ ہوتی تھی یہ غدر ۱۸۵۷ء میں کمپنی کے خیر خواہ رہے تھے۔ کئی معزز انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ اس صلہ میں گورنمنٹ سے معقول انعام ملا تھا۔ ان کے حالات ان کے فرزند ارجمند میر امیر حسن صاحب فروغ سلمہ اللہ و ابقاہ نے جو مجھے لکھ کر بھیجے ہیں۔ وہ حال تلامذہ مرزا صاحب میں ملاحظہ فرمائیگا۔ یہاں یہ لکھنا ہے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء ان کے یہاں محلہ گولہ گنج میں ہر سال اکیسویں ماہ رمضان کو مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ انکا امام باڑہ

*یہ رباعی دفتر ماتم کی جلدوں میں نہیں ہے۔ محض قبلہ وکعبہ کے ذریعہ سے حقیر تک پہنچی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ہمارے سر پر ان نائب امام کا سایہ رہے۔ اور میرے عنایت فرما قبلہ وکعبہ کے بھتیجے اور شاگرد جناب منشی احمد رضا صاحب جائسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے یہ حالات قبلہ وکعبہ کے ارشاد کے موافق انکی زبان سے سنکر اور لکھکر مجھے بھجوائے۔ تاکہ میں اس کتاب کی رونق بڑھاؤں اور اس میں درج کروں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بہت بڑا ہے۔ وہ سب آدمیوں سے بھر جاتا تھا۔ ان کے یہاں بعض مجلسوں میں حقیر شریک ہوا ہے[۱]۔

(۱۰) داروغہ شیخ محمد عباس صاحب (والد مرحوم شیخ علی عباس صاحب وکیل) کے یہاں کنکر کے کنوئیں پر میر انیس صاحب مرحوم اور اُسی کے قریب خان بہادر شیخ الطاف حسین صاحب مرحوم کے یہاں ۱۸ صفر کو مرزا صاحب مغفور پڑھا کرتے تھے[۲]۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء یہ مجلسیں بھی ہوتی تھیں۔ حقیر ان بعض مجلسوں میں بھی شریک ہوا ہے۔ اور یہ مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ پڑھنے والے نہیں ہیں۔ بقول میر انیس مرحوم ؎

پھولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں ✤ افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

(۱۱) نواب ممتاز الدولہ مرحوم (داماد نصیر الدین حیدر شاہ دوم اودھ) بھی مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں بھی اربعین میں کبھی ایک کبھی دو مجلسیں مرزا صاحب ہر سال پڑھا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں حقیر بھی شریک ہوا تھا ✤

(۱۲) بابو بینی پرشاد وکیل ہائی کورٹ آگرہ سے لکھنؤ میں گئے تھے۔ اور نواب آغا علی خاں عرف آغا ے صاحب (ناظم صاحب) سے درخواست کی تھی۔ کہ مجھے

---

[۱] اسی مجلس کی کیفیت میں اُوپر مخدومی میر دستور علی صاحب بلگرامی سکرٹری جناب راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبانی اس کتاب میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] میرے مکرم مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کے یہ خسر تھے اور شفاق حسین صاحب خاں بہادر مرحوم کے فرزند ہیں وہ اب اٹھارھویں صفر کی مجلس کرتے ہیں۔ مدت تک جناب مرزا اوج صاحب کو وہ بھی پڑھوا لیا کئے۔ مگر ایک سال امروہہ کے سادات نے مجھ سے ان کی اجازت چاہی کہ عشرۂ دویم صفر میں جناب مرزا اوج صاحب کو ہم امروہہ لے جائیں اور وہاں پڑھوائیں وہ جناب آپکی مجلس کے خیال سے نہیں جاتے۔ انھوں نے اُن سادات کی مجالس عزا کو اپنی مجلس پر مقدم رکھکر مرزا اوج صاحب قبلہ سے عرض کر کے اُن کو امروہہ بھجوایا۔ اور خود اپنی مجلس میں حدیث خواں کو پڑھوایا چنانچہ اب اس مجلس میں حدیث خوانی ہوتی ہے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

مرزا صاحب کو سُنوا دیجئے۔ چنانچہ آغائی صاحب نے کہ یہ بھی مرزا صاحب کے معتقد تھے ایک بہت بڑی مجلس کرکے مرزا صاحب کو پڑھوایا تھا۔ حقیر کو یہ مجلس یاد تو ہے۔ مگر میں اس میں شریک نہیں ہؤا +

(۱۳) شاہ پنجم اودھ واجد علی شاہ مرحوم کے یہاں مجلس عشرہ محرم میں بھی مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اور شاہ مرحوم وہ عزت افزائی فرماتے تھے۔ جو کسی بادشاہ نے آج تک کسی شاعر اہلبیت کی بھی نہ کی ہوگی۔ بھلا معمولی شاعروں کا تو کیا ذکر ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کہ شاعروں کا عروج بادشاہوں کی بدولت ہؤا کرتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا عروج بادشاہانِ دین و دُنیا ائمہ اطہارؑ اور شہدائے کربلا کے سبب سے ہؤا۔

چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

خاقانی و فردوسی و سعدی و نظامی — شاہوں کی مدد سے ہوئے آفاق میں نامی

عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی — دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے خطِ غلامی

ہیں وہ ہی دبیر اس میں نہیں ایک کو شک ہے

منبر مری جاگیر مقام اُس کا فلک ہے

فصل ۳ حکایت مرزا صاحب کا بادشاہ اودھ کو خداوند کہنا

علامہ جائسی مدظلہ العالی کے ارشاد سے معلوم ہؤا کہ مرزا صاحب ایک مجلس میں واجد علی شاہ مرحوم کے روبرو جب گئے۔ تو باتوں میں اُنھوں نے معمولی لفظ خداوند جو لکھنؤ کے اہل دربار کا تکیہ کلام تھا نہیں کہی*۔ جب بعد ختم مجلس مرزا صاحب چلے آئے۔ تو بادشاہ سے ایک مصاحب خاص نے تخلیہ میں عرض کی۔ کہ جہاں پناہ کی نسبت لفظ خداوند کہنے میں شاید مرزا صاحب کو کچھ اکراہ ہے۔ عالی ظرف بادشاہ نے اُنکی بات کو ٹال دیا۔ کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز کی مجلس میں منبر پر مرزا صاحب نے یہ دو

* اسی طرح راجپوتانہ میں عام طور پر راجاؤں کو اہل دربار اَن داتا کہتے ہیں جس کے لفظی معنی رازق کے ہیں۔ یہ لفظ خداوند سے بھی بڑھ کر ہے۔ بحمد اللہ حقیر نے ۲۹ برس کی ملازمت میں کبھی یہ لفظ نہیں کہی ۱۲ مؤلف حقیر

رباعیاں پڑھیں۔

(رباعی ۱)

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں + یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر + بندوں کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

(رباعی ۲ منقبت میں)

حیدرؑ کو غنی سب کو غرض مند کہوں + بیحد ہیں شرف ان کے میں تا چند کہوں
ہے شیرِ خدا میں بخدا شانِ خدا + اس بندے کو سو بار خداوند کہوں

بادشاہ مرحوم نے اُن مصاحب خاص کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا۔ سُنئے؟ کیوں! اِن شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے یا نہیں۔ کچھ سمجھے۔ اُن مصاحب نے عرض کی بیشک۔ جب بعد اختتام مجلس اُن مصاحب سے ایک رازدار نے پوچھا۔ کہ آپ سے بادشاہ نے کیا فرمایا تھا۔ تو اُنہوں نے کہا۔ کہ کل میں نے تخلیہ میں بادشاہ سے عرض کیا تھا۔ کہ مرزا صاحب حضور کو خداوند نہیں کہتے۔ شاید اُن کو یہ لفظ کہنا مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ اور میرے اور بادشاہ کے سوا تیسرے شخص کو اس بات کا علم نہ تھا۔ مرزا صاحب نے آج گویا وہی مضمون نظم کر کے پڑھ دیا۔ اُس کل کی بات کا جہاں پناہ نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ ان شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اکثر ایشیائی شاعروں کے کلام بادشاہوں اور دولتمندوں کی بیجا خوشامد میں ہیں۔ انہوں نے اپنی فطرتی شاعری کو مال دُنیا کے لالچ میں آکر ضائع کر دیا جس کی مثالیں تاریخوں اور تذکروں میں اہل علم کو کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر مرزا صاحب نے اپنی شاعری کا صحیح مصرف خوب سمجھا۔ اور قانون فطرت کے مطابق (جو رضائے خدا کا گویا پرتو ہے) شاعری کو اس خوبصورتی سے صرف فرمایا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شاعر کا کمال یہ ہے۔ کہ وہ عالم مادی وغیر مادی کے واقعات کو رضائے خدا کے مطابق بیان کرے مرزا صاحب نے

دونوں قسم کے مضامین کو بہت خوبی و خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ صبح۔ شام۔ گرمی۔ تہذیب۔ عدالت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ صبر۔ علم۔ رضا۔ تسلیم۔ حلم۔ تواضع و انکسار۔ توحید۔ عدل۔ نبوت۔ امامت۔ معاد کی مدح میں کلام کے دریا بہا دئے ہیں۔ بادشاہ اور امیروں کے دربار میں جانے سے وہ اکثر پرہیز کرتے تھے۔ اور جب جاتے تھے۔ تو اپنے معمولی لباس سے جاتے تھے۔ اور معمولی بات چیت فرماتے تھے۔ دُنیا کے لالچ سے کبھی کوئی کلمہ خلاف حق نہیں کہتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

سرکار سلاطین سے سروکار نہیں ✦ جز مجلس مولا کوئی دربار نہیں
مدّاح ہوں میں امام بے سر کا دبیر ✦ سامان کیسا کہ سر بھی درکار نہیں[1]

خوشامد بیجا کرنیوالوں کی مذمت

ایک مقام پر وہ بے جا خوشامد کرنے والوں کی مذمت حسب ذیل فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

پیش امرا طالب زر جھکتے ہیں ✦ سجدے کی طرح مجرئی کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح ✦ ہو مال سدا جدھر۔ اُدھر جھکتے ہیں

اگر کسی بادشاہ یا امیر کی مدح بھی کبھی کی۔ تو جب کہ اُس کو اُس مدح کا اہل و مستحق پایا چنانچہ امجد علی شاہ مرحوم کی مدح میں چند بند اُن کے مرثیہ (طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے[2]) میں موجود ہیں۔

---

[1] سر و سامان ایک معمولی لفظ ہے۔ اس کے دو ٹکڑے کس خوبصورتی سے کر کے مضمون پیدا کر دیا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں سب سے پہلے چھپا ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت کے بعد بادشاہ موصوف کی تعریف اور بعض علمائے اسلام و ایمان کی مدح فرمائی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انصاف کھا رہا ہے مگر قول پہ قسم مطلب جو منظم ہے کہ شہرۂ رقم۔ واقف ہے کبریا کہ دروغ دریا نہیں۔ مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں۔ یعنی ایسے نیک نفسوں کی مدّاح کو مرزا صاحب عین رضائے خدا کے مطابق (مقصد) سمجھتے تھے۔ اس لئے تعریف کی ہے۔ اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُن دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح و ثنا کے قابل سمجھتے تھے۔ اس لئے مدح کی۔ کہ دُوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔ بے جا خوشامد و طمع کے زنگ سے اپنی آئینہ شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس نیک نیتی کا پھل اُن کو دنیا میں خدا نے یہ دیا۔ کہ بادشاہ نے گویا اُن کی خدمت کی۔ چنانچہ شمس الضحےٰ میں جو زمانہ شاہی کی ایک تصنیف فارسی کی ہے۔ یہ واقعہ لکھا ہے۔ اور مَیں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔ کہ زمانہ سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ایک روز شاہ مرحوم ممدوح کی مجلس میں مرزا صاحب منبر پر مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بالائے منبر جو شامیانہ تھا اتفاقاً وہ ہوا سے پراگندہ ہو کر ایک طرف ہو گیا۔ مرزا صاحب کے منہ پر دھوپ آگئی۔ فی الفور قدر شناس علم دوست بادشاہ نے چتر طلب فرمایا۔ اور خود قریب منبر چتر لگائے ہوئے کھڑے رہے۔ مرزا صاحب نے بہت عذر کیا۔ مگر فرمایا۔ کہ آپ پڑھے جائیے۔ اور پورا مرثیہ پڑھئیگا۔ مَیں مشتاق ہوں۔ مرزا صاحب نے الامر فوق الادب[1] پر عمل کیا۔ اور مرثیہ پورا پڑھا۔ اللہ اللہ ظل اللہ جس شاعر اہلبیتؑ کے سر پر چتر شاہی لگائیں۔ اُس کی عزت و آبرو کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ اور بادشاہ مرحوم کی قدر شناسی اور تواضع کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ سچ ہے

تواضع ز گردن فرازاں نکوست ✤ گدا اگر تواضع کند خوے اوست[2]

دنیا کے لوگ شاعر کی معراج عزت و کمال اس میں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کسی بادشاہ کا مداح ہو۔

---

[1] یعنی حکم ادب کے اُوپر ہے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مولوی امجد علی صاحب اشہری نے حیات انیس میں صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ پر لکھا ہے کہ حضور نظام دکن میر محبوب علی خاں صاحب مرحوم نے عشرہ چہلم ماہ صفر ۱۳۲۴ھ میں نواب فیاض علی خاں صاحب کے امام باڑہ میں تشریف لیجاکر جناب مرزا اوج صاحب کی اعجاز بیانی کو سماعت فرمایا اور منبر کے سامنے بغیر تکیہ و مسند تکیہ کے آخر مجلس تک بیٹھے رہے اور پھر کشتیاں آنجناب اور خود نیز دوں کی بھجوائیں۔ ایسا موقع اُن کے والد ماجد جناب مرزا دبیر مرحوم کو کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر کوئی اوج نہیں ہو سکتا میں عرض کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کو پورا علم نہ تھا۔ ورنہ وہ یوں لکھتے کہ یہ اوج و اعزاز مرزا اوج صاحب قبلہ کے واسطے گویا موروثی تھا۔ کہ اُن کے والد ماجد کی شاہ اودھ اس سے زیادہ عزت افزائی فرما چکے تھے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر بادشاہ دین و دنیا کی قدر و منزلت کم سے کم یہ ہونی چاہئے۔ کہ خود دنیا کے بادشاہ اُس کے مدح خواں ہوں۔ چنانچہ یہ عزت بھی مرزا صاحب کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح کی بدولت حاصل ہوئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ قریب سنہ ۱۲۹۱ھ[1] کے مرزا صاحب نابینا ہو گئے تھے۔ سنا ہے کہ کلکتہ میں کوئی جرمن کا ڈاکٹر آیا تھا۔ جو آنکھیں بناتا تھا۔ اور وہ مٹیا برج میں بادشاہ اودھ مرحوم کا مہمان تھا۔ شاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے اشارہ سے اُن کے کسی رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ تو آپ کی آنکھیں بن جائیں۔ بادشاہ اودھ کی بھی یہی خواہش ہے۔ مرزا صاحب کلکتہ مٹیا برج میں پہنچ کر بادشاہ مرحوم کے مہمان اور نواب مونس الدولہ کی کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ عرضداشت اطلاعی شاہ جم جاہ کی خدمت میں بھجوائی۔ بادشاہ مرحوم نے عرضداشت کو ان الفاظ دستخط خاص سے مزین فرمایا۔؎

گر بر سر و چشم من بیائی ٭ بر قلب منم کہ کیمیائی

بادشاہ کا مہمان ہونا اور بادشاہ کا استقبال و بازدید کو آنا۔

۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۱ ہجری۔ اور پھر بمقام سلطان خانہ مبارک و سبطین آباد مبارک بادشاہ ممدوح مرزا صاحب کے استقبال کو تشریف لائے۔ اور اپنے ہمراہ مرزا صاحب کو لے گئے۔ اور پھر بازدید کی ملاقات کو جس کوٹھی میں مرزا صاحب ٹھیرے تھے۔ قدرشناس بادشاہ آئے۔ اور اپنی مجلس عزا میں خود بادشاہ مرحوم نے مرزا صاحب کی موجودگی میں برسر منبر مرزا صاحب کی مدح میں تقریباً پچیس ۲۵ بند پڑھے۔ جن میں سے یہ ایک ٹیپ بہت مشہور ہے۔؎

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں ٭ میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

پھر مرزا صاحب کی آنکھیں اُس ڈاکٹر سے بنوائیں۔ فتح چشم کے ساتھ ہی بصارت عود

---

[1] واصل کتاب ضمیمہ شمس الضحیٰ میں سنہ ۱۲۹۱ھ ہی لکھا ہے۔ اس لئے میں نے بھی یہی لکھ دیا۔ مگر میرا خیال و علم یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب اواخر سنہ ۱۲۹۰ھ میں کلکتہ مٹیا برج گئے تھے۔ ۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۰ھ کو یہ عرضداشت مزین ہوئی۔ کہ یہ غالباً سنہ ۱۲۹۰ھ کا اخیر دن تھا۔ اور سنہ ۱۲۹۱ھ میں فتح چشم اُس ڈاکٹر نے کیا۔ چنانچہ آئندہ جو تاریخ عود بصارت کی مرزا صاحب کی فرمائی ہوئی ہے۔ اُس سے سنہ ۱۲۹۱ھ نکلتے ہیں۔ اس سے میرے خیال و علم کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ پس صحیح ۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۰ ہجری ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

کرائی۔ مرزا صاحب نے یہ رباعی تاریخیہ کہکر شکر خدا ادا کیا۔

رباعی تاریخ عود بصارت

امداد علیؑ گاہ خفی گاہ جلی است + بر من ز ازل عین عنایات ولی است

چوں مادہ[۵] دفع شا بگفتم تاریخ + چشم۔ بد دور۔ عین اعجاز علی است[۱]
۱۲۹۱

جب تک لکھنؤ کی سلطنت قائم رہی۔ مرزا صاحب ملک اودھ سے کہیں باہر نہیں گئے۔ باہر سے بہتیرے بلاوے آئے۔ مگر ہمیشہ انکار فرماتے رہے جب کوئی اس کا سبب پوچھتا تھا۔ تو فرماتے تھے۔ کہ ہماری زبان کے جاننے والے یا دہلی میں ہیں یا لکھنؤ میں۔ تیسری جگہ یہ بات کہاں۔ (دہلی ویران ہو چکی تھی۔ وہاں سے کبھی طلب نہیں آئی) یہاں تک کہ زمانہ کی پریشان ہوائے وہ ورق اُلٹا۔ اول سلطنت اودھ جاتی رہی۔ برس ڈیڑھ برس کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ مگر اُس شہر آشوب زمانہ میں مرزا صاحب نہایت مستقل رہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

رباعی غدر ۱۸۵۷ء کے حال میں

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا + گر عدل گئے ظلم گئے جور ہوا

اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر + کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

لکھنؤ سے مرزا صاحب اُس انتشار میں مع اہل و عیال چل کر سیتاپور میں پہنچے۔ اور مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب مرحوم اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم ہوئے۔[۲]

عود بصارت اور اسکی تاریخ

فصل ۶ جبتک سلطنت اودھ قائم رہی مرزا صاحب اودھ باہر نہ گئے

غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب کا استقلال

غدر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور جانا

ف[۱] اس میں نہایت لطیف تعمیہ خارجی مادہ[۵] کے پچاس[۵۰] عدد کا ہے۔ پس ۵۰ عدد کم کرنے سے مصرع آخر سے تاریخ نکلتی ہے۔ ایک تو یہی معنی ہوئے کہ جب ۵ عدد مادہ کے دفع ہوئے تاریخ نکلی۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب مادہ فاسد دفع ہوا۔ جب تاریخ کہی اس صنعت کو صنعت ایہام کہتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

ف[۲] سید کرم فرما عاید وست غلام علی خاں صاحب ساکن لدھیانہ جو اب ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں مقیم اور راوِ سیر میں فرماتے تھے کہ میں جب ۱۹۰۸ء میں سیتاپور میں ملازم و مقیم تھا تو یہ مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب جو قریبا ۷۰ سال کی عمر کے تھے اور بڑے ثقہ

ایک فقیرنی بڑھیا نے اُسی پُر آشوب زمانہ میں مجلس کی۔ اور مرزا صاحب اُسی بے سروسامانی کے عالم میں مرثیہ پڑھے۔ یہ واقعہ آج تک سیتاپور میں مشہور ہے۔ اُسی خانہ بربادی کے عالم میں یہ رباعی بھی کہی تھی۔ جس میں واقعی حالت (خانہ بربادی) کی تصویر کھینچ دی ہے۔

رباعی

شطرنج دورنگی[۳] سے ہیں ششدر بندے ✦ آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل ✦ تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

اسی زمانہ پُر آشوب میں یہ رباعی بھی فرمائی تھی۔

سیارے سے چشم مہر نادانی ہے ✦ اس دور میں دل بھی دشمن جانی ہے
مشکل ہے کہ ہاتھ آئے عنانِ آرام ✦ تبدیلِ فلک ستارہ پیشانی ہے[۴]

بعد غدر واپسی لکھنؤ کی مصائب

پھر لکھنؤ میں امن ہو جانے پر مع اہل و عیال واپس تشریف لائے۔ اور اکثر اپنے دوستوں کی موت اور بربادی کی خبریں سُن سُن کر نہایت ملال کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لکھنؤ میں نہ شاہِ اودھ تھے۔ نہ وہ قدردان امیر۔ اکثر امیر فقیر ہو گئے تھے۔ اکثر سرکاریں مٹ گئیں تھیں۔ اور سامان خانہ داری کے ساتھ اکثر مرثیے بھی لوٹ میں تلف

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اور وہ ضعدار زمانہ شاہی کی تعلیم یافتہ تھے رجب سے ناقل تھے۔ یہ مجلس جس فقیرنی نے کی تھی اُس کے گھر میں ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا تھا۔ اُس نے مرزا صاحب سے معذرت کی کہ میرے پاس اور کوئی کرسی وغیرہ نہیں ہے اور نہ کوئی اچھا مونڈھا ہے مرزا صاحب نے فخریہ اُس مونڈھے پہ بیٹھ کر پڑھا تھا۔ یہ خلق و انکسار مرزا صاحب کا سیتاپور میں آجتک مشہور ہے۔ مخدومی جناب مرزا اوج صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء وہ بڑھیا اکثر لکھنؤ میں آتی تھی اور جناب مرزا صاحب مرحوم اُس سے ہمیشہ مسلوک ہوتے رہتے تھے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] شطرنج دورنگی میں ایک لطیف استعارہ ہے شطرنج کے مہرے عموماً سرخ و سبز دو رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح اکثر خانہ بھی دو رنگ کے ہوتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر

[۴] اکثر لوگ نجومیوں سے اپنا ستارہ دکھلایا کرتے ہیں غالباً اُن کے کسی رفیق نے کسی نجومی سے اپنے ستارہ کے دیکھنے کو کہا ہوگا۔ اُس پر فرماتے ہیں کہ سیارے سے مہربانی کی امید رکھنا نادانی ہے۔ کیونکہ یہ ایسا غدر کا زمانہ ہے کہ جس میں اپنا دل بھی دشمن جان ہو رہا ہے۔

۱۸۵۸ء میں نواب دولھا صاحب کی طلب پر کانپور جانا اُس مجلس میں رباعی پڑھنا

ہو گئے تھے۔ پھر شاید ۱۸۵۸ء میں کانپور کے مشہور ذی علم امیر کبیر نواب دولھا صاحب نے بُلایا۔ وہاں تشریف لے گئے۔ اور عشرہ محرم میں پڑھے۔ ایک رباعی اُس موقع پر اُن نئی نئی صورتوں کو دیکھ کر فرمائی تھی۔ وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

اس بزم میں ارباب شعور آئے ہیں + یہ شیعہ ہیں یا آیۂ نور آئے ہیں
پڑھ مرثیہ لے داد سخن ان سے دبیر + کیا کیا حضرات کانپور آئے ہیں ۵

عظیم آباد جانا

پھر شاید ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد سے سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ نے اپنے بعض اعزہ کو بھیج کر مرزا صاحب کو بُلوایا۔ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی کے آئے ہوئے آباد تھے۔ وہاں زبان و کمال کے جوہر شناس اچھے تھے۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کی آمدنی صرف سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد اور ۳۰ ماہوار وثیقۂ حسینیہ (امام باڑہ) میر باقر تاجر مرحوم اور ایک گاؤں اور کچھ مکانات کے کرایہ کی رہ گئے تھے۔ جو مرزا صاحب ایسے حاتم مزاج کے واسطے کچھ بھی نہ تھی۔ ہر چند پٹنہ عظیم آباد دور جگہ تھی۔ اور شاید اُس زمانہ میں مسلسل ریل بھی نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب کو اہل عظیم آباد کا خلق کھینچ لے گیا۔ اور کبھی بعض رئیسوں کی طلب پر جناب میر انیس مرحوم و میر مونس مغفور و میر ظہیر مرور ۶

جناب میر انیس و میر مونس و میر ظہیر مرحومین کا بھی عظیم آباد میں جانا

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۴) آرام کی لگام ہاتھ آنا مشکل ہے کیونکہ شبدیز آسمان خود ستارہ پیشانی ہے یعنی ستارہ پیشانی گھوڑا عرف عام میں منحوس مشہور ہے۔ آسمان کا ستارہ پیشانی ہونا ظاہر ہے۔ کہ اُس کی پیشانی پر ستارے ہیں + ۱۲ مؤلف۔

۵ کانپور سے لکھنؤ ۴۲ کوس دور ہے مگر رسم و رواج و عادات میں بہت فرق ہے شاید مرزا صاحب نے نہایت مخفی اشارہ اسی کا اس رباعی میں فرمایا ہے۔ مرزا صاحب کے بعد ایک اور ذاکر باکمال (مگر نازک دماغ) لکھنؤ کے کانپور میں انہیں رئیس کے یہاں پڑھنے گئے تھے۔ لوگ مجلس میں منبر سے دُور دُور بیٹھے تھے منبر کے رُو برو سناٹا تھا۔ اُن ذاکر کامل نے فرمایا۔ آپ لوگ دُور ہیں ذرا منبر کے پاس آجائیے۔ تو ایک جاہل دُکاندار بولے۔ کہ آپ اپنا منبر ہی ادھر کچھ سرکا لیجے نا۔ اُن ذاکر نے نواب صاحب سے پوچھا۔ کیا حضور یہی کانپور کی خلقت ہے۔ بھلا لکھنؤ میں ذاکر کے کہنے پر کب ممکن تھا کہ کوئی زیر منبر نہ آجاتا یا ایسا بے تکا جواب دیتا۔ ہائے لکھنؤ! ۱۲ مؤلف حقیر

۶ میر محمد رضا ظہیر مرحوم جو حقیر کے نانا تھے اور مرثیہ پڑھنے میں ایک طرز خاص کے موجد تھے اور ہمیشہ پڑھتے تھے جس طرز کی

اسی سال عظیم آباد تشریف لے گئے تھے۔ یہ پہلا سال تھا جو لکھنؤ کے اتنے باکمال ذاکر لکھنؤ سے باہر ایک مقام پر جمع ہوئے تھے عظیم آباد میں دُور دُور سے لوگ ان کے سُننے کو آئے تھے۔ اکثر کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا کہ نہ لکھنؤ اُجڑتا نہ یہ کامل یہاں آتے۔ یہ سچ ہے۔ (بقول مؤلف) ؎

مضرتوں میں بھی اکثر مفاد ہوتے ہیں + کہیں ملول کہیں قلب شاد ہوتے ہیں

مرزا صاحب یکم محرم کو مجلس موصوف (گلزار باغ پٹنہ) میں منبر پر تشریف لائے۔ اول حمد و نعت و منقبت میں حسب معمول چند رباعیاں پڑھ کر ذیل کی دو رباعیاں اس مضمون میں پڑھیں کہ سفر اہل کمال کے واسطے باعث نقص نہیں ہے۔ بلکہ کمال کو بڑھانے اور چمکانے کا ذریعہ ہے۔ اور گردش فلک آدمی کو سفر پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس فلسفہ کلام کو بغور دیکھئے۔ کیسی تخئیل ہے اور کیسی زبان ہے۔

(رباعی ۱)

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے + اس دور میں جور آسماں سے نکلے

صد شکر کہ شہر لکھنؤ۔ جنت تھا + آدم ٹھہرے[۵] جو ہم جناں سے نکلے

(رباعی ۲)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا + قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا

تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل + شگفتہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۶) تقلید کسی قدر فرق کیساتھ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ بعد (میر مغل صاحب سعید مرحوم و میر ولادحسین صاحب قوی مغفور و میر بادشاہ علی صاحب بقا) نے فرمائی۔ کہ یہ سب صاحب بھی اس خاندان کے اچھے پڑھنے والوں میں تھے۔ (میر محمد رضا) ظہیر مرحوم شاید نواب لطف علی خاں یا ولایت علی خاں کے یہاں پڑھتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۵] آدم ٹھہرے خاص روزمرہ ہے مطلب ہے کہ از بسکہ ہم آدم ہیں آدم کیواسطے جنت سے نکلنا لازم ہے۔ اور ٹھہرے اور نکلے میں صنعت تضاد بظاہر ہے۔ کہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔ حالانکہ ٹھہرے کے یہاں معنی ٹھہرنے کے نہیں ہیں۔ اس کو صنعت ایہام بھی کہہ سکتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۸
پٹنہ میں مرزا صاحب کی قدردانی کے وجوہ

ازبسکہ پٹنہ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی والوں کے جمع تھے۔ جو مرزا صاحب کی زبان کے قدرشناس تھے۔ اور زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کو جوہر شاعری سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب کی اہل عظیم آباد نے ایسی خاطر و مدارات کی۔ کہ پھر مرزا صاحب نے دوسری طرف کا رُخ نہ کیا۔ قریبًا تمام اہل عظیم آباد بالاتفاق مرزا صاحب کو تمام ہندوستان کے شاعروں پر ترجیح دیتے تھے۔ بڑے بڑے رئیس وہاں کے مرزا صاحب کے فدائی بن گئے تھے۔ جن میں سے دو بزرگوار میر محسن صاحب[۱] اور میر عباس صاحب[۲] مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شادؔ* کے چچا[۱] اور والد[۲] بھی تھے۔ جو خود بھی ذیعلم تھے۔ اور اہل کمال کے قدرشناس بھی تھے۔ الحاصل تمام قدردانوں کے اخلاق نے مرزا صاحب سے یہ رباعی کہوالی۔

*مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شادؔ بھی مرزا صاحب کے ایک شاگرد ہیں۔ جن کا دم اس وقت بہت غنیمت ہے۔ اُن کا ذکر خیر میں انشاء اللہ کروں گا۔ حقیر پر بیس برس سے شفقت فرماتے ہیں۔ خطوط و کتب مصنفہ اکثر ارسال فرما کر زیربار احسان فرماتے رہتے ہیں۔ یہ بات کہ مرزا صاحب سب شاعران ہند سے اُس زمانہ میں بھی بہتر سمجھے جاتے تھے۔ واقعات انیس صفحہ ۶ سے بھی ظاہر ہے۔ جو رائے نواب نصیر حسین خاں صاحب خیالؔ نے لکھ کر بھیجی ہے اور واقعات انیس میں درج ہے۔ وہ بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ نواب صاحب موصوف بھی انہیں بزرگوں کے یادگار ہیں۔ مگر نئے خیال کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دکن ریویو میں جو انہوں نے بعض مضامین لکھے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اپنے بزرگوں سے خیالات میں بہت مختلف واقع رہے ہیں۔ میر علی محمد صاحب شادؔ ضرور میر انیس مرحوم کے کلام کو دل سے پسند فرماتے ہیں۔ بااین ہمہ مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے سرفرازنامہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء میں حقیر کو تحریر فرماتے ہیں۔ "کہ میں نے مرزا دبیر صاحب سے ۱۲۷۶ھ میں اصلاح لی ہے۔ اور میں اُن کو اپنا اور اس فن (شاعری) کا اُستاد جانتا ہوں۔ اور مرزا صاحب باعتبار کرہ کے میر بزرگ اور کامل الفن صاحب اخلاق حمیدہ اور مومن کامل تھے۔ میں اُنکی مخالفت کیونکر کرنا اور کس مُنہ سے کر سکتا ہوں۔ ہاں ۳۵ برس ہوئے۔ کہ جناب مرزا صاحب کے بعض نادان دوستوں نے مجھ کو کچھ ایسا پریشان کر دیا۔ کہ جوش جوانی میں میں از خود رفتہ ہو گیا۔ نواے وطن میں بعض بیجا رکیک فقرے قلم سے ایسے نکلے کہ میں شرمندہ ہوں۔ اور اُنکی رُوح پرفتوح سے معافی کا خواستگار۔ اُس کے بعد سے آج تک حاشا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایتًہ خواہ صراحتًا نکلا ہو۔" یہ خط طولانی ہے۔ اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے۔ "کہ میں میر انیس صاحب کا طرز قطعًا پسند کرتا ہوں"۔ اور اور بھی مضامین ہیں۔ جن کا اس موقع پر لکھنا ضرور نہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

این شہ بخاطر ملولاں شاد ست + معمورۂ خلق و حلم و عدل و داد ست
ہر فرد بشر دفتر خلق ست دبیر + این شہ زِ خلاق عظیم آباد ست

باب ششم - صدمات اواخر عمر

فصل ۱ صدمات اواخر عمر

مرنے سے دو سال پہلے مرزا صاحب کو چند صدمہ روحانی بہت سخت پہنچے +

پہلا صدمہ - محمد ہادی حسین عطارد تخلص نوجوان فرزند کا مرنا - جو ۵ رشعبان ۱۲۷۱ھ کو پیدا ہوئے تھے - عین شباب کے عالم ۲۰ برس کی عمر میں جمادی الاول ۱۲۹۱ھ کی پانچویں کو یکایک تخمہ کر کے انتقال کر گئے - یہ شاعر مبتدی تھے - سلام کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے - مولوی سید علی صاحب کامل عرف علی میاں مرحوم نے (جن سے مرزا صاحب کو خاص اس وجہ سے زیادہ محبت تھی - کہ اُن کی زوجہ دختر حکیم میر علی صاحب کو مرزا صاحب گویا اپنی بیٹی سمجھتے تھے - حکیم میر علی صاحب مرزا صاحب کے ساتھ کے کھیلے ہوئے دوست تھے - جن سے اور مرزا صاحب سے مدۃ العمر وہی محبت قائم رہی - جو اُس زمانہ کے یکرنگ دوستوں میں ہوتی تھی - انہیں کے سبب سے مولوی کامل مرحوم سے بھی محبت تھی - کہ یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کی حضوری سے اکثر فیضیاب ہوتے رہتے تھے) تاریخ وفات لاجواب فرمائی - جو یہ ہے -

پہلا صدمہ وفات عطارد

تاریخ وفات عطارد مصنفہ مولوی کامل مرحوم

روزگار ست گلشن نیرنگ	از جمال امید و صورت بیم
صبر کن صبر بر جفائے فلک	اے نزا طبع و رائے ہر دو سلیم
از علی اکبرِ حسینؑ شہید	یاد کن در عزائے نخل کریم
بود ہادی حسین رعنا تر	یا کہ فرزند اں امام کظیم
آہ از مرگ نوجوانے دو	پیش روئے پدر بحال سقیم
برگزیدت ندا برائے بلا	شکر کن شکر اے نبیہ حلیم

نور چشم ترا نہاد دبیر	ایزد از لطف سرمدی و بیم
غم ز دفنش مخور کہ بعد رحیل	او بہ گنج لحد نماند مقیم
ہاتفے گفتہ ست دوش بمن	شد عطارد مکین بیت نعیم

۱۲۹۰ھ

اس صدمہ عظیم کے بعد مرزا صاحب کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ ادھر تو نور نظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ اُدھر جو دہ رات میں چند گھنٹے سو رہتے تھے۔ وہ سونا بھی نور نظر کے داغ کی نذر ہو گیا۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا۔ مرزا صاحب پھر نماز شب اور وظائف پڑھتے تھے۔ اُس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے۔ تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ اکثر مَیں دن میں آٹھ نو بجے جب جاتا تھا۔ تو سوچ میں بیٹھا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ عرض کرتا۔ کیوں جناب کیا فکر فرما رہے ہیں۔ فرماتے۔ بھئی محمد رضا۔ رات کو تین بند کہے تھے۔ کچھ مصرع یاد رہ گئے۔ کچھ بھول گیا۔ اب بہتیرا سوچتا ہوں۔ نہ وہ مصرع یاد آتے ہیں۔ نہ ویسے دُوسرے مصرع خیال میں آتے ہیں۔ مَیں عرض کرتا تھا۔ کہ حضور نے بھائی محمد جعفر کو جگا دیا ہوتا وہ لکھ لیتے۔ تو آبدیدہ ہو کر فرماتے۔ کہ ہاں ایک (ہادی حسین) کو تو راتوں کو جگا جگا کر ہاتھوں سے کھو چکا۔ اب خدانخواستہ ان کو جگاؤں۔ تو ان سے بھی ہاتھ دھوؤں۔ اس صدمہ عظیم کے بعد دُوسرا صدمہ رُوحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر مرحوم کے مرنے کا تھا۔ جو اٹھائیسویں صفر سنہ ۱۲۹۱ ہجری کو آخرت کا سفر کر گئے۔ یہ بڑے بھائی تھے۔ مگر مرزا صاحب کے تقدس و کمال کے سبب سے مرزا صاحب کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے چھوٹے۔ پہلے یہ بھی میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے پھر اُنہیں کے حکم سے مرزا صاحب کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان کے سو مرثیے سے اُوپر اور سیکڑوں سلام ہیں۔ یہ مشہور و مقبول مرثیہ ع ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ جو لولکشور صاحب کے مطبع میں مرزا صاحب کی جلدوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ بھی

انہیں نظیر مرحوم کا ہے۔ اسی طرح بہت سے ان کے مرثئے ایسے ہیں۔ جن کو ناواقف راز مرزا صاحب کا کلام سمجھتے ہیں۔ ان کے فرزند مرزا محمد عباس صاحب سفیر مرحوم تھے۔ نظیر مرحوم کو تو کیمیا کی دھت تھی۔ اُس میں محو رہتے تھے۔ سفیر مرحوم کو خود مرزا صاحب نے عروض وغیرہ پڑھایا تھا۔ تیسرا صدمہ جوان دونوں صدموں سے بڑھ کر کاہش جان ہُوا۔ وہ بروز دوشنبہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو قریب مغرب میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کا مرنا تھا۔ یہ شیر نیستان سخن کیا مر گیا۔ مرزا صاحب کی شاعری نہیں نہیں زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ اُس زمانہ میں میر صاحب کے کمالات کا اکثر ذکر کر۔ کے فرمایا کرتے تھے۔ کہ اب نہ پڑھنے کا لطف ہے نہ کہنے کا مزہ ہے۔ اب ہمیں بھی چراغ سحری سمجھ لو۔ کوئی جھونکا آیا۔ اور خاموش ہو گئے (بقول جناب اوج مدظلہ) سے

تصنیف کا نہ لطف نہ خوانندگی کا لطف + وہ کیا اُٹھے کہ اُٹھ گیا سب زندگی کا لطف

مرزا صاحب نے خون جگر سے رنگین ایک تاریخ وصال میر صاحب کی لکھی۔ اور میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی تھی۔ میں اُس مجلس میں موجود تھا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی۔ تو مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔ چند شعر یہاں لکھتا ہوں۔ یہ تاریخ اُن کے کلیات دفتر ماتم میں نہیں چھپی ہے۔ بلکہ اب سے ۳۲ سال پہلے شمس الضحیٰ کے بعد جو تتمہ مولوی بہادر حسین صاحب وحید نے لگایا ہے۔ اُس میں چھپی ہے۔

فصل ۲ تیسرا صدمہ وفات انیس مرحوم ۲

قطعۂ تاریخ

قطعۂ تاریخ وفات میر انیس مرحوم

(۱) داد خواہیم یا غیاث المستغیثین الغیاث ۔۔۔ از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس

(۲) عبرۃ للناظرین گردید افلاک و زمیں ۔۔۔ دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس

(۱) خلاصہ یہ ہے کہ کوئی ایسا سخنور نہیں رہا جس سے دل بہلے ۱۲ مؤلف حقیر

(۲) ایضاً افلاک و زمین سراپا عبرت ہو گئے ہیں۔ آفتاب۔ ماہتاب ستارے کوئی چیز قابل دیکھنے کے نہیں ہے۔ ایسا دل بیزار ہے ۱۲ مؤلف

(۳) وادریغا عینی و دینی دو بازو ہم شکست — بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس

(۴) یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں — چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

(۵) الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوق نظم — شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس

(۶) پوست کندہ موشگافان سخن گویند حیف — ہر سر مو بر رگ جاں نشست نشتر بے انیس

(۷) اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشکِ ما — رفتہ رفتہ رفت تا دامان محشر بے انیس

(۸) بسکہ در بزم ہم بسوزد داغ بر بالائے داغ — نیست جز طاؤسِ دل پروانہ دیگر بے انیس

(۹) نیست ایام تماشائی چمن اکنوں کہ ہست — دانہ شبنم سپند و غنچہ مجمر بے انیس

(۱۰) تازہ مضمون نظم میفرمود در ہر بحر شعر — چشمہ چشمم شود ہم چشم کوثر بے انیس

(۱۱) سال تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

زبر و بینہ میں	زبر میں	زبر و بینہ میں	زبر میں
۵۷۲	۱۸۴	۴۱۴	۱۲۱

میزان ۱۲۹۱ سنہ بارہ سو اکیانوے ہجری نکلے

(۳) ایک ہی سال دو بازو ٹوٹ گئے اول سال میں نظیر برادر عینی اور آخر سال میں انیس برادر دینی گذر گئے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۴) ہم انکا یادگار رہ گئے ہیں چند روز ہفتہ چند دن دنیا میں ہو گا ایسا ہی ہوا کہ ۲۵ ذیقعد ۹۱ھ کو یہ تاریخ پڑھی اور ڈیڑھ ہفتہ اور چند دن کے بعد ۳ محرم ۹۲ھ کو چل بسے۔

(۵) اے ذوق و شوق تصنیف نظم لو اب رخصت ہو کہ اب ان صدموں سے نہ حواس درست ہیں نہ عقل ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۶) بات میں بات نکالنے والے شاعروں کا مرگ انیس میں یہ حال ہے کہ ان کو ہر بال کا سر رگ جان پر نشتر معلوم ہوتا ہے ۱۲ مؤلف۔

(۷) آنسو کو دامن سے قدرتی لگاؤ ہے کہ دامن پر گرتا ہے۔ مگر صدمہ کی حد ہو گئی۔ ہمارا آنسو دامن محشر تک پہنچیگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۸) داغ پر داغ کھا کھا کر یہ دانۂ دل طاؤس کی طرح ہو گیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۹) اب تو نہیں میں چمن بھی تماشے کے قابل نہ رہا (جو تفریح کی جگہ ہے) اور جل رہا ہے شبنم کا قطرہ کالا دانہ معلوم ہوتا ہے اور ہر غنچہ انگیٹھی کی صورت نظر آتا ہے۔ یہ تشبیہ اعلیٰ ہے (بمعنی شبنم)

(۱۰) ہر بحر میں تازہ مضمون کہتے تھے۔ اس لئے ان کے فراق میں میری آنکھ کا چشمہ بھی ہم چشم کوثر ہو جائے تو عجب نہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۱) تاریخ زبر و بینہ میں کی گئی طور سینا کے زبر و بینہ میں ۵۷۲ - بے کلیم اللہ و کے صرف زبر میں ۱۸۴ - منبر بے کے زبر و بینہ میں ۴۱۴ - انیس کے صرف زبر میں ۱۲۱ اعداد لینے سے ۱۲۹۱ھ نکل آتے ہیں سینا اور انیس ایک دوسرے کا معکوس ہے۔ اس کو صنعت مقلوب کہتے ہیں ۱۲ مؤلف

(۱۲) در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

(۱۳) آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۹۲۹ ۹۴۵

میزان

۱۸۷۴ عیسوی

زبر و بینہ کا حساب و قاعدہ

اب زبر و بینہ کا حساب بھی لکھ دوں۔ کہ اس زمانے میں یہ حساب کتاب علوم مشرقی کے ساتھ ساتھ خواب و خیال ہوتا جاتا ہے۔ پھر لوگ وقت ضرورت ڈھونڈینگے تو مشکل سے ملیگا۔ واضح ہو۔ کہ زبر و بینہ دو لفظ ہیں۔ زبر اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر حرف کے نام کے اول حرف کا عدد لیا جائے۔ اور بینہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر اسم حرف کے اول حرف کو چھوڑ کر باقی حروف کے عدد لیں۔ اور زبر و بینہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ شروع کے حرف کا عدد بھی لے لیں۔ اور باقی حروف کے عدد بھی لے لیں جیسے الف میں تین حروف ہیں۔ ا ل ف۔ پس ا کا ایک عدد دیا۔ اس کو زبر کہینگے۔ ل ف کے ۳۰ و ۸۰ کل ۱۱۰ عدد ہوئے۔ اس کو بینہ کہینگے۔ اور تینوں حروف کے عدد ۱۱۱ لیلیں۔ تو اس کو زبر و بینہ کہینگے۔ اب جب کہ یہ حساب سمجھ میں آگیا۔ تو یہ بھی سُنئے۔ کہ میزان التاریخ میں جو فن تاریخ گوئی کی ایک معتبر کتاب عربی ہے۔ یہ لکھا ہے۔ کہ

یجوز فی المعمّٰی والتاریخ ان یوخذ اعداد الحروف بحساب الجمل وان یوخذ بطریق الزبر والبینات وان یوخذ اعداد لبعض الکلمات بحساب الجمل وبعضھا بالزبر و البینات وحینئذ یجب ان یشار الیھما بوجہ ما لئلا یلزم خلاف المقصود

معمّٰی و تاریخ میں یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب حرفوں کے عدد بحساب زبر لیں[1] اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب کے عدد زبر و بینات میں لیں[2]۔ اور یہ بھی جائز ہے[3]۔ کہ بعض کلمات کے اعداد زبر میں۔ اور بعض کے زبر و بینات میں لیں۔ مگر صورت آخرالذکر (۳)

میں یہ واجب و ضرور ہے۔ کہ شاعر کسی طرح اس کا اشارہ کر دے۔ تاکہ پڑھنے والا خلاف مقصود عدد نہ جوڑے۔ اور غلطی سے بچے ✦ پس اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے حسب ہدایت مذکورہ کوئی اشارہ بھی کیا ہے یا نہیں۔ مرزا صاحب کے بعض معتقد اور شاگرد کہتے ہیں۔ کہ وہ اشارہ اسی قدر کافی ہے۔ کہ طور سینا کے نیچے ۲، ۵ زبر بینہ بے کلیم العدد کے نیچے ۱۸۴ زبر ۱۸ اور منبر بے کے تحت میں ۱۴۴ زبر و بینہ ۔ اور انیس کے نیچے ۱۲۱ زبر۔ اور پھر سب کے مجموعی اعداد ۱۲۹۱ لکھ دئے۔ پس یہ اشارہ کافی ہے۔ مگر حقیر کہتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ایک اور بھی نہایت صاف اشارہ فرمایا ہے (ذرا ناظرین اس مقام کو کہ علمی بحث ہے غور و انصاف سے ملاحظہ فرمائیں) وہ فرماتے ہیں ؎

درسنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف ✦ گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

یعنی وفات انیس کے سبب سے طبیعت رنجیدہ و پریشان تھی۔ اور پر جو مادہ تاریخ ہے۔ وہ کسی قدر دقیق و پیچیدہ ہے۔ پس اب اُس کو تاریخ عیسوی میں صاف صاف بحساب زبر کسکر بیں عام فہم کئے دیتا ہوں۔ تمکو اگر سنہ ہجری میں شک ہے۔ تو سنہ عیسوی سے مطابق کر لو۔ کہ سنہ عیسوی جاننے والے اب ہندوستان میں بہت ہیں۔ اور سنہ عیسوی اس پورے شعر میں ہے بحساب زبر بلاکم و کاست نکلتے ہیں ؎

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامیں ✦ طور سینا بے کلیم العدد و منبر بے انیس

سنہ ۱۸۷۴ء

یہ ۱۸۷۴ء سنہ ۱۲۹۱ھ کے مطابق ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئیگا۔ کہ حقیر نے اپنے بالواسطہ اُستاد (دبیر مرحوم) کی طرفداری میں سنین عیسوی والے دو شعر خود گھڑ لئے ہیں۔ یہ پوری تاریخ جن میں یہ دو شعر بھی ہیں۔ آج سے قریباً ۳۲ برس پہلے کتاب شمس الضحےٰ کے ساتھ بطور ضمیمہ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپ کر شائع و مشتہر ہو چکی ہے ✦

دفع دخل۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی صاحب یہ اعتراض فرمائیں۔ کہ یہ آخر الذکر

عیسوی تاریخ پورے شعر میں ہے - ایک مصرع میں نہیں ہے - اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں - کہ جب تاریخ ایک مصرع سے کم ایک یا دو لفظ میں کہنا جائز ہے - اور اسی طرح پورے ایک فقرہ میں یا آیت میں جائز ہے - تو پورے شعر میں بھی جائز ہے - کیونکہ جس طرح نثر میں ایک فقرہ ہوتا ہے - اسی طرح نظم میں اس کا قائم مقام عروضیوں کے نزدیک شعر ہے - عروضی جب تقطیع کریگا - پورے شعر کی - بلکہ عربی میں تو کبھی کبھی ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں - ایک جزو مصرع اول کے اخیر میں اور دوسرا مصرع ثانی کے اول میں لاتے ہیں - یہاں تک جائز ہے - جیسے شیخ سعدیؒ کا یہ شعر ہے ؎

یا معشر الخلان قولوا - المعا ٭ فی لست تدری بالقلب الموجع

یہاں ایک لفظ معانی کے شاعر نے دو ٹکڑے کر دئے مصرع اول میں معا لائے - ثانی میں فی لائے - اس میں کوئی کیا نقص نکال سکتا ہے - اس پر بھی اگر کسی کو اطمینان و تسکین نہ ہو - اور یہ کہے - کہ شیخ سعدیؒ ایرانی تھے عرب نہ تھے - اُن کا کلام فارسی مستند ہے - کلام عربی قابل سند نہیں - (حالانکہ سعدیؒ کا کمال یہ ہے - کہ اُن کا کلام عربی بھی سند مانا جاتا ہے) - تو اب اُن اہل زبان بزرگ کا کلام سُنئے - کہ بلاغت و فصاحت جن کی زبان سے نکلی ہے - قرآن شریف جن کے گھر میں گویا زبان حال سے یہ آیت پڑھتا ہوا اُترا ہے - اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ[1] - وہ بزرگوار محمدؐ و آل محمدؐ ہیں - چنانچہ جناب امام حسینؑ کا یہ مشہور شعر لیجئے - جو اُن جناب نے اپنے دوستوں کی یاد میں فرمایا تھا ؎

لیتکم فی یوم عاشو ٭ را جمیعاً تنظرونی[2]

دیکھئے اس شعر میں بھی ایک لفظ عاشورا کے اُسی طرح دو ٹکڑے کر کے دونوں مصرعوں

---

[1] ظاہر الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے - کہ کس گھر میں رسالت ہونی چاہئے ۱۲ مؤلف -

[2] (اے میرے دوستو!) کاش تم سب کے سب مجھے یوم عاشورا دیکھتے ۱۲ مؤلف غفیرہ

میں لائے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ایسے مصرع میں اتفاقیہ تاریخ نکالے۔ تو وہ جزو لفظ مصرع سے خارج ہونے کے سبب سے ایسی تاریخ نہ ہوگی۔ کہ جس کے معنی نکل سکیں۔ حالانکہ تاریخ کے لئے یہ ضرور ہے۔ کہ وہ مہمل الفاظ میں نہ ہو۔ اور جب ایک فقرہ میں تاریخ کہنا جائز ہے۔ خواہ وہ فقرہ کتنا ہی بڑا ہو۔ تو ایک شعر میں کیوں نہ جائز ہوگا۔ کہ فقرہ کا مقابل نظم میں ہمیشہ بیت سمجھا جاتا ہے نہ کہ مصرع*

اس تاریخ پر بعض اہلسیوں کا اعتراض

مرزا صاحب کے اس تاریخ پڑھنے پر اُن لوگوں میں جو نہ سمجھے تھے ایک ہلڑ مچ گیا۔ میر صاحب تو فرما گئے تھے ؎

سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس * جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

مگر اُن کے طرفداروں اور شاگردوں نے اُن کے مرنے کے بعد بھی جھگڑہ کیا۔ اور گویا ثابت کر دیا۔ کہ ع بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا۔ پہلے کچھ مرزا صاحب نے سکوت فرمایا۔ جب اُن سے عرض کیا گیا۔ کہ لوگوں کے اعتراضوں کے باب میں کوئی رسالہ نکال دیجیے۔ فرمایا۔ کہ ابھی ناواقفوں کو اور غوطے کھانے دو۔ جو واقف ہوگا۔ وہ اعتراض نہ کریگا۔

مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی کا تائید مرزا صاحب میں رسالہ لکھنا

علمائے اہل سنت وجماعت میں سے مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی ایک عالم متبحر* تھے۔ اُنہوں نے ایک لاجواب رسالہ مرزا صاحب کی تائید میں لکھا۔ پھر میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم اور اور لوگوں نے بھی اس کے جواز میں کئی رسالے لکھے مہینوں اس کے چرچے رہے۔ یہاں تک کہ اہل علم اور انصاف پسندوں نے مان لیا۔ کہ تاریخ صحیح ہے۔ اور مصرع بلکہ تمام شعر آخر کا لاجواب ہے یعنی آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامین۔ طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس *

وفات انیس کی تقریب

افسوس وہ کاروان بھی دُور چلا گیا۔ وہ گرد کاروان بھی اب نظر نہیں آتی۔

* جن کے انتقال کو ابھی دو تین برس ہوئے ہیں بہت سی کتابیں ان بزرگوار کی تصنیف ہیں اور بہت درسی کتابوں پر حاشیے ہیں۔ لکھنؤ میں بہ تمام عمر گزری ہے۔ وہیں انتقال فرما گئے۔ بڑے ادیب و علامہ تھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر کبھی کبھی جب تیز ہوا چلتی ہے۔ یا آندھی آتی ہے۔ تو اُس گرد کی بُو دماغوں میں کبھی کبھی آجاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے کرم فرما میر مہدی حسن صاحب احسن سلمہ اللہ والبقاہ (۱) واقعات انیس کے صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ پر صرف ایک مصرع "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" لکھ کر لکھتے ہیں کہ "پوری تاریخ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں موجود ہے۔ اس مادہ میں مرزا صاحب مرحوم نے صنعت زبر و بینہ کا دعوے کیا ہے۔ لیکن گروہ شعرا کو اس میں کلام ہے۔ کیونکہ زبر و بینہ کے قاعدہ سے سن مقصود کا استخراج نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے فاضل صاحبزادہ نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار میں تاویلاً تصحیح کی ہے۔ مگر واقفان فن کی تسلی نہیں ہوئی"۔

میں دوستانہ احسن صاحب سے عرض کرتا ہوں۔ کہ جب آپ واقعات انیس لکھنے بیٹھے تھے۔ تو کلیات مطبوعہ مرزا صاحب (دفتر ماتم) و شمس الضحےٰ و تنقید آب حیات بھی (جو حالات مرزا صاحب میں برسوں کی تصنیف شدہ و مطبوعہ کتابیں ہیں) دیکھ لیتے۔ تو آپکو معلوم ہو جاتا۔ کہ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں یہ قطعہ تاریخ (قطعی طور پر) نہیں ہے ضمیمہ شمس الضحےٰ میں پورا قطعہ تاریخ چھپا ہے۔ اس سے آپ یہ پوری تاریخ لکھ دیتے۔ کہ پوری بات سُن کر مصنف مزاج صحیح دماغ۔ ذی علم ناظر کتاب خود انصاف کر لیتا۔ کہ واقعی تاریخ نکلتی ہے اور مرزا صاحب کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اور یہ تاریخ مرزا صاحب کے کمال محبت کی خبر دے رہی ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب کی زبان سے میر صاحب کے کمالات کی مدح و ثنا ہے۔ ایک کامل دوسرے کامل کی قدر خوب کر سکتا ہے۔ اور تاریخ دیکھنے سے ناظر ذیعلم کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ اللہ ایک مدمقابل کی موت سے کیسا سخت صدمہ مرزا صاحب کے دل پر پہنچا ہے۔ اور کس قدر میر صاحب کا وقار اُن کے دل میں تھا۔ مگر افسوس نہ معلوم کیوں آپ نے قطع و برید فرما کر اور صرف ایک مصرع لکھ کر اس کا موقع ناظرین واقعات انیس کو نہیں دیا۔ اب میں نے ہندی کی چندی کر کے ناظرین کو سمجھا دیا مجھے امید ہے کہ ناظرین۔ ذی علم منصف مزاج کی تسلی اس سے ہو جائیگی۔ اب جبکہ واقعات انیس کا

نمبر ۱

نمبر ۸ ملکہ کشور کی مجلس میں میر صاحب و مرزا صاحب کا پڑھنا

یہاں نام آگیا ہے۔ تو اور اُن بعض مضامین کی تنقید بھی بیان کردوں۔ جو میر صاحب کے متعلق واقعات انیس میں آ گئے ہیں۔ (۲) صفحہ ۸۰ تا ۸۲ پر لکھا ہے (کہ جس کا خلاصہ یہ ہے)۔ (۱) کہ مرزا صاحب ملکہ کشور والدہ واجد علی شاہ مرحوم کی مجلس میں پڑھنے کو قبائے درباری پر عمامہ باندھے ہوئے گئے۔ اور میر صاحب سادہ لباس سے گئے۔ (۲) اول مرزا صاحب نے منبر پر جاکر حسب مقتضائے وقت بادشاہ اودھ کی مدح میں کچھ نظم پڑھی۔ شاہ ممدوح سُن رہے تھے۔ (۳) پھر میر صاحب نے منبر پر جاکر یہ سلام میر مونس کا پڑھا۔ ؎

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہوکر ✣ مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر

(۴) یہ کہ میر انیس مرحوم نے لکھا ہے نظم خاندان رسالت کے مقدس مزاروں پر چڑھائے ہیں۔ دولتمندوں کے دربار میں اُن کی نظموں کے گلدستے آرائش محفل نہیں ہوئے۔ اس تمام صغرے و کبرے کو آپ ملائیگا۔ تو یہ نتیجہ نکلیگا۔ کہ مرزا صاحب لباس درباری سے گئے۔ اور میر صاحب اپنی معمولی پوشاک سے گئے۔ اور اُن کی نظم کے گلدستہ بادشاہ اودھ کی محفل کی زینت ہوئے۔ (برخلاف میر صاحب کے)۔ اور ازبسکہ میر صاحب اس قسم کی مدح و ثنائے اُمرا کو بُرا سمجھتے تھے۔ انہوں نے اُسی وقت بادشاہ ممدوح کی سماعت میں مرزا صاحب پر چوٹ کی۔ کہ ہائیں۔ غیر کی مدح کرتے ہو۔ اپنی ہوا کھوتے ہو۔ ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم سلیمان ہوکر اپنی ہوا نہ کھوئینگے۔ نہ خود ڈوبینگے۔ نہ کمال کو ڈبوئینگے۔ اگر یہ واقعات صحیح ہوتے۔ تو ضرور میر صاحب کے کمال اور مرزا صاحب کے نقص پر دال ہوتے۔ مگر لکھنؤ میں بڈھے بڈھے آدمیوں سے تحقیق کرنے پر (جو ایسی مجلسوں میں باریاب ہوا کرتے تھے۔ اُن سے) معلوم ہوا۔ کہ یہ سب محض غپ (گپ) اور غلط ہے۔ مرزا صاحب مدۃ العمر کبھی کسی رئیس یا بادشاہ کے یہاں لباس درباری سے نہیں گئے مجلس عزا کا تو کیا ذکر ہے۔ کہ جہاں سوا آداب مجلس کے اور کسی کا ادب کرنا گویا وہ گناہ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ مرزا صاحب ملکہ کشور

مرحومہ کے یہاں پڑھے ۔ وہاں ہمیشہ میر صاحب پڑھا کئے ۔ مرزا صاحب کبھی اُس مجلس میں نہیں پڑھے ۔ جس طرح ملکہ زمانی کے یہاں کبھی میر صاحب نہیں پڑھے ۔ (۲) جب ملکہ کشور کے یہاں مرزا صاحب کبھی مجلس ہی میں نہیں پڑھے ۔ تو بادشاہ کی مدح میں وہاں کچھ پڑھنا کیسا ۔ (۳) یہ بھی خلاف عقل ہے ۔ کہ میر صاحب ایسے متین و مہذب آدمی ہو کر مرزا صاحب پر بادشاہ کی حضوری میں سر منبر ایسا اعتراض اور طعن کریں ۔ حالانکہ خود میر صاحب بادشاہ اودھ کی بیگم صاحب کی شان میں اپنے ایک مرثیہ کے مقطع میں فرما چکے تھے ع نواب مبارک محل و ثانی مریم ۔ اگر بادشاہ کی مدح غیر کی مدح ہے ۔ تو بادشاہ بیگم کی مدح بدرجہ اولے مدح غیر اور غیر مستحسن ہوگی ۔ (۴) دولتمندوں کی محفلوں کی آرائش میر صاحب کی نظم کے گلدستے ہوئے یا نہیں ۔ اس کا جواب خود اسی واقعات انیس سے نکل آیا ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے صفحہ ۷۹ پر جو پھول میر احسن صاحب کی زبان سے جھڑے تھے (اگرچہ وہ مرزا صاحب کے حق میں کانٹے تھے) اور ہم اُن کو بھی چننے کو طیار تھے ۔ مگر خود میر احسن صاحب نے صفحہ ۱۲۱ پر پہنچ کر تمام باغچہ کا سارا رنگ ہی بدل دیا ۔ گویا اُن کی کتاب زبان حال سے کہہ رہی ہے ۔ ؎ آتش

ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے ✤ او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

یعنی احسن صاحب لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے حیدر آباد دکن میں بر سر منبر یہ رباعیاں پڑھیں ۔ جن میں مدح و دعائے نظام و وزیر دکن ہے :-

(رباعی ۱)

اللہ و رسولؐ حق کی امداد رہے ✤ سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے

نواب ایسا رئیس اعظم ایسے ✤ یارب آباد حیدر آباد رہے

(رباعی ۲)

نظام دکن و وزیر نظام دکن کی مدح زبانی میر انیس صاحب

علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں + موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں
رحمت - رحمت پہ - نور پر نور ہے یاں + مختار الملک و بندگان عالی

کیا ایک آزاد طبیعت انصاف پسند ان رباعیوں کو سُن کر یہ نہیں کہیگا - کہ یہ امیروں کے بزم دولت کے گلدستہ نہ سہی پھول تو ہیں مثل مشہور ہے - پھول نہیں پنکھڑی سہی - کیا شاہ اودھ کی (میر صاحب جن کی رعایا بھی تھے) مدح غیر کی مدح تھی - اور نظام دکن اور وزیر دکن کی مدح (معاذ اللہ) آل محمدؐ کی ثنا خوانی تھی - اور پھر مدح کے ساتھ دعا بھی - ع

وہ پھول ہے کہ رنگ بھی ہے جس میں بو بھی ہے - ناظرین سے مجھے آپ بھی معاف فرمائیں - اور میر صاحب کی رُوح سے بھی میں معافی کا خواستگار ہوں - کہ احسن صاحب نے خلاف واقع حالات (مرزا صاحب کی نسبت) لکھ کر مجھے اتنا کہنے پر مجبور کیا - ورنہ میرے نزدیک جناب میر صاحب کی وضعداری میں کوئی کلام نہیں - نہ میرے اعتقاد میں اُن سے کوئی لغزش ہوئی - بات یہ ہے - کہ غیر کی مدح سے میر مونس مرحوم کی مراد دشمنان اہلبیت کی مدح سے ہے - شاہ اودھ یا نظام دکن وہ وزیر دکن اُن کے کلمہ گو یا اُمت میں ہیں - یہ تو سب اپنے ہیں غیر کب ہیں - پس نہ ان کی مدح قابل قدح ہے - نہ ان کے لئے دعا - خیر کوئی بڑی بات ہے - جس طرح مصنوعی دستاویز میں کوئی نہ کوئی فقرہ یا لفظ گھبراہٹ میں ایسا درج ہو جاتا ہے - کہ جس کو دیکھ کر منصف مزاج حاکم اُسکی مصنوعیت کا یقین کر لیتا ہے - اسی طرح بنائی ہوئی بات میں کوئی بات ایسی نکل آتی ہے جس سے اُس کی بناوٹ اور قلعی کھل جاتی ہے - یہ خدا کی شان ہے - یہی انجام اس مصنوعی و فرضی حکایت کا ہوا* - مسدس مرثیہ کی نسبت صفحہ ۶۳ واقعات انیس

* مولوی احمد علی صاحب اشہری مرحوم نے بھی یہی حکایت بے اصل لکھدی ہے - مگر شاید ماخذ اُس کا بھی یہی ہے غالباً میر احسن صاحب کے کسی دوست سے لکھنؤ میں اُنہوں نے سُنا ہوگا وہی لکھدیا - جس طرح حیات انیس میں دو واقعہ غلط ہیں کہ جن سے بعض کی تردید واقعات انیس میں ہوئی ہے - اور بعض کی میں نے اس کتاب میں کی ہے - اُسی طرح یہ واقعہ بھی غلط ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سابق میں چار مصرعی (مربع) مرثئے کہے جاتے تھے۔ میر
انیس صاحب نے اس (۶ مصرعی) کا رواج دیا۔ مگر یہ بھی خلاف واقع ہے۔ سب سے پہلے
جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کہا۔ وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں۔ اور سب سے پہلا اس طرز کا
یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے ع ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول۔ یہ بھی لکھنؤ میں رہتے
تھے۔ انہیں کا تخلص ڈال کر مرزا سودا نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی* جس کا مفصل

پہلا مسدس مرثیہ سکندر کا

ذکر آب حیات میں ہے۔ حق بات کہنا فرض ہے۔ حق پوشی فرض وقائع نگاری کے
خلاف ہے۔ اس لئے کہتا ہوں۔ کہ دہلی و لکھنؤ والے اپنے اپنے مربّی زبان و کمال ہونے
پر فخر کرتے ہیں۔ مگر یہ خدا کی شان ہے۔ کہ اکثر باتوں کی درستی اور ایجاد کا سہرہ باہر والوں
کے سر رہتا ہے۔ ولی دکنی کو دیکھئے۔ جو اُردو کی شاعری کے بابا آدم ہیں۔ وہ دکن کے
سکندر موجد طرز مسدس مرثیہ پنجاب کے میر ضمیر مرحوم (رزم و سراپا وغیرہ بلکہ) مرثیہ موجودہ
کی طرز کے موجد پنگھوڑا ایک قصبہ کے رہنے والے میر ضمیر اور میر خلیق بلکہ اکثر اہل لکھنؤ کے
اُستاد میاں مصحفی امروہہ کے تھے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے۔ کہ اگر یہ لوگ دہلی و لکھنؤ
میں نہ آتے۔ تو غالباً ان کو یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ اثر فیض دہلی و لکھنؤ کا ہر ایک کے
ساتھ ضرور ہے۔ ایک مسدس مختصر سودا مرحوم کے کلیات میں بھی ہے جس کا مطلع
یہ ہے ع کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی۔ مگر وہ کتاب ہی میں مقید ہے
اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے
پھرتے ہیں۔ سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے۔ مگر عام شاعر تھے۔ اور سکندر خاص
مرثیہ گو مشہور ہیں۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کے ایجاد کا سہرہ میرے نزدیک
سکندر کے سر ہے۔ یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے۔ کہ دو معاصروں میں سے

مسدس مرثیہ سودا و مقبولیت مرثیہ سکندر اور دونوں کے مرثیوں میں فرق

* میر ضاحک میر حسن کے والد اور میر انیس مرحوم کے پردادا ہیں۔ جن میں اور دبیر صاحب میں غالباً۔۔ اسی برس کے قریب قریب کا فاصلہ ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ سو برس پہلے کی بات کو سو برس بعد کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

فصل ۶
اسنینوں کو، زمینوں کو، اس سلام پر، انیسیوں و دبیریوں میں جھگڑا

اوّل کس نے کہا۔ تو سکندر و سودا دونوں کو موجد ماننا چاہئیے ۔ (۳۲) صفحہ ۱۴۱ پر میر احسن صاحب نے لکھا ہے (جس کا خلاصہ یہ ہے)۔ کہ "ایک سلام میر صاحب نے پڑھا جس کے شعر مندرجہ تحت کی عالمگیر شہرت ہوئی ہے

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے ۔ چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

اس سلام (میر صاحب) کی زمین مرزا صاحب کو پسند آئی ۔ انہوں نے بھی سلام کہا۔ کسی مجلس میں پڑھے ۔ بے فکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا۔ رشک فن داخل خواص شعرا ہے۔ خصوصاً ایسا شخص جس کی طبیعت تقابل پسند نہ ہو۔ پھر تو دونوں جانب سے طبع آزمائیاں ہوگئیں۔ بلند پروازیوں نے زمین شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ دونوں صاحبوں کے سلام کلیات مطبوعہ میں موجود ہیں۔ پھر اہل لکھنؤ نے اصلاح کی کوشش کی۔ میر صاحب و مرزا صاحب کی طبیعتیں بغض و نفسانیت سے پاک تھیں۔ صفائی ہوگئی"۔

اب میں میر احسن صاحب سے کہتا ہوں۔ بقول سحر

چلے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے ۔ کہ ہم اور بھی اک نظر دیکھ لیتے

مہربان! کم سے کم آپ کلیات مطبوعہ دبیر تو ایک نظر دیکھ لیتے۔ دفتر ماتم کی بیسوں جلدیں بندہ نے چھان ڈالیں۔ یہ سلام نہیں ملا۔ اور ملے تو کیونکر۔ مرزا دبیر مرحوم نے کوئی سلام ہی اس زمین میں نہیں فرمایا جھگڑا کبھی انیسیوں اور دبیریوں میں ضرور ہوا تھا۔ مگر یہ محض غلط ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نے جواب میں سلام کہا تھا۔ اصل واقعہ جہاں تک میرے علم و یاد میں ہے۔ اور جناب شیخ محمد جان صاحب عروج فیض آبادی نے اپنی کتاب "رد موازنہ" (مولوی شبلی صاحب) میں لکھا ہے یہ ہے۔ کہ جناب میر صاحب نے یہ سلام فرمایا تھا ہے

یہ کتاب دفتر مشرقی نور مظفر پور میں مصنف مدظلہ نے چھپوائی ہے۔ وہیں سے مل سکتی ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

سدا ہے فکر ترقی مآل بینیوں کو + ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس پر اور شعرا نے سلام کہے۔ مرزا اوج صاحب قبلہ نے بھی سلام کہا۔ اُس کے بعد ۲۶ ویں کی مجلس میں جو آغا میر کی ڈیوڑھی پر نواب میر محمد حسین صاحب مرحوم کے یہاں ہُوا کرتی تھی۔ میر نواب صاحب مونس مرحوم نے اسی زمین میں ایک سلام نواب ممتاز الدولہ مرحوم (شاہزادہ اودھ) کو مخاطب کر کے پڑھا۔ کہ وہ بھی مجلس میں موجود تھے۔ اُس سلام میں یہ طنزیہ شعر بھی تھا ؎

بھلا تردد بے جا سے اُن میں کیا حاصل + اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

اور شاید یہ شعر بھی تھا ؎

نیا مزہ ہے کہ مضمون تو دستیاب نہیں + مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

نواب ممتاز الدولہ کو جو مرزا صاحب کے شاگرد تھے سخت ملال ہُوا۔ اور مجلس میں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر تو انیسیوں اور دبیریوں میں (تمام شہر میں) شور مچ گیا۔ دبیریوں نے بعض متقدمین کی غزلیں اور شاید ایک دو سلام بھی دکھائے۔ کہ پہلے بھی لوگ اس زمین میں کہہ چکے ہیں۔ مشیر مرحوم بھی زندہ تھے۔ اُنہوں نے بھی مرزا صاحب کی شاگردی کے جوش میں بہت کچھ کہا۔ چنانچہ یہ ایک شعر اُسی زمانہ کا یاد ہے ؎

مشیر کا دبیر (اپنے اُستاد) کی طرفداری کرنا

اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر + نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

نظیر برادر دبیر مرحوم نے ایک سلام کے مقطع میں کہا ؎

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیر + کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں اور بھی ہے

سب سے زیادہ انیسیوں کو اس شعر پر فخر و ناز تھا ؎

میر تقی میر کا شعر

یہ جھریاں نہیں ہاتوں پہ ضعف پیری نے + چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

دبیریوں نے میر تقی میر کے دیوان میں یہ شعر دکھا دیا ؎

ہیں ضعف سے جھریاں بدن پر + پیری جامہ کو چُن رہی ہے

اور یہ کہا۔ کہ دیکھئے۔ خدائی سخن میر کس قدر مختصر لفظوں میں ۷۰ برس پہلے اور عمدہ بندش میں کہہ گیا ہے۔ کسی صاحب نے مطلع پر اعتراض جمایا۔ کہ دعوے تو یہ فرمایا ہے۔ کہ فکر ترقی ہے۔ اور بجائے ترقی کے دُوسرے مصرع میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ع ہم آسماں سے لاتے ہیں ان زمینوں کو۔ یہ ترقی کا پُورا پُورا ثبوت کب ہوا۔ یُوں فرماتے۔ تو ترقی ثابت ہوتی۔ ع ملی ہے عرش پہ معراج ان زمینوں کو۔ غرض چند روز کی دبیریوں اور انیسیوں کی بحثوں میں پالی کا لطف آیا کیا۔ اور اُسی میں کچھ علم و ادب کی معلومات بھی بڑھتی رہتی تھی۔ مشیر مرحوم نے جو چوٹیں کی ہیں۔ وہ اشعار مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں ہیں۔ اور میں اُن کو اس کتاب میں لکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ ناظرین کتاب میں سے بعض کی دل شکنی ہو۔ (بقول انیس مرحوم) ؎

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم ✤ انیسؔ ٹھیس لگ جائے آبگینوں کو

صفائی

المختصر اُدھر میر صاحب میر مونس مرحوم پر اور اُدھر مرزا صاحب مشیر مغفور پر بہت خفا ہوئے اور میر مونس مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کی حضوری میں آکر عذر خواہ ہوئے۔ اور وہ گرد کدورت دلوں سے دھو گئی۔ واقعی طبیعتیں میر صاحب اور مرزا صاحب کی (بقول احسن صاحب) بغض و حسد سے پاک تھیں۔ اور زیادہ صفائی اور آئینہ قلب پر جلا ہو گئی ✤

فصل ۷ نتیجہ ۳ وثیقہ نجف و امام باڑہ میر باقر صاحب مرحوم

(۴) صفحہ ۱۱۲ سے صفحہ ۱۱۴ تک میر احسن صاحب نے نواب مبارک محل کے للّٰہ ماہوار وثیقہ کا جو میر انیس مرحوم کو ملتا تھا ذکر لکھا ہے۔ کہ متولی صاحب نے پہلے مجلس کا ذکر نہ کیا۔ عین وقت پر جب مجلس جمع تھی۔ سواری بھیجی۔ تو میر صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے وثیقہ بند کر دیا۔ میر صاحب نے اس کی کچھ پرواہ کی۔ جب متولی صاحب نے مدت کے بعد معافی مانگی۔ تو میر صاحب نے فرمایا۔ وہ وثیقہ چڑھا ہوا بھیج دیں۔ اس کو اُنہوں نے منظور نہ کیا۔ میر صاحب کے بعد اُن کے جانشین میر نفیس مرحوم

نے بھی یہی جواب دیا۔ آخر کچھ نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کو مشرح لکھ کر تحریر کیا ہے۔

کہ" البتہ مرزا محمد جعفر صاحب اوج نے اپنے والد کے بعد اپنے موروثی حقوق امام باڑہ میر باقر سوداگر سے جو کچھ معین تھے بچارہ جوئی عدالت وصول کر لئے۔ اور استحقاق دکھادیا"۔

حکیم بندہ مہدی صاحب متولی وثیقہ نجف کا شاگرد جناب اوج ہونا

جس طرح میں نے مختصر کر کے واقعات انیس سے یہ حال لکھا ہے۔ اسی طرح ردّ واقعات انیس مؤلفہ جناب سردار مرزا صاحب سلمہ اللہ سے واقعہ مختصر لکھتا ہوں (کہ واقعات انیس و ردّ واقعات انیس ایک ہی مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپی ہیں اور طالب مشتاق کو مل سکتی ہیں) وہی حکیم بندہ مہدی صاحب متولی نجف و وثیقہ نواب مبارک محل میر صاحب اور مرزا صاحب کے انتقال کے بعد نواب مصطفٰے حسین خاں صاحب کے ساتھ جناب اوج مدظلہ کی خدمت میں ایک مخمس کہکر لائے۔ شیرینی رکھی شاگرد ہوئے۔ شیرینی شاگردوں اور دوستوں میں بٹی۔ پھر انہوں نے اپنے امام باڑہ میں مجلس کی۔ پہلے خود وہی مخمس پڑھا۔ پھر مرزا اوج صاحب قبلہ کو پڑھوایا۔ بعد مجلس کچھ نذر کرنا چاہا۔ تو مرزا صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ میں نے حال کے رؤسائے لکھنؤ سے کچھ لینا اپنے نفس پر حرام کر لیا ہے۔ چنانچہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والئے محمود آباد کے مرسلہ دو شالوں کا اور امیر محل مرحومہ کے پیشکش کا پھیر دینا بیان کر دیا۔ حکیم صاحب اُس وقت چپ ہو گئے۔ پھر چند روز بعد یہ ذکر نکالا۔ کہ میں چاہتا ہوں۔ کہ نجف کی تنخواہ (وہی للعہ ماہوار جو میر انیس مرحوم کو ملتے تھے) آپ کے نام جاری کی جائے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ میں آپ کے شاگرد ہونے کا مطلب پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس تنخواہ میں سے ایک حبہ لینا میں اپنے نفس پر حرام سمجھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ آپ کے صاحبزادے کے نام پر وہ تنخواہ جاری ہو جائے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ جب تک میں زندہ ہوں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میرے

مرزا اوج صاحب کی وضعداری

بعد اولاد کو اختیار رہے۔ یہ جناب مرزا اوج قبلہ کی وضعداری کا واقعی حال تھا۔ جو عرض کیا۔ اب یہ بھی سن لیجے۔ کہ نجف مبارک اور حسین آباد مبارک کے وثیقوں کی بحالی و برطرفی کا اختیار وہاں کے متولیوں کو ہے۔ چنانچہ جناب مرزا دبیر مرحوم اور اُن کے بعد جناب مرزا اوج قبلہ کو ننھے روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد سے ملتے تھے۔ گویا پشتینی وثیقہ تھا۔ مگر درباری گول ٹوپی پہن کر پڑھنے اور عشرہ محرم میں لکھنؤ سے باہر نہ جانے کی شرط و بحث پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے اُس کو ترک فرما دیا۔ اور نہیں پڑھے۔ ان وقفوں اور امام باڑہ میر باقر تاجر مرحوم کے وقف میں یہ فرق ہے۔ کہ وہاں متولی کو موقوفی و بحالی کا (مثل حسین آباد و نجف) مرزا اوج صاحب کی نسبت اختیار نہیں ہے۔ آخرالذکر وقف کی اصلیت قصہ طلب حسب ذیل ہے۔ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ چار آدمی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ جن میں مرتے مرتے محبت قائم رہی۔ خدا کی شان کہ ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل و یکتا ہوا۔ (۱) حکیم مرزا محمد علی صاحب (۲) میر باقر تاجر صاحب (۳) مرزا دبیر صاحب (۴) میر علی صاحب حکیم +

ایک دن ملکہ زمانیہ (ملکہ زمانی) نے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ میں اپنے شوہر نصیر الدین حیدر (شاہ دوم اودھ) کی قبر پر (جو لکھنؤ پارک کی کربلا میں ہے) ایک مرصع تاج طلائی اور طلائی سینی مع اگرسوز و شمشیر و سپر وغیرہ بنوا کر چڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ طیار فرما دیجئے۔ مرزا صاحب نے صاف جواب دے دیا۔ کہ مجھے ان باتوں میں سلیقہ نہیں۔ میں معذور ہوں۔ رات کو جلسہ احباب میں حسب معمول میر باقر صاحب تاجر مرحوم مرزا صاحب کے مکان پر تھے۔ یہ ذکر مرزا صاحب نے کیا۔ میر باقر صاحب مرحوم نے کہا۔ کہ آپ نے میرا نام کیوں نہ لے دیا۔ میں سب اسباب طیار کر سکتا ہوں۔ مرزا صاحب بولے۔ اب سہی۔ صبح کو دونوں صاحب پینسوں پر پہنچے۔ مرزا صاحب نے میر صاحب موصوف کو ملکہ زمانیہ سے کہکر اُس اسباب کی طیاری پر مقرر کرا دیا۔ جب وہ سب چیزیں قریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں طیار ہو گئیں۔ (جو

وثیقہ حسین آباد مرزا اوج صاحب

مفصل واقعہ واقعی وقف حسینیہ (امام باڑہ) میر باقر تاجر کی اصلیت

روپیہ پہلے ہی میر صاحب کو محل سے مل چکا تھا) تو میر صاحب نے وہ سب اسباب اور اُس کے ساتھ ہی بچپت کے بیس ہزار کے نوٹ بیگم صاحب کے روبرو پیش کئے۔ اور کہدیا کہ یہ مقدار زر فائدہ کی ہے۔ آپ لیں یا مجھے بحل کریں۔ اُنہوں نے کہا۔ یہ زر نفع آپ کا حق ہے۔ اس میں بحل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بااینہمہ میں بحل کرتی ہوں۔ میر باقر مرحوم وہ نوٹ لئے ہوئے مرزا صاحب کے پاس آئے۔ اور وہ نوٹ مرزا صاحب کو دیکر کہا۔ کہ اس میں نصف حق میرا اور نصف آپ کا حق سعی ہے۔ مرزا صاحب ہنسے۔ اور کہا۔ یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا مَیں اور آپ جدا ہیں؟ اور باوصف اصرار کے وہ دس ہزار روپیہ کے نوٹ نہیں لئے۔ میر باقر صاحب مرحوم وہ سب نوٹ لے گئے۔ مگر ایک عرصہ کے بعد اُنھوں نے حسب کچھ مواضع زر نفع تجارت سے خرید ے۔ اور وقف کی نوبت آئی۔ تو اسی دس ہزار روپیہ کی رعایت سے مرزا دبیر مرحوم کا نام نسلاً بعد نسلٍ شریک کیا۔ اور اُن کے امام باڑہ میں مرزا صاحب (کہ بعد میر ضمیر مرحوم کے حسین آباد میں مقرر ہو جانے کے پڑھنے تھے) پڑھا کئے۔ اور میر باقر تاجر مرحوم کے انتقال کے بعد زمانہ تولیت جناب ممتاز العلما مجتہد سید تقی صاحب طاب ثراہ میں بھی وہی عملدرآمد رہا۔ اور آج تک وہی ہے۔ جب کبھی کسی متولی صاحب نے شرائط وقف و عملدرآمد قدیم کے خلاف کرنا چاہا۔ عدالت کی نوبت پہنچی۔ اور بحمد اللہ عدالت ابتدائی سے عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) تک بمصداق الحق یعلو ولا یعلیٰ* وہی حق موروثی قائم رہا۔ اسی پچیسویں (۲۵) رجب کی سالانہ مجلس میں مرزا دبیر مرحوم بڑے مجمع میں پڑھا کرتے تھے۔ اب جناب مرزا اوج صاحب قبلہ پڑھتے ہیں۔ دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ باقی ماہواری مجلسیں معمولی ہوتی ہیں۔ اب غالباً میر احسن صاحب اور ناظرین سمجھ گئے ہونگے۔ کہ وقف حسین آباد و نجف اور اس وقف میں کیا فرق ہے۔ وہاں ہر شخص کو وہی کرنا پڑتا۔ جو جناب میر انیس و میر نفیس مرحومین اور

---

* حق ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ پست نہیں ہوتا ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب مرزا اوج مدظلہ نے کیا۔(یعنی سکوت)۔ اور یہاں وقف حسینیہ میر باقر تاجر مرحوم میں یہی روشس اختیار کرنا مناسب تھا۔ جو مرزا اوج صاحب نے فرمائی۔ اور اس وقف میں متوّلی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کی اولاد کو موقوف کردے + بظاہر یہ ذکر اس کتاب سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ مگر احسن صاحب نے واقعات انیس میں اس کی چھیڑ کی۔ میں نے اصلیت دکھادی۔ تاکہ ناظرین ناواقف نہ رہیں۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست + وگر خاموش بنشینم گناہ ست

(۵) واقعات انیس کے صفحہ ۵۶ پر لکھا ہے۔ کہ "میر انیس (مرحوم) کی شاعری نے جب لکھنؤ میں نشوونما کیا۔ تو اُس وقت ناسخ مرحوم کی شاعری کا آفتاب نصف النہار ترقی پر تھا۔ مرزا دبیر مرحوم مضمون آفرینیوں میں امام وقت کی تقلید کر رہے تھے۔ انداز مقبول سے طبیعتیں مانوس ہو رہی تھیں۔ اور زمانے کی نظریں اسی رنگ میں ٹوٹی ہوئی تھیں ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا + طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس کے بعد یہ بیان کیا ہے۔ کہ میر صاحب کا رنگ خاص اور اُس سے الگ تھا۔ اب میں کہتا ہوں۔ کہ نہ میں میر صاحب کے کمالات کا منکر ہوں۔ نہ اُن کی تردید کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں اتنا عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کا کلام مختلف رنگوں میں ہے۔ اور اُن کا یہ دعوے ہے ع ہر طرز میں جو خوب کہے خوب ہے وہ۔ بالکل بجا ہے۔ اس لئے مرزا صاحب کو نہ کوئی ناسخ مرحوم کا مقلد کہ سکتا ہے نہ آتش مغفور کا۔ اُن کی ابتدائی شاعری کا زمانہ میر تقی مرحوم کے پانچ سات برس بعد کا ہے۔ اور عروج کا وہی زمانہ ہے۔ جو ناسخ مرحوم کی شہرت کا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر مفصل لکھ چکا ہوں۔ اور مرزا تھا خود مجتہد ہیں۔ دُوسرے اُن کے مقلد ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

دز دان مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید

تو مجتہد نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

مرزا احسن صاحب اور مرزا اوج صاحب [illegible]

میر انیس مرحوم صاحب کی شہرت کا زمانہ اور رعایت لفظی کی گرم بازاری

جب مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا* اُس زمانہ میں بات میں سے بات نکالنے کو اصل شاعری سمجھا جاتا تھا۔ کوری رعایت لفظی پر لوگ تعریفوں کے پُل نہیں باندھ دیتے تھے۔ بقول شخصے ع دریا کے ساتھ جب مگر آیا اُچھل پڑے۔ البتہ بقول میر احسن صاحب جناب میر انیس مرحوم کی شہرت اور لکھنؤ میں آنے کا زمانہ عہد امجد علی شاہ مرحوم ہے۔ جو سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ (ناسخ مرحوم سنہ ۱۲۵۴ھ میں راہی جنت ہو چکے تھے) ۔ اور اُس زمانہ میں لکھنؤ میں عموماً اور شاگردان شیخ ناسخ میں خصوصاً صنعت مراعات النظیر (رعایت لفظی) کا بڑا زور شور تھا۔ اور کانوں میں یہ صدائیں گونج رہی تھیں :۔

(۱) مرغ دل کو نور بنگی تلی اگر دروازے کی۔ رخت تن کو کُترے گا چوہا تمہاری ناک کا۔

(۲) بیر لیوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں۔

(۳) مہندی نے شعلہ پاؤں تمہارا بنا دیا۔ کیا گرم ہے کہ بوٹ کو ہولا بنا دیا۔

(۴) عید بھی وصل سے چلی خالی۔ کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں۔

(۵) ساون میں بھی وعدہ کبھی پورا نہیں کرتے۔ باتوں میں جھلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔

(۶) بھبھڑئیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر۔

بعض شعرا نے اس رعایت لفظی کا پردہ ایسا باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کی طرح چھن کر ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئی تھی ۔ مرزا صاحب مرحوم اُس آندھی میں بھی اپنے رنگ پر قائم رہے ۔ مگر جناب میر صاحب مرحوم نے ان معاصرین مجتہدین نظم میں سے غالباً کسی کی تقلید پر کمر باندھی ۔ اور رعایت لفظی کی صنعت کو اس طرح برتا :۔

* یعنی سنہ ۱۲۳۰ھ میں یا اُس کے قریب قریب مرزا صاحب کی شاعری شروع ہوئی۔ اور سنہ ۱۲۲۵ھ میں ۵ برس پہلے میر تقی میر انتقال فرما چکے تھے۔ انشا و مصحفی کا بازار شاعری گرم تھا۔ اور میر کا رنگ چھایا ہوا تھا ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱) مُنہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا۔

(۲) خال رُخ دیکھا تو گھر خالقہ لگ جائیگا۔

(۳) کہیں کوثر کے تو چھنٹوں میں نہیں آیا ہے۔

(۴) چولیں ہوئیں ڈھیلی در خیبر کی ہمیں ہے۔

طرفداران جناب میر صاحب مجھے معاف فرمائیں۔ میں مضمون آفرینی کی طرح رعایت لفظی کو بھی قابل مدح سمجھتا ہوں۔ مگر ع ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے۔ میر احسن صاحب کے مُنہ سے میرے ممدُوح کے حق میں جو پھول جھڑے تھے۔ اُسی مصالح سے یہ پھل جھڑی طیار ہوگئی۔ جس کا تماشا آپ دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ میں میر صاحب مرحوم کو اُن کے رنگ میں کامل سمجھتا ہوں۔ اور رعایت لفظی کو بھی ایک صنعت (فی حدہ) سمجھتا ہوں۔ اور اُبھری ہُوئی رعایت نہ ہو۔ تو کلام میں مزہ آجاتا ہے۔ اور جن لوگوں سے مثل میرے ایسا رنگین کلام نہیں نظم ہوسکتا۔ اُن کا اور اپنا قصور طبیعت سمجھتا ہوں۔ اور تو کیا کہوں ۔

(۶) صفحہ ۹۱ پر جناب غالب مرحوم کا ذکر خیر کرتے ہُوئے لکھا ہے۔ کہ اُنہوں نے تین بند مرثیہ کے لکھکر میر صاحب (انیس مرحوم) کے پاس اصلاح کو روانہ کئے اور اُس کے ساتھ لکھا۔ کہ اِمتثالِ امر سے مجبور تھا۔ مرثیہ کیا ہے گو ہے۔ واسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔ میں اس کی تنقید اس موقع پر اس لئے نہیں کرتا۔ کہ ایک دُوسرے مقام پر میں نے تذکرہ جلوۂ خضر و سرور ریاض سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ مرزا غالب مرحوم مرثیہ گوئی کو فقط دبیر کا حق فرمایا کرتے تھے۔ اور عود ہندی کے ایک رقعہ سے ۱۵ اعتراضات بھی لکھ دئے ہیں۔ جو غالب مرحوم نے میر صاحب کے اس بیت پر کئے ہیں ؎

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا ٭ برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

تنقید نمبر ۶ غالب نہیں

غالب میر ببر نہیں کے شاگرد تھے
با معترض

(اور پھر اپنی سمجھ کے موافق میر صاحب کی طرف سے جواب بھی دے دئے ہیں) جس سے
ناظرین سمجھ سکتے ہیں۔ کہ غالب شاگرد تھے یا معترض تھے *

میر مہدی حسن صاحب احسن کے کلام کی جو تنقید دل کھول کر میں نے کی ہے۔
اس کا حق مجھے یوں حاصل ہوا۔ کہ اُن کے بزرگ محض طرفداران میر صاحب نہیں
ہیں۔ بلکہ مرزا صاحب سے بھی اُن کا ویسا ہی تعلق ہے۔ جیسا کہ خود اُنہوں نے واقعات
انیس کے صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر فخریہ لکھا ہے۔ کہ والد ماجد ہر مہینے کی سولھویں تاریخ مجلس
کیا کرتے تھے۔ اُس میں عجیب قسم کا متضاد مجمع ہوا کرتا تھا۔ وہ نظارہ دیکھنے کو لوگ
مشتاق ہو کر آتے تھے۔ یعنی میر انیس و مرزا دبیر و میر عشق مرحومین مع اپنے خاندانی
ممبروں کے تشریف لاتے تھے۔ اور راقم کے بزرگوں کے تعلقات ان سب بزرگوں کو
ایک جگہ جمع کر دیتے تھے۔ اب مجھ سے سُنئے۔ وہ تعلقات کیا تھے۔ احسن صاحب کے
والد مرحوم تو خالص میر انیس مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔ اور اُن کے
حقیقی نانا سید آغا حسن صاحب ازل مغفور غزل میں میر وزیر علی صاحب صبا مرحوم کے
شاگرد تھے۔ اور مرثیوں پر اُنہوں نے اصلاح میر صاحب و مرزا صاحب و آغا صاحب
(میر عشق صاحب مرحوم) سے الگ الگ لی تھی۔ اور کمال یہ کہ ہر ایک اُستاد سے اجازت
لیکر ایک کے بعد دوسرے کو مرثیہ دکھائے تھے۔ کچھ مرثئے میر صاحب کو دکھائے۔
پھر اُن سے اجازت مانگی۔ کہ حکم ہو۔ تو کچھ اور مرثئے مرزا صاحب کو بھی دکھلاؤں
اور ہر ایک نیک نفس پاک طینت نے نہایت خوشی سے اجازت بھی دے دی تھی۔
یہ وجہ تھی۔ جو سب خاندانوں کے سر گروہ ممبر تشریف لاتے تھے۔ اور سُنا ہے۔ کہ وہ
مرثئے میر احسن صاحب کے والد مرحوم پڑھتے تھے۔ اور صاف کہہ دیتے تھے۔ کہ یہ
مرثیہ میر صاحب کا یہ مرزا صاحب کا یہ آغا صاحب کا اصلاحی ہے۔ لکھنؤ میں یہ
روایت مجھ سے بڈھے بڈھے آدمیوں نے بیان کی۔ اور جناب مرزا اوج قبلہ مدظلہ

وقت تنقید واقعات انیس مرحوم تعلقات بزرگان میر احسن میر صاحب مرزا صاحب سے

ومیر حسین جان صاحب ساکن محمود نگر نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اور میر آغا حسن صاحب
انرل مرحوم کے حقیقی بڑے بھائی میر آغا حیدر صاحب مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد رشید
اور ہم آواز بھی تھے۔ تمام ملک میں ایک وہی بزرگوار تھے۔ جو مرزا صاحب کا طرز
پڑھتے تھے۔ جیسا اوپر ذکر ہوا۔ اور آواز زبان حال سے تصدیق کرتی تھی۔ کہ بیشک
مرزا صاحب کا یہ اصلی طرز ہے۔ جو تیسرا نہیں پڑھ سکتا۔ اور آغا حسن صاحب مرحوم
کے خسر حکیم نواب مرزا صاحب شوق مرحوم (جو زبان کے لحاظ سے قابل رشک شاعر
تھے) بھی مرزا صاحب کے گہرے دوست تھے۔ کبھی کبھی رات کے جلسہ میں مرزا صاحب
کے یہاں آتے تھے۔ اور مرزا صاحب کے کمالات کے دل سے مداح تھے پس ان
حقوق وتعلقات کی بنا پر میں میر احسن صاحب سے دوستانہ کہتا ہوں۔ کہ احسن کما
احسن اللہ الیک[ف] الآیہ۔ اور اس کتاب میں شکایت بھی کہیں ہے تو دوستانہ ہے۔ یہ
بے محبت نہیں آ ذوق شکایت کے مزے + بے شکایت نہیں آ ذوق محبت کے مزے

اب میں مختصر حال وفات جناب مرزا صاحب مرحوم کا لکھتا
ہوں۔ میر انیس مرحوم کے مرنے کے بعد مرزا صاحب مرحوم تین مہینے اور ایک
دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے۔ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد
کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرہ محرم میں ہر
روز مجلس جناب اوج مدظلہ پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے۔
کہ علیل تھے۔ کچھ سادات ومومنین دور دور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ
محرم کی مجلسوں کو چھوڑ کر محض مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخری نویں محرم کو
بعض مومنین نے مرزا صاحب مرحوم سے افسوس کے لہجہ میں عرض کیا۔ کہ ہم حضور کے

فصل ۱۰ حال انتقال دبیر مرحوم

نویں محرم ۱۲۹۲ھ کی آخری مجلس عظیم آباد میں پڑھنا

ف یعنی نیکی کرو جیسے خدا نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے۔ کہ ایسے سخن شناس سخنور سخن فہم سخن سنج خاندان میں تم کو خدا نے پیدا کیا۔ اور
آئندہ ایڈیشن واقعات انیس میں کچھ حالات کی صلاح کردہ بشرطیکہ مناسب ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سُننے کو آئے تھے۔ اپنے گھر کی مجلسیں بھی چھوڑیں۔ اور حضور کو نہ سُنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ حضور علیل ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ انشاء اللہ آج میں پڑھونگا۔ جتنا پڑھا جائیگا۔ خدا جانے پھر عشرہ محرم نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیاں پڑھ کر چند بند بین کے پڑھے۔ اللہ اللہ مرزا صاحب مرحوم کا بے تصنع حضور قلب سے پڑھنا۔ ایسی رقت ہوئی۔ کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔ مرزا صاحب منبر پر رو دیا کئے۔ طاقت خود سے اُترنے کی نہ تھی۔ بڑی دیر کے بعد جب جوش رقت کم ہُوا۔ لوگوں نے منبر سے اُتارا۔ بعد سویم ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ کے ایک ایک دو دو روز راستہ میں بمقام آرہ و حسین گنج مقام کرتے ہُوئے لکھنؤ میں تشریف لائے*۔ ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا۔ مگر مرض الموت کا کیا علاج۔ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر اُسی عارضہ ورم کبد میں ۳۰ (تیسویں) ماہ محرم کی رات میں قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری و مداحی غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون +

دن میں جنازہ اُٹھا۔ دریا پر غسل میت کے واسطے جنازہ کو لیگئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ علما و صلحا و شعرا تھے۔ اور اکثر اُن مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے ہُوئے روتے چلے جاتے تھے:۔

رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہُوں + مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں

چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل + تابُوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

---

* پھر لکھنؤ میں مرزا صاحب نے کوئی مجلس ۱۲۹۲ھ میں نہیں پڑھی۔ آخری مجلس وہی ۲۵ ذیلقعدہ ۱۲۹۱ھ کو پڑھے تھے۔ جس میں حقیر شریک تھا۔ اور یہ مرثیہ پڑھے تھے ع انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباسؑ۔ مرثیہ نا تمام تھا جب پڑھتے پڑھتے آپ ساکت ہوئے۔ لوگوں نے عرض کی حضور کچھ ادر عنایت ہو۔ تو مرثیہ کا آخری سادہ ورق دکھا کر فرمایا۔ کہ بس اتنا ہی کہا ہے۔ افسوس اس کے بعد ہوائے زمانہ نے وہ ورق ہی اُلٹ دیا۔ وہ نقشہ ہی مٹا دیا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ مؤلف حقیر +

تدفین

جناب سید ابراہیم صاحب اعلے اللہ مقامہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے گھر پر دفن ہوئے۔ جو مقبرہ چھوٹا سا اب تک برقرار ہے۔ ؎

انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں * ہر تاج فصیحان زمانہ اُٹھا

اُن کی موت کا محض شیعوں کو نہیں۔ بلکہ سُنیوں اور ہندوؤں کو بھی صدمہ عظیم ہوا ہزاروں شاعروں نے تاریخیں کہیں۔ ان میں سے منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم کی تاریخیں جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ اکثر لاجواب ہیں۔ یہ مرحوم بھی مرزا صاحب کے ارشد تلامذہ سے تھے *

تواریخ رحلت دبیر

مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی نے (جو فرقہ احناف کے ایک مشہور و مستند عالم و شاعر تھے) بھی لاجواب تاریخ فرمائی تھی جس میں سے ایک شعر یاد ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ؎

چوں داشت ذوق ذکر شہیدان کربلا * سلخ محرم آمدہ روز وصال او

مرزا صاحب کے سویم کی مجلس میں جو میری یاد و علم میں میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقعہ لکھنؤ چوک میں ہوئی تھی بہت بڑا مجمع تھا۔ میں اُس زمانہ میں مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں پڑھتا تھا۔ اُس روز مدرسہ میں اسی تقریب سویم کے سبب سے تعطیل ہو گئی تھی۔ جناب استادی حضرت اوج مدظلہ نے عین انتشار و کمال رنج میں حسب ذیل قطعہ تاریخ کہکر پڑھا تھا:۔

قطعہ تاریخ وصال از حضرت اوج مدظلہ

قطعۂ تاریخ وصال دبیر مرحوم

خاک بر سر کن۔ صبا۔ در ماتم سلطان نظم	حیف شد برباد اقلیم بلاغت بے دبیر
بنگر اندر بوستاں ہر نخل نخلِ ماتم ست	در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر

* منیر سال و ماہ و روز و وقت تاریخش۔ پگاہ د سلخ محرم شنبہ بعزا بودہ۔ کتنا عمدہ مادہ فرمایا ہے جس میں روز وقت و تاریخ صوری اور سال ۱۲۹۲ھ معنوی ہے۔ کہ مصرع میں سے ۱۲۹۲ھ اعداد نکلتے ہیں۔ منیر مرحوم نے کمال کیا ہے ۔* ۱۲ مؤلف حقیر۔

نیست آں بسم اللہ دیباچہ معنی ولفظ — ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر

غیر ممکن طالب دیدار را شام وسحر — اندریں فرقت سرایک لحظہ راحت بے دبیر

نے دل رنجور را آرام بے وصل حبیب — نے مذاق زندگانی را حلاوت بے دبیر

مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت

آسماں بے مہرو دیہیم فصاحت بے دبیر

تمام ہندوستان میں دبیر وانیس آفتاب و ماہتاب کہلاتے تھے۔کبھی اُن کو آفتاب کہتے تھے کبھی اُن کو۔جناب سید حسین مرزا صاحب عشق مرحوم نے ایک رباعی اُسی زمانے میں فرمائی تھی۔جو حسب ذیل ہے:۔

رباعی آغا عشق مرحوم

ہے نظم کے جوہر کا خزینہ خالی + گویا جگر ودل سے ہے سینہ خالی

اے عشق نہیں ہیں جو انیس اور دبیر + ہے شمس و قمر سے یہ مہینہ خالی

حقیر ثابت نے بھی تاریخ کہی تھی۔جس میں سے فقط دو مصرع آخر کے عرض کرتا ہوں ہر مصرع میں سے سال وفات نکلتے ہیں۔

آسماں بے ماہ تاباں سدرہ بے روح الامیں

طور بے موسے۔ادب بے شمع۔منبر بے دبیر

اس موقع پر انصاف کا خون ہوگا۔اگر میں یہ ذکر نہ کروں۔کہ فخر خاقانی وقاآنی جناب سید احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم نے جو قطعہ تاریخ وفات مرزا صاحب فرمایا ہے۔وہ (۱۰۷) شعر کا ہے۔اور ہر شعر لاجواب ہے۔اس کے بعض شعروں میں اُس بشارت کا بھی ذکر فرمایا ہے۔جو انکو

مؤ مرزا صاحب مرحوم کا مصرع تھا۔ آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین۔ میں نے کامل کی جگہ تاباں لکھ کر ۱۲۹۲ھ نکال لئے۔ یہ بھی اُنہیں مرحوم کی رُوح اور بالواسطہ تلمذ کا فیض ہے۔ کہ گویا اُنہیں کے مصرع میں سے ایک لفظ کی تبدیل سے تاریخ بے کم وکاست بے تکلف نکل آئی۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہُوئی تھی۔ اور جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ خواب میں فرقانی مرحوم کے روبرو جناب رسول خداؐ نے جناب علی مرتضےٰؑ سے پوچھا کہ ہمارا مداح ہندوستان میں آج کل کون ہے۔ اُن جناب نے جواب دیا۔ کہ دبیر۔ اور ایک اور شاعر اہلبیتؑ کا نام لیا تھا جناب فرقانی نے یہ خواب ۱۲۸۴ھ میں دیکھا تھا۔ مگر مرزا صاحب کے مرنے تک ظاہر مصلحتاً ظاہر نہیں کیا تھا۔ میرے معزز دوست فرقانی کے لختِ جگر سید کرار حسین صاحب روحانی دام مجدہ لکھتے ہیں۔ کہ یہی وجہ تھی۔ کہ اُن کو مرزا صاحب سے محبت اور حسن عقیدت تھی۔ اور دُوسرے شاعر اہلبیتؑ کا نام اس قصیدہ میں بھی ظاہر نہیں کیا۔ کہ وہ بزرگوار اُس زمانہ میں زندہ تھے۔ رُوحانی دام مجدہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ والد مرحوم نے وہ دُوسرے مدّاح مقبول جناب مفتی میر عباس صاحب شوستری لکھنوی طاب ثراہ بتلائے تھے۔ خیر اب اخیر کے چند شعر اس قطعہ کے سُنئے۔ جس کے ہر مصرع اخیر میں سے تاریخ نکلتی ہے:۔

خضر چنیں گفت بمرگ دبیر ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) مجفر بسر چشمۂ احساں رسید

ز نفس الیاس وچہ نیکو نفس ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) تن بہرم رُوح بجاناں رسید

گفت امام فصحائے عرب ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) مور فصاحت بسلیماں رسید

گلشن فردوس چنیں داد بوے ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) شیفتہ جاں بلبل جاناں رسید

واں قلم تعزیتش گفت دُر ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) بر علم شاہ شہیداں رسید

نیز ز فرقانی فانی شنو ۔۔۔ (۹۲ + ۱۲) عاشق صادق بر سلطاں رسید*

فرقانی مرحوم نے فارسی و عربی کی کئی لاجواب تاریخیں اور بھی فرمائی ہیں۔ مگر از بسکہ کلیات اُن مرحوم کا چھپ گیا ہے۔ (اور اُن کے علم دوست فرزند سید کرار حسین صاحب

* اس موقع پر میرے دوست روحانی تحریر فرماتے ہیں۔ اے کاش مرزا دبیر مرحوم ایک دفعہ پھر زندہ ہو جاتے اور اس قطعہ تاریخ کو جو بیشک اعجاز سخن ہے۔ ایک نظر ملاحظہ فرما لیتے۔ درحقیقت یہ قطعہ اُسی طرح لاجواب ہے۔ جیسے حضرت دبیر و جناب فرقانی بے نظیر تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

رُوحانی جنرل سپرنٹنڈنٹ صاحب گورکھپور کی توجہ خاص و صرف زرِ کثیر سے نہایت خوشخط عمدہ کاغذ پر چھپا ہے۔ اس لئے ہر شخص اُس کو دیکھ سکتا ہیں اور تاریخیں تو اس موقع پر نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ مگر اُردُو کی دو تاریخیں اُنہیں کے دو نور نظر لخت جگر کی تصنیف لکھتا ہُوں۔ جو انیسؔ و دبیرؔ کی تاریخیں ہیں۔ اس میں کمال یہ کیا ہے۔ کہ ایک مصرع مشہور میر انیس مغفور سے ایک لفظ کے تغیر و تبدیل سے دونوں بزرگواروں کی تاریخیں ایک صاحب نے نکالی ہیں۔ اور دُوسرے صاحب نے دُوسرے مصرع مشہور دبیر مرحوم سے خود دبیر مرحوم کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ سچ ہے الولد سرّ لابیہ ایسے کامل باپ کے ایسے ہی لائق فرزند ہونے چاہئیں +

سید سجاد حسین ریحانی مرحوم*		سید کرار حسین رُوحانی دام مجدہٗ
انیس	طبع ریحانی نے لکھی ہے یہ تاریخ انیس ہائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا ۱۲۹۱	یا شاہ زمن لطف کی ہو جائے نگاہ دروازہ دولت پہ فقیر آیا ہے
دبیر	نکلی یوں مصرع مذکور سے تاریخ دبیر وائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا ۱۲۹۲	تم سے ہے امید گل سے ہے قطع نظر تحصیل سعادت کو دبیر آیا ہے ۱۲۹۲ دبیر

تاریخ ریحانی مرحوم و روحانی سلمہ اللہ

فصل ۱۱

مقبرۂ دبیر مرحوم

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا　　کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چتر زریں　　تربت پہ نہ اُن کی شامیانہ دیکھا

سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد لکھنؤ سے مرزا صاحب کو ملا کرتا تھا۔ اور کچھ اور آمدنی

---

* سید سجاد حسین مرحوم (ریحانی) بھی بڑے پایہ کے شخص تھے۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی میں اچھی دستگاہ تھی میرٹھ سے طوطی ہند مدت تک نکالتے رہے جس میں کبھی کبھی حقیر بھی مضمون بھیجتا تھا۔ ۱۳۱۱ھ میں جب میں عتبات عالیات گیا ہُوں۔ تو میرا سفر نامہ نثر بھی مدت تک اُسی اخبار میں آپ مرحوم چھپواتے رہے اب اُسی طرح سید کرار حسین صاحب دام مجدہ نظر کرم فرماتے ہیں۔ اس کتاب کے لئے یہ سب مصالح انہیں نے فراہم فرما کر ارسال فرمایا۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہُوں۔ خدا جزائے خیر دے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

حسبِ مذکورہ تھی۔ اور مرزا صاحب مرحوم اپنے اور اپنی فیاضیوں کی دو یادگار چھوڑ گئے تھے۔ ایک اپنے نورِ نظر لختِ جگر مرزا اوج صاحب (مدظلہ) کو دُوسرے کثیر قرضہ کو۔ بعد مرزا صاحب مرحوم کے بعض منتظمان حسین آباد نے ایسی شرائط پیش کیں۔ جن کی تعمیل کرنا جنابِ مرزا اوج صاحب قبلہ نے خلافِ اخلاق و انسانیت و وضعداری سمجھا۔ یعنی سب سے بڑھکر یہ شرط تھی۔ کہ عشرۂ محرم میں لکھنؤ سے باہر نہ جایا کریں۔ [کیونکہ پہلی شرط کو کہ درباری کلاہ سے مرزا اوج صاحب آکر پڑھا کریں (مرزا صاحب موصوف کے اس عذر پر کہ میرے والد مرحوم نے اور میں نے کبھی ایسا نہیں کیا) واپس لینے پر اکثر متولی طیار تھے] لکھنؤ سے عشرۂ محرم میں باہر نہ جانے کی شرط کو مرزا اوج صاحب نے اس لئے خلافِ وضعداری سمجھا۔ کہ جناب (دبیر) مرحوم وصیّت فرما گئے تھے۔ کہ پٹنہ عظیم آباد کا جانا تم خود نہ چھوڑنا۔ اور یہی وعدہ خود اُنہوں نے سیّدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ مرحومہ سے فرمایا تھا۔ کہ تاحیات مَیں آؤنگا۔ اور میرے بعد میری اولاد انشاءاللہ حاضر ہوگی۔ اُس وقت وصیت کے موافق حسین آباد کے وثیقہ کو مرزا اوج صاحب نے چھوڑ دیا۔ اور پٹنہ عظیم آباد عشرۂ محرم میں ہمیشہ جاتے رہے۔ اور جاتے ہیں۔ جناب نواب سید عباس صاحب سعید دام اقبالہٗ رئیس عظیم آباد جو سیّدہ ممدوحہ کے جانشین اور ذیعلم نواسے اور مرزا اوج صاحب قبلہ کے شاگرد رشید اور قدرشناس ہیں۔ ویسی ہی عزّت و قدر کرتے ہیں ÷

نواب سید عباس صاحب سعید رئیس عظیم آباد کی قدردانی

پس قرضہ کی کثرت اور آمدنی کی قلّت کی وجہ سے یہ مقبرہ ایک چھوٹا سا مکان تھا اور رہے ٭ مرزا صاحب مرحوم کے فدائیوں میں داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم اور

٭ پہلے خام تھا۔ اب پختہ ہے۔ مگر بہت مختصر۔ اور اُس میں کبھی جنابِ مرزا صاحب مرحوم کے اعزہ میں سے بعض صاحب مع مستورات رہتے ہیں بعض وقت بعض معتقدین آتے ہیں اور قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر پردہ نہ ہونیکی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں بعض صاحب مجھ سے اس کا افسوس فرماتے تھے۔ اور مَیں خود بھی اسی سبب سے اکثر قبر پر فاتحہ خوانی سے محروم رہا ہوں ÷ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب اور نواب آغا علی خاں عرف آغائی و ناظم صاحب تھے۔
ان لوگوں نے مرزا اوج صاحب سے بار بار خواہش کی۔ کہ ہم پختہ مکان عالیشان مقبرہ
کا بنوادیں۔ مگر انھوں نے منظور نہیں فرمایا۔ اور یہی عذر فرمایا۔ کہ وصیت جناب
مرحوم کے موافق جب کبھی جس حیثیت سے بنواؤنگا۔ میں بنواؤنگا۔ ایک خواجہ سرائے
شاہی بڑے مالدار میاں فیروز الدولہ ساکن گولہ گنج لکھنؤ تھے※۔ انھوں نے ایک روز
زبردستی ایک ہزار روپیہ کا توڑہ مرزا اوج صاحب کی پینس میں (جب کہ مرزا اوج صاحب
ان کے یہاں کسی تقریب سے گئے تھے) رکھ دیا۔ اور یہاں تک مصر ہوئے۔ کہ اگر آپ
یہ روپیہ لیکر مقبرہ نہ بنوائینگے۔ تو میں اپنا خون کر لونگا۔ مرزا اوج صاحب اُس وقت وہ
توڑہ لے آئے۔ مگر پھر دو تین روز کے بعد جب سمجھ لیا۔ کہ اُن کا غصہ دھیما پڑ گیا ہوگا
وہ توڑہ مع معذرت نامہ کے اُن کے پاس بھیج دیا۔ اور لکھ دیا۔ کہ وصیت جناب مرحوم
مانع ہے +

یہ حکایت میں نے اس غرض سے لکھی ہے۔ کہ مولوی اشہری صاحب نے
اپنی کتاب حیات انیس میں رؤسائے لکھنؤ وغیرہ کو میر صاحب کی یادگار قائم کرنیکی
طرف توجہ دلائی ہے۔ جس سے غالباً مراد کسی عالی شان عمارت کی معلوم ہوتی ہے۔
اور عمارت یادگار سب سے بہتر مقبرہ ہے۔ کہ اور بھی صاحبوں کو اس کا افسوس ہے۔
مگر اُن لوگوں کو معلوم نہیں۔ کہ ان باکمال غیرتمندوں کے وارث بھی ویسے ہی
صاحب غیرت ہیں۔ کہ اس قسم کی اعانتوں کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں۔ ورنہ
اب تک نہ معلوم کس شان و شوکت کے ان کے مقبرے طیار ہو جاتے۔ ہر چند
صاحب مزار کو اس کی حاجت نہیں۔ وہ زبان حال سے گویا کہ رہے ہیں۔ بقول سحر ۵

یادگار انیس و دبیر مرحومین

※ ان کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں ماہانہ مجلس پڑھا کرتے تھے۔ یہ مرزا صاحب کے معتقد تھے۔
اُوپر مفصل ذکر ان کے یہاں کی مجلس کا ہو چکا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے + یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے*

اُن کے کمال کی یادگار اُن کے مختلف کلام ہیں۔ جو دلوں پر اپنی یادگار قائم کئے ہوئے ہیں۔ اور جن کے سکّہ اہل زبان کی زبانوں پڑے ہوئے ہیں۔ (بقول مؤلف) ؎

زبانوں پہ لفظ اور دلوں پہ ہو سکّہ + یہ لطفِ زباں ہے یہ حسنِ بیاں ہے

باب ہفتم۔ مرزا صاحب مرحوم کی ترقی سخن کی مثالیں اور رنگا رنگ کلام کا بیان

فصل ۱ رنگا رنگ کلام و ترقی سخن کی مثالیں

حقیر کے نزدیک اچھے کلام کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) مزہ دار سادہ۔ وہ کلام جس میں سادگی کے ساتھ مزہ ہو۔ سادگی کے ساتھ مزہ کی قید اس لئے میں نے لگا دی ہے۔ کہ ایسا کلام نہ ہو۔ جیسا یہ مشہور شعر ہے ؎

دنداں تو جملہ در دہانند + چشمان تو زیر ابروانند

(۲) مؤثر۔ وہ کلام جس کو سُن کر اثر پیدا ہو۔ خواہ طبیعت میں خوشی کا بیان سُن کر خوشی کا کچھ اثر ہو۔ خواہ غم کا حال سُن کر دل کچھ محزون ہو +

(۳) دردانگیز یا مسرت خیز۔ جس کو سُن کر آدمی مارے غم کے بے چین یا خوشی کے

*اس موقع میرے کرم فرماؤں اور علم دوست احباب نے مجھ سے بحث کی اور فرمایا کہ اس زمانہ کی رفتار کے موافق میر و مرزا کی یادگار مقبرہ عالیشان یا اور کوئی چیز محض اہل لکھنؤ کو نہیں بلکہ تمام ممالک متحدہ کے روشن خیال اہل علم کو بنوانا لازم و واجب ہے خواہ اُن کے وارث راضی ہوں یا نہ ہوں۔ ورنہ ہم لوگوں کی جہالت اور ناقدردانی اہل کمال پائی جاتی ہے جو قابل افسوس ہے۔ اسی طرح مرزا غالب مرحوم کا مقبرہ یادگار قائم ہونے کی تحریک علم دوست روشن خیال مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے چند انگریزی اخباروں میں فرمائی اور کچھ تھوڑا سا وعدہ بھی چندہ کا بعض لوگوں نے کیا۔ مگر سرانجام نہ ہوا۔ ہماری ناقدردانی اہل کمال پر واقعی افسوس ہے ؎ کریماں را بدست اندر درم نیست۔ خدا وندان دولت را کرم نیست + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سبب سے آپ سے باہر ہو جائے۔ اسی طرح الفاظ کی تین قسمیں ہیں۔ دلگداز۔ دلچسپ۔ دلکش۔
مگر ہر صورت میں یہ شرط ہے۔ کہ سننے والا بھی صحیح مذاق سخن رکھتا ہو۔ دل رکھتا ہو محض منجمد خون کا
قطرہ بھی ہو نہ ہو۔ ورنہ جس کو مذاق صحیح حاصل نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک گھاس کٹی تو پولہ
کٹا تو سب برابر ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ جن لوگوں کے دلوں میں مثل ابولہب و ابوجہل
وغیرہ کے مادۂ قبولیت نہیں تھا۔ اُن پر کلام خدا (قرآن مجید) کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔* دلکش یا
درد انگیز کلام کی نسبت کسی شخص کا یہ شعر مشہور ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم + ورائے شاعری چیزے دگر ہست

یہی چیز دیگر کہیں زبان کی شیرینی کہلاتی ہے۔ کہیں طرز بیان کی خوبی کا خطاب پاتی ہے کبھی
اس کو نازک خیالی کہتے ہیں۔ کبھی سین دکھلانے اور تصویر کھینچ دینے سے تعبیر کرتے ہیں +

فصل ۲ مرثیہ کے مختلف مقامات کی تعریف

مرثیہ اردو فی زمانہ کیا چیز ہے۔ اُس کی مختصر تعریف یہ ہے۔ کہ تمام اقسام سخن غزل
قصیدہ۔ مثنوی۔ ناول۔ ڈرامہ۔ حکایت و روایت واقعی جس نظم میں جمع ہیں۔ اب اُس کا نام
مرثیہ ہے۔ اور وہ زیادہ تر شہدائے کربلا کے حال میں کہا جاتا ہے۔ مرثیہ کے حصہ مختلف
رنگ کے ہوتے ہیں۔ جن کو مرثیہ گویوں کی اصطلاح میں (۱) چہرہ (۲) رخصت (۳)
سراپا (۴) آمد (۵) رجز (۶) لڑائی (۷) بیان شہادت یا بین کہتے ہیں +

مطلع و چہرہ مرثیہ کا

(۱) مرزا صاحب مرحوم چہرہ بہت شاندار کہتے ہیں۔ اور مطلع ہر مرثیہ کا نہایت پھڑکتا
ہوا ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کا اور بالخصوص مولوی احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم کا یہ اعتقاد
ہے۔ کہ مرزا صاحب سے بڑھ کر مطلع مرثیہ کسی مرثیہ گو کا نہیں ہوتا۔ اور اکثر مرثیوں میں وہ نئے
انداز کا مطلع کہتے ہیں۔ میں نے جا بجا اس کتاب میں اُن کے مرثیوں کے مطلع لکھے ہیں۔

* ملٹن کا یہ قول مشہور کہ سب سے عمدہ نظم وہ ہے۔ جو سادہ۔ نازک خیال۔ موثر ہو۔ ایک حد تک قابل
قبول ہے۔ مگر تینوں صفات ایک ہی کلام میں جمع ہونا اور سب کلام بشر ایک ہی رتبہ کا ہونا محال ہے جس شاعر کے کلام میں
معقول حصہ ایسے عمدہ کلام کا ہے وہ ضرور قابل مدح ہے۔ ورنہ شاعر نہیں تگ بند ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

مطلع میں براعت استہلال

اُن پر غور کرنے سے میرے قول اور اس مشہور مقولہ کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ چہرہ میں شوکت دار (مگر موثر) الفاظ لانے سے کلام مرصع ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی مطلع میں صنعت براعت استہلال کا التزام کرتے ہیں۔ کہ اگر صحیح المذاق سامع ہے۔ تو سمجھ لیتا ہے۔ کہ (آئندہ) مرثیہ اس حال میں ہوگا۔ وہ الفاظ جو قصیدہ کے واسطے ہیں اکثر چہرہ میں نظم فرماتے ہیں جس سے سامعین کے دلوں کو ایک حظّ خاص حاصل ہوتا ہے۔ اور دل آئندہ کلام سُننے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ اور تمہید مرثیہ کی بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ پھر جس موقع پر تمہید ختم کر کے وہ رخصت وغیرہ (اصل حال) شروع کرتے ہیں۔ وہاں قصیدہ کی تشبیب و گریز کا لطف آتا ہے ✣

(۲) رخصت

(۲) **رخصت** کے موقع پر وہ اکثر سادہ مگر مزہ دار دلگداز الفاظ لاتے ہیں۔ اگر (مخدراتِ عصمت میں سے) کسی بی بی کی زبانی کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو اکثر وہی الفاظ وہی محاورے لاتے ہیں۔ جو محلات شاہی میں رائج تھے۔ یا دہلی و لکھنؤ کی شریف زادیاں بولتی تھیں۔ اور اکثر اب بھی اُسی طرح بولتی ہیں۔ رسم و رواج سے بھی اس موقع کو زیادہ تعلق ہے۔ مرزا صاحب کے بزرگ شاہان دہلی کے اتالیق تھے۔ اور خود مرزا صاحب کی شاگرد اکثر شاہزادیاں اور محلات شاہی کی باعفت بیبیاں تھیں[1]۔ اس لئے جس قدر عورتوں کے رواجوں سے وہ واقف تھے شاید کوئی دُوسرا شاعر واقف ہوگا۔ اکثر رخصت کے موقع پر اور جا بجا ہند و شیریں اور جناب فاطمہ زہراؑ کے حالات کے مرثیوں میں اُنہوں نے زبان محلات شاہی اور شریف عورتوں کے رسم و رواج کی کیفیت جُوں کی تُوں دکھا دی ہے۔ رواج میں کہیں ہندوستان کی عورتوں کا برتاؤ بیان کیا ہے۔ کہیں عرب کا رواج مدنظر رکھا ہے[2] ✣

[1] اور اُن کی والدہ لکھنؤ کے ایک شریف خاندان کی بیٹی اور اُن کی زوجہ میر انشاء اللہ خاں مرحوم کی حقیقی نواسی تھیں۔ عورتوں کے صحیح محاورے اور رواج عورتوں ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں ✣ ۱۲ مؤلف حقیر

[2] اس کی مختصر مثالیں مَیں نے اسی جلد اول میں اور بکثرت نظائر جلد ثانی میں پیش کئے ہیں۔ اور جلد ثانی میں ہند کے حالات زندانِ شام کے مرثیوں کا انتخاب کثرت سے اسی خیال سے کیا ہے۔ جو دیکھنے کے قابل ہے ✣ ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) سراپا میں اکثر صنائع و بدائع لاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ مضامین خیالی کو نازک خیالی کے معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا مینہ برساتے ہیں۔ اور ایک خاص امتیاز جو اُن کے مرثیوں میں (اکثر) نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ امام حسینؑ یا اُن کے کسی عزیز یا رفیق کی سراپا میں وہ شان دکھاتے ہیں۔ جو دُنیا کے اعلےٰ ترین یا اشجع آدمی سے بھی بڑھی ہُوئی ہو +

(۴) آمد میں بھی وہی خیال وہی انداز قائم ہے۔ کہ وہ اپنے عقیدہ میں (جس کی گواہی صحیح تاریخ عالم دے رہی ہے) امام حسینؑ کو روئے زمین کے بہادروں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں محض بہادر ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اُن کو روئے زمین پر خدا اور رسولؐ کا قائم مقام بھی جانتے ہیں۔ جن کے جلال و جبروت کا اثر ہر شے میں ہے۔ آمد رزم کو سُننے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فوج کوفہ و شام کے ہزاروں یا لاکھوں بُزدل آدمی تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور آدمیوں کے دلوں کے اثر سے ہر چیز میں خوف و خطر بیٹھ گیا ہے۔ اور اگر وہ آمد علمدار فوج خدا یا ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ یا قاسم ابن حسنؑ کی ہے۔ تو ان شاہزادوں کی ان کے رتبہ کے موافق شان شجاعت و ہیبت دکھاتے ہیں۔ جو امام حسینؑ سے کم مگر بہادر سے بہادر آدمی سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی ہے۔ اب اس کو ناواقف راز چاہے مبالغہ یا حسن اعتقاد یا ما فوق العادہ یا خلاف قدرت (ان نیچرل) سمجھے یا کہے۔ مگر ہر کلام کا اندازہ متکلم کے خیالات کی بنا پر صحیح المذاق کرتے ہیں۔ آمد کے موقع پر شوکت دار اور ہیبت ناک الفاظ اور چُست بندشیں سامعین کے دلوں پر بہت کچھ اثر کر جاتی ہیں۔ جو باتیں بیان میں نہیں آسکتی ہیں +

(۵) رجز میں عموماً وہ الفاظ لاتے ہیں۔ جو بلاغت کے کانٹے پر تلے ہُوئے ہوں۔ الفاظ فصیح و عالمانہ اور مضامین عالی ہوں۔ اگر امام حسینؑ کا رجز ہے۔ تو اُس میں اس بات کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ کہ اُن کی مصیبتِ واقعی یا پیاس کا بھی بیان ہو۔ تو کوئی کلمہ زبان قلم سے ایسا نہ نکلے۔ جو منصب امامت کی شان کے شایاں نہ ہو۔ اور شہدائے بنی ہاشم یا بہادر

(۳) سراپا

(۴) آمد

(۵) رجز

رفیقوں کے رجز میں اُن کے مرتبۂ عالی کا لحاظ رہتا ہے +

(۶) لڑائی کے موقع پر بھی ہیبت ناک الفاظ لاتے ہیں۔ جس سے سامع کو گمان ہوتا ہے۔ کہ میدان جنگ سامنے ہے۔ تلواروں کی بجلیاں اور برچھیاں چمک رہی ہیں۔ گرز اُٹھے ہوئے ہیں۔ تیر سن سن جا رہے ہیں۔ اگر کسی پہلوان کی لڑائی ہے۔ تو اُس کے قابل لاحول ڈیل ڈول اور طاقت کی تصویر نہایت مختصر لفظوں میں کھینچ دیتے ہیں +

(۷) ادراسی

مگر مرزا مرحوم میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ دیکھی گئی۔ کہ آمد ہو یا رجز ہو۔ یا سراپا یا رزم ہر موقع پر وہ دو ایک بند یا دو چار مصرع ایسے کہ دیتے ہیں۔ جن کو غم انگیز کنایہ اشارے کہتے ہیں۔ اور یہی چیزیں مرثیہ کی جان ہیں۔ کیونکہ مرثیہ وہی ہے۔ جس میں ہر مقام پر مرثیت یعنی بَین کا پہلو قائم رہے۔ اس کی مثال یہ سمجھئے۔ کہ امام حسینؑ سے ایک پہلوان یزید ابطحی (ابطح پتھریلی زمین کو کہتے ہیں۔ شاید وہ یا اُس کے باپ دادا کسی ایسے ہی پتھریلے (کوہستانی) مقام کے باشندے ہونگے) امام حسینؑ سے لڑنے کو آیا ہے۔ وہ اور باتیں رجز وغیرہ کی کہکر اور امام حسینؑ سے جواب سُنکر (کہتا ہے)۔

مثال طرز خاص دبیر

یُوں گرمِ سخن نورِ خدا سے ہُوا ناری
لاریب اجل اب ہے ہماری کہ تمہاری*
یاں فوج ہے سب لاش اُٹھانیکو ہماری
تم بھی کسی یاور کو بُلا لو پئے یاری
جب تیغ مری۔ آپ کی تصویر مٹا دے
لے جا کے تمہیں گنج شہیداں میں لٹا دے

قاسمؑ کو بُلا لیجئے؟ عباسؑ علی کو
خیمے سے طلب کیجئے ہمشکل نبیؐ کو
شہ بولے کہ تم لوگوں نے چھوڑا ہے کسی کو
شمشاہ ہے کے بھی غم میں گُڑھایا مرے جی کو
مَیں نے ہی سبھوں کے تن صد پاش اُٹھائے
باقی نہیں کوئی۔ جو مری لاش اُٹھائے

* رزم میں مرثیت کا پہلو دیکھئے + ۱۲ مؤلف حقیر

(۷) شہادت و بین - یہ بات مشہور ہے - کہ مرزا صاحب تمام مرثیہ گویوں سے بہتر شہادت و بین کہتے ہیں - پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی بہت شرح و بسط سے اس کو دبیر و انیس کے حالات کے اخیر میں بلکہ تمام آب حیات کے خاتمہ پر بیان فرمایا ہے - جو آب حیات کا دور آخر بلکہ جام آخر سمجھنا چاہئے - اور مرثیہ کی جان یہی ہے - اس لئے میں اس مقام کو ذرا شرح و بسط سے بیان کرنا چاہتا ہوں - (تاکہ زمانہ حال کے مرثیہ گویوں کے واسطے وہ دستور العمل کا کام دے - کیونکہ آج کل یہ شکایت زبانوں سے ترقی کر کے اخباروں میں چھپ کر عام ہو گئی ہے - کہ آج کل کے مرثیوں میں سب کچھ ہوتا ہے - مگر بین یا مرثیہ نہیں ہوتی) اصل مطلب سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سن لیجئے - زمانہ حال کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے - کہ ہر سکنڈ (ثانیہ) میں قریباً ایک آدمی مر جاتا ہے - (قریباً) ایک پیدا ہوتا ہے - پس کیا عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے - کہ ہر اچھے بُرے آدمی کا سوگ رکھا جائے - ماتم کیا جائے - نہیں ہرگز نہیں - بلکہ اُس شخص کا سوگ رکھنا (قانون اخلاق کے موافق) ضرور ہے - جو دُوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہو - نیک ہو - جس طرح ایک سے بڑھ کر دُوسرا بد آدمی دیکھنے میں آتا ہے - یہاں تک کہ بدترین خلائق کے مقابلہ میں ایک معمولی بد آدمی کو اچھا یا غنیمت سمجھا جاتا ہے - اُسی طرح نیکوں اور نفع پہنچانے والوں کے درجہ ہیں - پس جو بزرگوار سب اہل دُنیا سے بڑھ کر نیک اور نفع رساں ہو - وہ ہم مسلمانوں کے نزدیک پیغمبر خدا صلعم کا جانشین حقیقی ہے - کوئی اُس کو خلیفہ کہتا ہے - کوئی امام - کوئی غوث* - پس ۶۰ ہجری میں خلیفہ برحق اور امام اور غوث سب یا اکثر مختلف العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک امام حسینؑ ہی قرار پاتے ہیں - افسوس کا مقام یہ ہے - کہ ایسے مقدس نبیؐ کے نواسے کو اُنہیں لوگوں نے جو اُن کے نانا کا کلمہ پڑھتے تھے تین دن کا بھوکا پیاسا محض دُنیا کے لالچ سے یزید اور ابن زیاد وغیرہ چند دُنیاداروں بدکاروں کا ساتھ دیکر ایسا

* صوفیوں کی اصطلاح میں اُس کو غوث کہتے ہیں - اور شیعہ امام و خلیفہ کہتے ہیں اسی طرح اور فرقہ مسلمانوں کے کوئی خلیفہ کوئی امام کہتا ہے - مولف

شہید) قتل کر دیا۔ امام حسینؑ اور اُن کے بہتّر بہادر ساتھیوں نے کربلا میں وہ دادِ شجاعت دی ہے۔ اور حق کی ایسی طرفداری کی ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ پس جب کہ اُن کے اخلاق۔ شجاعت۔ صبر۔ عبادت۔ سخاوت وغیرہ کا رُوئے زمین پر نظیر نہیں ہے۔ تو ضرور ہے کہ اُن کا بیان بھی اس خوبصورتی سے کیا جائے۔ جو عام لوگوں سے اعلےٰ اور بالا ہو۔ اور الفاظ بھی ایسے لائے جائیں۔ جو اگرچہ زبان و لغت میں داخل ہوں۔ مگر بظاہر وہ فرشتوں کی زبان معلوم ہوتی ہو۔ اس کو بعض آدمی شوکت الفاظ کہتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ بلاغت کی جان یہی ہے۔ ملا محتشمؒ اور مقبولؒ کے کلام میں یہی بات ہے۔ اس لئے وہ محتشم و مقبول ہوئے۔ مَیں اس موقع پر فقط ایک شعر ان دونوں بزرگواروں میں سے ایک آخر الذکر مداح کا لکھتا ہوں۔ ؎

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں اُفتاد ✦ اگر غلط نکنم عرش بر زمیں اُفتاد

اگر شاعر فقط اتنا ہی کہدیتا۔ کہ حسینؑ بر زمیں اُفتاد۔ تو مطلب تو ضرور حاصل ہو جاتا۔ مگر ممدوح کی شان نہ معلوم ہوتی۔ اور جب شان اعلےٰ نہ معلوم ہوتی۔ تو دل پر چوٹ نہ لگتی۔ شاعر نے اول تو کہا۔ **بلند مرتبہ**۔ پھر شاہ کہا۔ پھر صرف زین نہیں کہا۔ بلکہ صدر زین کہا۔ اسی طرح ترقی دے کر ممدوح کی شان و رفعت دکھائی۔ پھر دُوسرے مصرع میں کہا۔ کہ اگر مَیں غلطی نہیں کرتا۔ تو یہ کہونگا کہ عرش خدا زمین پر گر پڑا۔ امام حسینؑ کو عرش سے تشبیہ دیکر رفعت پیدا کی۔ اب عرش کا گرنا یہ بتا رہا ہے۔ کہ اللہ اکبر۔ کس قدر عظیم الشان صدمہ پہنچا۔ اس لئے اس شعر کو سُنکر دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور امام حسینؑ کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ترکیب مرزا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اب مَیں ایک مشہور مطلع کا ایک پُورا بند مع شرح لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں ؎ جس دم نگین خاتم پیغمبراں گرا۔ ایک پیغمبراں کی شوکت دار لفظ فرمائی۔ پھر اُس پر ترقی یہ کی۔ کہ خاتم پیغمبراں کہا۔ خاتم (بفتح تا) انگوٹھی اور زینت کے معنی پر آتا ہے۔ یہاں خاتم پیغمبراں سے مراد جناب محمد مصطفےٰ صلعم سے ہے۔ پھر اُس پر ترقی

ملا مقبول کا مقبول شعر

مرزا صاحب کے مرثیہ کا ایک مشہور بند مع شرح

یہی۔ کہ اُس انگوٹھی کا نگینہ گر پڑا۔ وہ کون؟ امام حسینؑ۔ نگینہ انگوٹھی کے اُوپر رہتا ہے۔ یہاں امام حسینؑ اپنے نانا کی پیٹھ پر اکثر سوار ہُوا کرتے تھے۔ یہ شان اعلےٰ دکھا کر کہتے ہیں ع

رونق اُٹھی زمین سے امام زماں گرا۔ مذہب شیعہ کے موافق امام اور مذہب صوفیہ کے موافق غوث گویا تمام دُنیا کی جان ہے۔ ہر چیز اُس سے وابستہ ہے۔ پس فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ گھوڑے سے کیا گرے کہ دُنیا بھر سے رونق اُٹھ گئی۔ زمین و زمان میں جو نسبت و صنعت ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور نہایت بے تکلف ڈھلے ہُوئے لفظ لائے ہیں۔

اب جب یہ شان عالی دکھا چکے۔ تو ظالموں کے ظلم کی تشریح کرتے ہیں۔ ع گرنے پہ

سب گروہ لئے برچھیاں گرا۔ اب اس ظلم پر افسوس و تعجب ظاہر کرتے ہیں ع ہے ہے

ان جفاؤں پہ بھی آسماں گرا۔ یعنی ایسی جفائے شدید ہوگئی۔ اور پھر آسمان قائم رہا تعجب اور افسوس ہے۔ اب اس ظلم کی زیادہ تشریح کرتے ہیں ع زہراؑ سے پُوچھئے یہ قلق نور عین کا۔ ماں کو جو محبت ہوتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں ہوتی۔ اس لئے اُن کی مادر گرامی دختر جناب رسول خدا صلعم سے اس قلق کو پُوچھئے۔ ع تپنا زمیں کا اور تڑپنا حسینؑ کا۔ ادھر تو زمین تپ رہی تھی۔ ادھر امام حسینؑ زخمی پیاسے تڑپ رہے تھے۔

ظاہر ہے۔ کہ اس رفعت و شان کے بیان سے جو صدمہ سُننے والے کو پہنچیگا۔ وہ معمولی طور پر یہ کہنے سے کہ "امام حسینؑ گرم زمین پر گرے۔ ظالم برچھیاں لئے ہُوئے ٹوٹ پڑے" ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بلاغت کے نکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر شخص مجبور ہو کر یہ کہتا ہے۔ کہ جس قدر رقت مرزا صاحب کے مرثیہ پر مجلس میں ہوتی ہے۔ خواہ وہ سوز میں پڑھا جائے خواہ منبر پر۔ دُوسرے کے مرثیہ میں نہیں ہوتی۔ بعض صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شوکت دار الفاظ بہت لاتے ہیں۔ جس سے کم علموں کے سمجھنے میں پیچ پڑ جاتا ہے۔ دُوسرے شعراء اہلبیت صاف صاف کہتے ہیں۔ مگر اُن کہنے والوں سے یہ کون کہے۔ کہ ایسے ہی ایسے شوکت دار الفاظ لانے اور پیچ ڈالنے سے تو

دلوں پر چوٹ لگتی ہے۔ اور ممدوح کی شان معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ ہزاروں قتل بھی ہوتے ہیں۔ پیاسے بھی مرجاتے ہیں۔ سب کے واسطے نہ یہ سامان ماتم ہوسکتے ہیں۔ نہ یہ مجلسیں نہ مرثیے کیے جاتے ہیں ٭۔ المختصر مرزا صاحب بین میں شان ممدوح دکھلانے کا خاص التزام فرماتے ہیں۔ اور خاندان رسالت کے حفظ مراتب کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ اس کے سوا نہایت سریع الفہم اور آسان الفاظ لاتے ہیں۔ تاکہ بین کے مضامین و واقعات کو ذی علم و بے علم ہر ایک بخوبی سمجھے۔ زبان کی صفائی اور بیان کے عام فہم ہونے کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی لڑائی اور سراپا میں گویا دُوسرا مصنّف تھا بین میں دُوسرا شخص متکلم ہے۔ اور اس فرق کو وہ خود ایک رباعی میں کہ گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:۔

ہے رزم و سراپا تو زباں اور ہی ہے ✣ اور بَین کے مابین بیاں اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تری فکر دبیر ✣ کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بعض الفاظ دیکھنے میں بہت ہی کم وزن معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کثرت استعمال یا بندش وغیرہ کے لحاظ سے دل پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم جو ہمارے زمانے میں ایک شاعر اکمل مانے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر یہ چاروں مصرع (جو ایک پہلوان کی لڑائی کے موقع پر مرزا صاحب نے کہے ہیں) پڑھتے تھے:۔

ترچھا کبھی نیزے کو ہلایا کبھی آڑا ✣ پڑھ پڑھ کے رجز باغ فصاحت کو اُجاڑا
ظالم نے کئی پشت کے مُردوں کو اُکھاڑا ✣ بولا مری ہیبت نے جگر شیروں کا پھاڑا

٭ محرم و صفر سنہ ۱۳۲۳ ہجری کے شیعہ و اثنا عشری وغیرہ پرچوں کے ناظرین کو بعض مرثیہ گویان حال کی یہ شکایت ہے کہ اُن کے پڑھنے سے گل و بلبل مدح ذوالفقار مدح ذوالجناح سراپا وغیرہ کے بیان پر اس قدر مجلس میں واہ واہ ہوئی کہ مجلس ماتم محفل مشاعرہ سے بڑھ گئی۔ مگر جو علت غائی رقت دیکھا تھی وہ قطعی نہیں ہوئی۔ وہ لوگ اس مضمون پر غور کریں جبتک حال کے ایسے مرثیہ گو اس طرز خاص دبیر کی پوری تقلید و اتباع نہ کرینگے۔ مرثیہ کہنا نہ آئیگا۔ گو شاعر غزل گو اعلےٰ رتبہ کے ہوجائیں ✣ ۱۲ مؤلف حقیر

اور فرماتے تھے۔ کہ دیکھو کیسے بھونڈے قافیہ ہیں۔ مگر شان اُستادی و کمال کو دیکھو۔ کہ کس عمدگی سے بندش دی ہے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے کے واسطے اب اس سے بہتر الفاظ شاعر کو نہیں مل سکتے۔ واقعی جو پہلوان میدان جنگ میں آتا ہے۔ وہ جنگ کی اُمنگ میں نیزے کو کبھی ترچھا کبھی آڑا ہلاتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں اُس کی رجز خوانی کی ہجو کس خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں کی ہے۔ کہ باغ فصاحت کو رجز پڑھ کر اُجاڑا۔ رجز کے موقع پر عرب کا عام دستور تھا کہ اپنے باپ دادا کے نام لیکر کارنامے بیان کرتے تھے۔ اس کے واسطے خاص ایک روزمرہ اردو کا صرف فرمایا ہے۔ کہ کئی پُشت کے مُردوں کو اُکھاڑا۔ یعنی مُردوں کے حالات بیان کئے۔ غزل میں خواجہ آتش مرحوم نے بھی یہ روزمرہ ایک موقع پر خوب نظم کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

کہتے ہیں ذکر لیلی و مجنوں جو چھیڑئیے + چپ رہئے بس گور کے مُردے اُکھیڑئیے

اب وہ پہلوان اپنا اور اپنے باپ کا نام لیتا ہے۔

ہم پنجہ نہ رُستم ہے نہ سہراب ہے میرا + مرحب بن عبد القمر القاب* ہے میرا

وقت وقت کی ترقی سخن کی مثالیں

اب میں مرزا صاحب کی وقت وقت کی ترقی سخن کی مثالیں بیان کرنے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب نے جب سنہ ۱۲۳۰ھ یا سنہ ۱۲۳۲ھ کے قریب قریب مرثیہ کہنا شروع کیا۔ تو اُس وقت تک رزم و سراپا مرثیہ میں نہیں کہا جاتا تھا۔ ہر مرثیہ گو کی توجہ بین پر تھی۔ سب سے بہتر وہ مرثیہ گو سمجھا جاتا تھا جسکو مصیبت کے موقعوں کے روزمرے کثرت سے معلوم ہوں۔ کہ وہ موقع سے کھپا دے۔ مرثیہ اُس زمانہ میں ۱۲ یا ۱۵ بند سے لے کر ۳۵ یا ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ اس کی وجہ

*اس موقع پر جو بزرگوار اردوے معلے کی باریکیوں سے ناواقف ہیں وہ غالباً مولوی شبلی صاحب کی طرح یہ اعتراض فرمائینگے کہ القاب جمع ہے بجاے واحد کیوں باندھا گیا مگر اردوے معلے کے وارث شعراے دہلی و لکھنؤ وغیرہ جانتے ہیں کہ القاب اردو میں واحد کے موقع پر بولا جاتا ہے مثلاً روزمرہ میں کہتے ہیں۔ کہ تم اُن کا القاب کیا لکھا کرتے ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ابتدائی مشق کے مرثیہ مرزا صاحب میں سے کا جس نے شہرت پائی

یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اکثر مرثئے سوزخواں پڑھتے تھے۔ سُنا ہے۔ کہ ابتدائی مشق کے مرثیوں میں سے یہ مرثیہ مرزا صاحب کا بہت مشہور ہوا تھا ؎

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے*
ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا سوتی ہے

اس مرثیہ میں مادر علی اصغر کا اپنے بچہ کی یاد میں گھبرانا اور تنہا رونا بیان کیا ہے۔ چنانچہ رات اور تنہائی کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:۔

تصویر تنہائی اور رات کا سماں

تصویر تنہائی

سوگ[1] کا فرش ہے۔ اور سامنے[2] جلتا ہے چراغ | شانے[3] میں داغ رسن۔ سینے[4] میں اولاد کا داغ
جان[5] آزردہ میں دل رنج میں[6]۔ آشفتہ دماغ | نہ وہ گل[7] ہیں، نہ وہ غنچے[8]۔ نہ وہ زہرا[9] کا باغ

گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

اس سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا صاحب قدرتی شاعر تھے۔ اور بڑے بڑے واقعہ کو مختصر لفظوں میں تصویر کھینچ کر دکھا دینے کا جوہر قدرت نے اُن کی طبیعت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اب اضطراب کی چلتی پھرتی تصویر دیکھئے:۔

اضطراب

کبھی گوشے[1] میں وہ مُنہ ڈھانپ کے چلاتی ہے | اور کبھی صحن[2] میں گھبرا کے نکل آتی ہے
کوکھ[3] پکڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے | ڈھونڈتی[4] ہے مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے

تن کو لغزش[5] ہے جُدا۔ اور ہے مُنہ زرد[6] جُدا
دل تڑپتا[7] ہے جُدا۔ سینے[8] میں ہے درد جُدا

پھر علی اصغر کی ماں کہتی ہیں ؎

* بعض آدمی فرماتے تھے۔ کہ یہ مرزا صاحب کا پہلا مرثیہ ہے۔ بعض کہتے تھے۔ کہ پہلا یہ نہیں ہے مگر ابتدائی مرثیوں میں اس کی بہت شہرت ہوئی تھی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بوند پانی کے لئے ہائے تری جان گئی + اماں صدقے گئی۔ واری گئی۔ قربان گئی

پھر کہتی ہیں۔ ؎

تم نے بیٹا مری گودی کو کیا خالی + بخدا میرے حسابوں ہوئی دنیا خالی

میرے حسابوں خاص عورتوں کا محاورہ ہے۔ گو بعض مرد بھی بولتے ہیں۔ آگے چل کر

اپنی مصیبت میں محویت بیان کرتی ہیں۔ کہ ؎

مصیبت میں محویت

مَیں نہیں جانتی ہوتا ہے زمانے میں کیا + ہوں وہ بے خود کہ نہیں مجھ کو خبر ہوتی ہے

شام کب ہوتی ہے۔ کس وقت سحر ہوتی ہے

باوصف عطف و اضافت اعلان نون

اس زمانے میں باوصف عطف و اضافت بھی نون کا اعلان شاعروں میں جائز ہی نہیں تھا۔ بلکہ فصیح سمجھا جاتا تھا۔ کہ بولنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جزدانِ قرآن کے بولنے میں عام طور پر ہر شخص نون کا اعلان کرتا ہے۔ اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب بھی اُس زمانہ کے مرثیوں میں باوصف عطف و اضافت نون کا اعلان کرتے ہیں۔ اور بہت سے الفاظ اور ترکیبیں جو زمانہ مابعد میں متروک ہوئے۔ اور خود مرزا صاحب نے بھی ترک کر دئے۔ اُس زمانہ کے مرثیوں میں جو نظم کر چکے تھے۔ وہ یوں ہیں اب تک چلے آتے ہیں۔ گویا زبان حال سے اپنی تاریخ تصنیف بتا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر فہرست ایسے الفاظ کی پیش کرتا ہوں :۔

فصل ۵

فہرست بعض الفاظ کی جو خود مرزا صاحب نے بعد کے مرثیوں میں ترک کر دئے

نمبر شمار	مصرع	نمبر جلد	نمبر صفحہ	کیفیت
۱	بے گور پڑا رن میں شہنشاہ عرب ہے	۱	۱۹۸	پڑا اور ہے میں فصل ہے +
۲	ہوں مَیں اسد دل و جاں سے قربان علی	۲	۱۴۴	دل و جان میں عطف ہے۔ پھر بھی نون کا اعلان ہے۔ ہر چند دل اور جان بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اُس وقت تک ایسا اعلان فصیح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جو

نمبر شمار	مصرع	جلد نمبر	صفحہ نمبر	کیفیت
				دل وجان چھپا ہے۔ وہی صحیح پایا جاتا ہے +
۳	قیمت ان کی مجھے یا حیدر صفدر دیجے	۳	۱۰۵	دیجے بعد کو ترک فرما دیا۔ دیجئے لاتے ہیں +
۴	کربلا کو حرم سرور ذی شان چلے	۳	۱۶۵	ذی شان میں بحالت اضافت نون کا اعلان ہے۔ ہر چند بعض شعرا کا خیال یہ ہے۔ کہ یہ مرکب عربی کی لفظ ہے۔ اس لئے اس میں بحالت اضافت بھی اعلان نون جائز ہے۔ مگر بعد میں خود مرزا صاحب نے احتیاطاً ترک فرما دیا ہے +
۵	دین احمد مختار کا مقبول کیا ہے	۳	۱۹۰	بجائے قبول کیا ہے کے اُس زمانہ کا روزمرہ ہے +
۶	خوش ہونگے یا پُر ہیں آنکھوں کے ملنے سے	۴	۷۷	اب ایسے مقام پر ملنے سے بولتے ہیں۔ یہ پُرانا محاورہ تھا +
۷	وہ بولی تسلی تمہیں دے آتی ہے بھائی	۴	۲۱۸	اب یُوں بولتے ہیں۔ دینے آتی ہے یا دینا آتی ہے +
۸	دُھن کا محافہ جو لگا آن کے در سے	۹	۱۱۰	دُھن فعلن کے وزن پر۔ بعد کو ترک کر دیا۔ فعْل کے وزن پر رہا +
۹	وہاں سے جا کے بقبر رسول رو رو کر	۵	۱۹۳	بقبر کی ترکیب فارسی آمیز بعد کو ترک کر دی +
۱۰	باطل کو حق سے تیغ نے یُوں کر دیا پرے	۸	۱۷۴	پرے سے دہلی کا محاورہ ہے۔ لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مرزا صاحب کا بچپن کا محاورہ اُن سے نہیں چھوٹا۔ کہ دہلی کی پیدائش تھی۔ پانچ سات برس کی عمر تک وہاں رہے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء تک کے مرثیوں میں نظر آتا ہے +
۱۱	جب عنقریب دشت نجف کے ہوا گذار	۹	۱۴	عن قریب ایسے موقع پر بعد کو ترک کر دیا۔ اب صرف زمانہ

نمبر شمار	مصرع	نمبر صفحہ نتائج	نمبر بند	کیفیت
				کے لئے بولتے ہیں +
۱۲	یہ صدا آئی بگوشِ پسرِ شاہِ نجف	۵	۵۸	بگوشِ کی ترکیب کو بعد کو ترک کردیا +
۱۳	قتلِ حسینؑ ہیں تا خیراب ذری	۵	۱۶۸	ذری کو بعد میں ترک کردیا۔ ذرا ہر موقع پر آتا ہے +
۱۴	ہمسائے میں ترے ہیں یہ سب بھُوکی پیاسیاں			بجائے بھُوکی پیاسی کے بھُوکی پیاسیاں دہلی کی زبان کی ترکیب ہے۔ جو لکھنؤ والوں نے شیخ ناسخ رحمہ اور اُن کے معاصرین نے ترک کی۔ مرزا صاحب کے بھی بعد کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ جس میں یہ مصرع ہے۔ اُس کا مطلع یہ ہے ع جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہُوا +

سنہ ۱۲۴۰ھ کے قریب اور اُس کے بعد مرثیہ کی لے بڑھی۔ مرثیوں میں روایتیں نظم ہونے کے سبب سے مرثیہ ۵۰ بندوں سے آگے بڑھا۔ ستر اسّی بند کا ہونے لگا۔ یہ میر ضمیر مرحوم کا پہلا ایجاد تھا۔ روایت کے نظم کرنے میں علاوہ محاورہ بندی کے رسم ورواج کا بھی خیال کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کا مرزا صاحب کا یہ مرثیہ ہے۔ ؎

اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو

اس میں وہ روایت نظم کی ہے۔ کہ ایک شخص ایک ہرنی کا بچہ جناب رسول خدا صلعم کے واسطے تحفہ لایا تھا۔ (امام) حسنؑ پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے اُن کو دے دیا۔ وہ گھر لیکر پہنچے۔ اپنی ماں اور بھائی کو دکھایا۔ (امام) حسینؑ بھی مسجد میں آئے۔ کہ میرے حصہ کا بھی بچہ ہوگا۔ یہاں دُوسرا بچہ آہُو نہ پاکر اپنے ناز اُٹھانیوالے نانا سے رُوٹھ گئے۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولے۔ حضور صلعم نے پُوچھا۔ ؎

کس چیز کی خواہش ہے تمہیں کیا نہیں ملتا
دیکھو تو سہی ملتا ہے اب یا نہیں ملتا
سب کچھ یہیں موجود ہے فوراً جو کہے تو
بس دیر ترے ہونٹ ہلانے کی ہے گلرو

آگے تو نہ تھی ایسی تری رُوٹھنے کی خُو کیا لو گے بتاؤ؟ کہا شبیرؑ نے - آہُو

آہُو کہا اور لوٹ گئے خاک کے اُوپر

صدمہ ہُوا رُوحِ شہِ لولاک کے اُوپر

اب جناب رسول خدا صلعم اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ؎

سمجھا کے حسنؑ کو یہی آہُو تجھے دے دُوں وہ کہنے لگے کاہیکو لُوں - بھائی کیوں لُوں

لُوں ہیں تو کوئی اور ہی لُوں - ورنہ خفا ہُوں کم پیار ہمارا ہُوا - اور بھائی کا افزُوں

شہ نے کہا ہم اور ہی آہُو تمہیں دینگے

وہ بولے کہ وعدہ نہیں - ہم تو ابھی لینگے

نازوں کا پالا نواسا اپنے ناز بردار نانا سے ناز کرتا ہے۔

مانُونگا نہ میں دیجئے لاکھ آپ دلاسے ہوگا یہ گلہ - فاطمہؑ و شبیر خدا سے

اور دو ہمیں آہُو اگر الطاف و عطا سے پھر تم وہی نانا ہو وہی ہم ہیں نواسے

غمگین ہے بڑا آہُو جو ابھی پاتا ہے شبیرؑ

نانا کے گلے ہنس کے لپٹ جاتا ہے شبیرؑ

المختصر دُوسرا بچہ آہُو امام حسینؑ کے واسطے جب آیا - اور جناب رسول خداؐ نے ان کو عطا فرمایا -

تب سر کو جھکائے ہُوئے ہاتھوں کو بڑھایا باہیں گلے میں ڈال کے نانا کو سُنایا

اماں سے نہ کہنا کہ یہ گودی میں نہ آیا بابا سے نہ کہیو کہ مجھے اس نے ستایا

نازاں ہیں سب اطفال تو ماں باپ کے اُوپر

پر ناز ہمارے ہیں فقط آپ کے اُوپر

دُوسری روایت

یہ روایت آہُو نظم کرکے پھر اسی مرثیہ میں ربط دیکر امام حسینؑ کا سفر کرنا اور کربلا میں آنا اور شب عاشور عمر ابن سعد سردار لشکر یزید کو تنہائی میں بُلوانا اور اُس کا مع ایک فرزند اور ایک غلام کے آنا نظم کیا ہے جب حضرت کو معلوم ہوگیا - کہ وہ مقام خلوت

پرا گیا۔ تو آپ چلے۔ علی اکبرؑ ساتھ ہوئے۔ پوچھا۔ تم کیوں چلتے ہو۔ کہا اُس کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ آیا ہے۔ پھر آگے بڑھے۔ کہ پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ پھر کر دیکھا۔ کہ جاں نثار بھائی (حضرت عباسؑ) چلے آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نہ تکلیف کرو۔ مَیں اسد اللہ الغالبؑ کا فرزند ہُوں۔ میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔

عباسؑ نے کی عرض نہ مانینگے کبھی ہم ہمراہ عمر کے ہے غلام عمر اس دم
کس طرح مَیں چھوڑوں تمہیں اے سیدِ اکرم مَیں خاص غلام اور تم آقائے دو عالم
تم جاتے ہو۔ اعدا میں نہ ساتھ آؤں مَیں کیونکر
ایمان مرا جاتا ہے۔ پھر جاؤں مَیں کیونکر

مضمون کی ترقی و تنزل

اس مصرع آخر کے معنی کی بلاغت پر غور کیجئے۔ ایک معنی تو یہ ہُوئے۔ کہ خود امام حسینؑ کو اپنا ایمان قرار دیتے ہیں۔ کہ آپ میرے ایمان ہیں پھر مَیں ساتھ کیوں نہ چلوں۔ کیونکر پھر جاؤں۔ دُوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ میرے لوٹ جانے میں میرا ایمان جاتا رہیگا۔ مَیں ضرور ساتھ چلونگا۔ بعض صاحب مرزا صاحب کے کلام پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ بعض مضمون تو مرزا صاحب کے بہت بلند ہوتے ہیں۔ مگر پھر وہ سلسلہ ترقی مضامین کا قائم نہیں رہتا۔ اُس کے بعد مضامین گرے ہُوئے ہوتے ہیں۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ شاعر یا مبصر کلام شعرا ہو کر تو کوئی منصف مزاج ایسا اعتراض نہ کریگا۔ کیونکہ یہ بات تو کسی انسان (غیر معصوم) کے کلام میں ممکن نہیں۔ کہ سب کلام یکساں ہو۔ پھر مرزا صاحب کی تخصیص کیوں۔ بات یہ ہے۔ کہ جس بلندی پر پہنچ کر مرزا صاحب کا شہباز طبیعت شکار لاتا ہے۔ عام شاعروں کے شکرے وہاں تک رسائی سے مجبور ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ کبھی کبھی جب مرزا صاحب کو کوئی عالی درجہ کا مضمون مل جاتا ہے۔ تو پھر بہت دیر تک وہ خود بھی ویسے یا اُس سے بہتر مضمون لانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ ع یہی ہے فرق بندے اور خدا میں۔ آپ اسی مصرع کو دیکھ لیجئے۔ ع ایمان مرا جاتا ہے پھر جاؤں مَیں کیونکر کیا دُوسرے شاعر کے خیال میں آسکتا ہے۔ المختصر یہ روایت نظم فرمائی ہے۔ کہ امام حسینؑ نے ابن سعد کو بہت سمجھایا۔ اور اُس وقت وہ مکار نیم راضی بھی ہو گیا۔ کہ

ابن زیاد کو صلح کے لئے لکھیگا۔ مگر پھر صبح کو انجام یہ ہُوا کہ ؎

واں کفر کی صف۔ یہاں صف اسلام کھڑی تھی + اور فیصلے کو بیچ میں تلوار پڑی تھی

مرزا صاحب کی معلومات بہت بڑھ گئی تھی۔ کہ شاعری کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ اس لئے روایتیں (جو عربی زبان کے محفوظ صندوقوں میں مقفل تھیں) اُنھوں نے خوب خوب نظم کیں۔ اُن کے اور معاصر جو اتنی لیاقت علمی نہ رکھتے تھے۔ اُن کے مقابلہ کی کوشش کرتے تھے۔ مگر کچھ خداداد دماغ اور کچھ لیاقت علمی کے (کمال کے) سامنے اُن کا چراغ نہ جلتا تھا۔

مرزا صاحب نے خوب روایات خوب نظم

اب مرثیہ گوئی نے تیسرا پلٹا کھایا۔

سبب اپنی گوئی نے تیسرا پلٹا کھایا سراپا و رزم مرثیہ میں داخل ہُوا

جناب میر ضمیر صاحب مرحوم نے سراپا و رزم و طولانی رجز کو مرثیہ میں بڑھایا۔ اور چہرہ خاص آب و تاب کے ساتھ نظم فرمایا۔ تمہید بیان کر کے مطلب کی طرف گریز فرمائی۔ جس طرح قصیدہ میں ہوتی ہے۔ اور ان مضامین کے پڑھنے کے ساتھ مرثیہ کے بندوں کی تعداد بھی ۱۰۰ پر یا اس سے زیادہ (نمبروں) عددوں پر پہنچا دی۔ اور اُس کے ساتھ ہی صاف لفظوں میں یہ دعوے بھی کر دیا۔ کہ مَیں اِس طرز خاص کا موجد ہُوں چنانچہ اُس مرثیہ میں جس کا یہ مطلع ہے کہ ع کس نُور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے مقطع میں فرماتے ہیں۔

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبیؐ کے | سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجر نبیؐ کے (۱۲۴۹ھ)
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے | اب سب یہ مقلد ہُوئے اس طرز نئی کے

دنیا میں کہوں نثر میں یہ ورثہ ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر صاحب کے برابر کے اُستادوں میں میر خلیق۔ مرزا فصیح۔ منشی دلگیر موجود تھے۔ میر خلیق و منشی دلگیر تو وہی بندیہ مختصر مرثیہ کہتے رہے۔ مگر مرزا فصیح مرحوم نے بعض مرثیہ رزمیہ فرمائے۔ اور خوب فرمائے۔ ادھر مرزا دبیر نے اپنے اُستاد کی تقلید میں اُسی

حال شاہزادہ علی اکبرؑ میں اُسی طرز کا ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیہ کے مطلع میں بھی وہی شان ہے مطلع یہ ہے۔ ؎ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل ۱ [1] ۱۲۵۰ھ بارہ سو پچاس اور اُس کے بعد کے اکثر مرثئے مرزا صاحب کے سو ڈیڑھ سو یا زیادہ بند کے ہیں۔ اور اُن میں سراپا اور رزم وغیرہ ہے*

فصل ۶ مرزا صاحب کی شہرت کے زمانہ میں لکھنؤ میں تین قسم کے شاعر تھے

اب یہ بھی کہدوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت کے زمانے میں تین طرح کے شاعر لکھنؤ میں تھے۔ اور ہر فرقہ اپنی زبان کو زیادہ فصیح اور ٹکسالی سمجھتا تھا۔ (۱) وہ شعرا جو خود دہلی کے تھے یا اُن کے والدین دہلی کے تھے۔ اور وہ لکھنؤ میں آبسے تھے۔ مرزا صاحب اس صنف میں سے تھے۔ اور یہ لوگ بعض الفاظ یا بعض ترکیبیں زبان دہلی کی اپنے کلام میں ضرور لاتے تھے۔ اور اس کو اپنا تمغائے زبان سمجھتے تھے جیسے مرزا صاحب کے کلام میں ورے۔ پرے اور ات بسے اور بعض الفاظ نظر آتے ہیں۔ (۲) وہ شعرا جو دہلی وغیرہ سے فیض آباد میں جا بسے تھے۔ اور پھر جوانی یا بڑھاپے میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے کلام میں بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی تھیں۔ جو فیض آباد میں فیض پانے کی خبر دیتی تھیں ۲ [2]۔ (۳) وہ شعرا جو محض لکھنؤ کی

---

[1] ہائے اردوئے معلےٰ سے ناواقفی بھی کیا بُری بلا ہے۔ مولوی عصمۃ اللہ النسخ طومار اغلاط میں ہمارے اُستاد منشی امیر صاحب کے اس شعر پر ؎ کے نالوں کے الم ہم بھی ضرور آئینگے ہوگی جب روز محرم میں ترے گھر محفل۔ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ گو محفل و مجلس مرادف ہے۔ مگر محرم کی محفل سُنی نہیں البتہ محرم کی مجلس سنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ النسخ صاحب نے سُنا ہی کیا ہے۔ سچ ہے تمام دُنیا کی خبریں جانتا ہو جب شاعر ہو سکتا ہے۔ اور معترض کی بھی اسی قدر معلومات ہو۔ بہر حال مجلس و محفل مرادف ہے۔ پہلے محفل زیادہ بولتے تھے۔ اب مجلس زیادہ بولا جاتا ہے۔ سند میں ضمیر و دبیر کے یہی دو مطلع بطور دو گواہ عادل پیش ہیں + ۱۲ مؤلف

[2] احسن صاحب کا یہ لکھنا کہ میر انیس صاحب اپنی زبان فیض آبادی پر فخر فرمایا کرتے تھے بیجا و بے اصل ہے۔ اور یہ بھی اہل لکھنؤ سے سنا ہے کہ میر صاحب کبھی کبھی صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ صاحبو اہل لکھنؤ ہیں یہیں لوٹتے ہیں مگر یہ میری عن زبان ہے اس اُنہی مرد و قیح فیض آبادی ہاں تھی دہلی کی زبانی انکو کوئی فخر و ناز نہ تھا۔ چنانچہ جناب میر مظفر حسین صاحب ضمیر اودھ کے فضل علی مرحوم برادر حقیقی میر نور علی مرحوم کے نواسے جو جناب صدر المحققین مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ کے ہمشانحاس میں فر کش ہیں مجھ سے فرماتے تھے کہ میں نے میر انیس مرحوم سے فارسی کتابیں پڑھی تھی جب میں الدماجد ہمراہ لکھنؤ آنے والا تھا اُن سے ملنے کو گیا تو وہ جناب افسوسناک لہجہ میں فرماتے تھے کہ افسوس اب تم دہلی جاؤ وہاں زبان بگڑ جائیگی وہی ورے پرے پھر بولنے لگوگے! افسوس بعد ۳ [3]

[3] تحریر ہذا معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار بھی ۱۹۱۲ء میں انتقال فرما گئے + ۱۲ مؤلف حقیر

پیدائش تھے۔ خواہ اُن کے والدین بھی لکھنؤ کے تھے۔ خواہ دہلی کے سوا کہیں اور سے آئے تھے۔ ازبسکہ اُسی زمانے میں اہل لکھنؤ نے اہل زبان ہونیکا دعوےٰ کیا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو اہل زبان سمجھتے تھے +

المختصر مرزا صاحب نے اوّل اوّل مرثیوں میں بین عمدہ کہکر نام پیدا کیا۔ اور محاورہ بندی کا خیال رکھکر سلیس اردو میں سیدھے سادے مرثئے کہے۔ پھر جو جو لکھنؤ میں باریکیاں اور صنعتیں بڑھتی گئیں۔ وہ بھی ہر رنگ میں مرثئے کہتے گئے۔ ادھر قدرتی شاعری پر علم کی صیقل ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر رنگ میں اُن کا کلام نظر آتا ہے۔ اور اس کثرت سے ہر رنگ میں کہا ہے۔ کہ دریا بہا دئے ہیں۔ چنانچہ خود وہ دعوےٰ فرماتے ہیں ؎

اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام + ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

کہیں تو وہ اس قدر صاف و سلیس نظم کہتے ہیں۔ جو اس شعر (حقیر ثابت) کی مصداق ہے ؎

یہ نظم مصفّا پہ دھوکا ہُوا + کوئی باتیں کرتا ہے بیٹھا ہُوا

اور کہیں ایسا دقیق کلام نظر آتا ہے۔ کہ بڑے بڑے شعرا و علما گھنٹوں غور فرماتے ہیں۔ باریکیوں کو سمجھ کر لطف و حظ اُٹھاتے ہیں۔ اگر غور سے آپ دیکھینگے۔ تو ہر صاحب علم مصنّف کے کلام میں آپ کو (خواہ وہ کلام نثر ہو یا نظم ہو) ایسا دقیق کلام ضرور ملیگا۔ میں اپنے دعوے کی تائید میں اُن بزرگوار کا کلام پیش کرتا ہُوں۔ جن کا کلام کلام اللہ کے بعد فصاحت و بلاغت میں یکتا مانا گیا ہے۔ وہ کون؟ جناب امیر علیہ السلام ہیں۔ کتاب مستطاب نہج البلاغہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ اوّل تو اکثر خطبوں میں بعض دقیق جملے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص خطبہ شقشقیہ میں۔ پھر ایک خاص فصل ایسے دقیق جملوں کی ہے جس کی سرخی (ہیڈنگ) سید رضی (رضی اللہ عنہ) نے یہ لکھی ہے۔ فصل نذکر فیہ شیئاً عن اختیار کلامہ المحتاج الی التفسیر*۔ افسوس اب علوم مشرقیہ کی ایسی کچھ کمی ہوتی

* یعنی اب ہم کچھ ایسا اُن حضرت کا کلام لکھتے ہیں جو تفسیر کا محتاج ہے۔ جناب مفتی عبدالله مصری کی محشی نہج البلاغہ میں صفحہ ۲۰۲ سے یہ فصل شروع ہوئی ہے ۱۲ مولف

جاتی ہے۔ کہ لوگ دقیق کلام کو جو فی نفسہٖ ہنر ہے ایک عیب سمجھتے ہیں۔ خیر جاہلوں سے ہمیں کیا شکایت۔ جو شخص اہل علم بنتا ہے۔ اور پھر ایسی شکایت کرتا ہے۔ کہ وہ کلام بہت مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ اُس سے ضرور شکایت ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ مرزا صاحب کا لکھنؤ میں وہ زمانہ تھا۔ کہ جب لکھنؤ علوم مشرقی کا مجمع و مرکز ہو رہا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ ہے اُس کے قریب قریب کی اکثر بستیاں بلگرام۔ کاکوری۔ موہان۔ گنتور۔ جرول۔ جائس۔ بدایوں۔ امروہہ۔ نصیر آباد۔ سندیلہ۔ خیر آباد وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کی خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ عربی و فارسی کے علوم کے ساتھ ساتھ سیکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ لکھنؤ کے عالم سے لیکر جاہل تک بولتے تھے*۔ اور ہر لفظ و محاورہ وہ لوگ موقع سے استعمال کرتے تھے۔ اب جو جو عربی۔ فارسی اس ملک میں کم ہوتی جاتی ہے۔ وہ بیچارے الفاظ بھی اپنا بستر باندھتے جاتے ہیں۔ لوگ اُن کو غریب سمجھتے ہیں۔ خیر اس زمانے میں اگر کوئی نیا شاعر وہ الفاظ لائے اور کوئی اُن کو غریب و ثقیل بتائے۔ تو چنداں مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ جس کلام کو یقیناً ستر ساٹھ برس پہلے کا سمجھتے ہیں۔ اور اُن میں اہل علم کی زبان کے الفاظ

---

* دہلی میں بھی عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے عالم سے لیکر جاہل تک بولتے تھے۔ چنانچہ راجہ شو پرشاد صاحب ستارۂ ہند اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۳ء (موسومہ "کچھ بیان اپنی زبان کا") میں لکھتے ہیں "ایک شاعر دہلی کے نواح میں پہنچا۔ پوچھا قلعہ کتنی دور ہے۔ لوگوں نے جواب دیا پاس ہے آگے بڑھکر پوچھا۔ جواب ملا نجیک (نزدیک) ہے۔ پھر پوچھا تو جواب پایا نزدیک ہے! آگے بڑھکر پھر پوچھا تو لوگوں نے کہا۔ قریب ہے۔ جب قلعہ کا دروازہ دکھلائی دیا پھر پوچھا۔ وہاں والوں نے بتایا متصل ہے۔ اب اس سے آپ لوگوں کو قلعہ کی اردوئے معلّےٰ کی بالکل حقیقت دریافت ہو جائیگی"۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جو جو دہلی نزدیک آتی گئی عربی و فارسی الفاظ کی زیادہ بوچھاڑ ہوتی گئی۔ دہلی کے قصبات قریبہ میں شاید اس کثرت سے اہل علم نہ تھے جتنے لکھنؤ کے قریب قصبات و دیہات میں تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے گرد و نواح میں بھی عربی و فارسی الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ اور مفہوم کو جاہل بھی صحیح طور پر سمجھ لیتے تھے۔ گو لغوی معنی نہ جانتے تھے۔ پس اُس زمانہ کی نظم میں جو کثرت سے عربی و فارسی کے الفاظ تمام شعرا کے یہاں نظم ہیں۔ اُن کو غریب و ثقیل و غیر فصیح کوئی اہل عقل نہیں کہہ سکتا۔ یہ خیال غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بیس سال بعد پیدا ہوا ہے۔ کہ عربی و فارسی کے الفاظ نظم میں کم آئیں۔ اور اُسی زمانے سے الفاظ عربی و فارسی بھی زبان سے اُترتے جاتے ہیں۔ اور اُن کی عوض اردو یا انگریزی الفاظ زبانوں پر جاری ہوتے جاتے ہیں۔ ع کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

پاتے ہیں۔ اُن کو ثقیل و غریب بتاتے ہیں۔ جن لوگوں کو علم السنہ سے کام پڑا ہے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں۔ کہ جو الفاظ جس زمانہ میں بولے جاتے ہوں۔ اگر وہ اُسی زمانہ کے شاعر یا ناثر کے کلام میں ہوں۔ (ہرچند زمانہ مابعد میں متروک ہو گئے ہوں) وہ ثقیل (ہرگز) نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جناب مفتی عبدربہ مفتی دیار مصر نے جو اس زمانہ کے ادیب کامل و فاضل متبحر تھے۔ اپنی کتاب شرح (حل الفاظ) نہج البلاغہ کے دیباچہ میں فرمایا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ "چونکہ عبارت کتاب نہج البلاغہ دقیق ہے۔ اور ہم لوگ اُس زمانہ میں ہیں۔ کہ اصل زبان عرب سے بہت کچھ ناآشنا ہو گئے ہیں۔ لہذا بعض بعض الفاظ غریب ملتے ہیں۔ مگر وحشت و تنافر سے معرا و پاک ہیں۔ بعض ایسی دقیق ترکیبیں ملتی ہیں۔ مگر تعقید سے مبرا ہیں۔ یہ قصور ہمارے فہم کی کمی کا ہے۔ معاذ اللہ مصنف کا ہرگز نہیں ہے"۔ مرزا صاحب کے یہاں جس طرح عربی و فارسی کے الفاظ اور بعض ترکیبیں فارسی آمیز نظر آتی ہیں۔ ویسی ہی حالت اُن کے تمام اہل علم معاصرین شعرا کی ہے۔ ذوق۔ مومن۔ غالب۔ ناسخ۔ آتش۔ وزیر۔ برق۔ رشک وغیرہ سب کو دیکھ جائیے۔ پس اس کو رواج یا فیشن کہنا چاہئے۔ اس سے کم فہم یا جاہل شخص کے کوئی اہل علم معترض نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اُن کی بندشوں میں عطف و اضافت کی بھی کثرت ہے۔ جس طرح اُن کے معاصرین اہل علم کے کلام میں ہے۔ والد مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جناب میر کلو عرش مغفور پسر میر مرحوم نے بہت کوشش کی۔ کہ عطف و اضافت کم آئے۔ مگر اُن کی ایک نہ چلی۔ مرثیہ گویوں میں دلگیر مرحوم عطف و اضافت کم لاتے تھے۔ اُن کی مشق سلیس کلام کی پرانی تھی شیخ ناسخ مرحوم کو بھی وہ کلام دکھاتے رہے جب بھی وہ اپنے رنگ پر قائم ہے ناسخ مرحوم نے بھی اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سمجھ لیا کہ یہ مشق ان کی پرانی ہے۔ اپنی طرز کو یہ نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ پرانی وضع و طرح جو میر مرحوم و مصحفی کی تھی۔ وہ بھی

محاورہ بندی کی سیدھی سادی تھی۔ اوّل اوّل سید انشاؔ نے اور پھر شیخ ناسخؔ اور اُن کے معاصرین آتشؔ وضمیرؔ اور اُن کے ساتھ ساتھ دبیرؔ مرحوم نے نظم اردو میں رنگینیاں پیدا کیں۔ پرانے مشاقوں کے دلوں میں اس نئی تراش وخراش نے خراش پیدا کیا۔ چنانچہ مصحفیؔ اپنے آخر زمانہ کے ایک قطعہ میں اس کی شکایت بالفاظ ذیل فرماتے ہیں:-

تھا جو شعر راست سرو بوستانِ ریختہ — اب وہی ہے لالۂ زرد خزانِ ریختہ
آگے کچھوے کی کماں کے قدر کیا اسکی رہی — تھی فریدآبادی گو اپنی کمانِ ریختہ
پیچ دیئے لفظ ومعنی کو بتاتے ہیں کلفت — اور وہ پھر اس پہ رکھتے ہیں گمانِ ریختہ
فہم میں اتنا نہیں آتا بحکم رائے پست — اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شانِ ریختہ
خوان لغیا بن کے پہنچا ہر کس و ناکس کے ہات — قطع سلطاں کا جو تھا مخصوص خوانِ ریختہ
جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفیؔ — خلط میں جاتا رہا حسن زبانِ ریختہ

مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانہ اپنی روش پر اس بڈھے مشاق سخن کو بھی کھینچ لایا۔ کہ مصحفیؔ کے دیوان ششم میں کہیں کہیں اس طرز جدید کی جھلکی نظر آتی ہے۔ المختصر مرزا صاحب مرثیہ کو اپنے اُستاد کے ساتھ ساتھ اس رنگین پٹری پر لائے۔ اور اُس میں طبیعت کی روانی اور علم کی روشنی نے علاوہ نئے مضمون کے اور اور جدتیں پیدا کیں۔ ہزاروں آیتوں اور حدیثوں کے مضامین آسان الفاظ اردو میں نظم کر دیئے۔ چنانچہ وہ اس بات کو جابجا کہتے ہیں۔؎

ہے مجھکو استفادہ حدیثوں کی سیر سے + واللہ ننگ و عار ہے مضمون غیر سے
شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں + ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

کلام معصومین علیہم السلام سے جو مضامین مرزا صاحب نے لئے ہیں۔ وہ مفصل لکھوں۔ تو بارہ چودہ جزو کی ایک مستقل کتاب ہو جائیگی۔ اس لئے فقط دو تین نمونے دکھاتا ہوں

(۱) جناب امیرؑ ایک مختصر خطبہ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں۔ ان المرء اذا ھلک

شکایت نظم مصحفی و دقیق و رنگین کی نسبت

آیات اور احادیث کے مضامین نظم مرزا مرحوم نے کلام دبیر کلام معصوم کے مضامین سے وغیرہ

قال الناس ما ترک وقالت الملئکہ ما قدم ؎۱۔ اس کا ماحصل اس رباعی میں نظم فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی عزت بڑھاتے ہیں :۔

مال و زرِ دُنیا جسے ہات آیا ہے + مشکل ہے کفن بعد فنا پایا ہے
چرچے یہ۔ یہاں ہوتے ہیں کیا چھوڑ گیا + پرسش یہ وہاں اُس سے ہے کیا لایا ہے

(۲) امام حسین ؑ نے اتمام حجت کے واسطے لشکریان یزید سے یہ بھی فرمایا تھا انا سبط المصطفٰے وسنقتل عطشانا ؎۲۔ اس کا مضمون کس خوبصورتی سے اس ٹیپ میں نظم کیا ہے ؎

اک دم میں پھر احمد کا نواسا نہ ملیگا + دریا کے کنارے تمہیں پیاسا نہ ملیگا

(۳) امام حسین ؑ رجز میں فرماتے ہیں ؎

فَاَبِی شَمسٌ وَاُمِّی قَمرٌ + فَانَا الکوکبُ وَابنُ القمرین

اس کا خلاصہ و ماحصل مرزا مرحوم نے نظم کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :۔

بابا مرا خورشید ہے مادر مہِ انور
ہے مشرق و مغرب میں کوئی میرے برابر
وہ میں ہوں چھپاتے ہو جسے خاک کے اندر
اور اُس مہ و خورشید سے نکلا ہے جو اختر
ہے نحس تمہیں کو یہ عمل حکم خدا سے
عقرب کا طریقہ نہ کرو آلِ عبا ؑ سے

دوسرا شعر امام مظلوم ؑ کے رجز کا یہ ہے ؎

فِضَّةٌ قَد خَلُصَت مِن ذَهَبٍ + فَانَا الفِضّةُ وَابنُ الذَّهَبَین

مرزا مرحوم نے اس کا ماحصل یہ نظم کیا ہے :۔

؎۱ جب آدمی مر جاتا ہے۔ تو دُنیا کے آدمی پُوچھتے ہیں۔ کیا مال چھوڑ گیا۔ اور فرشتے اُس سے پُوچھتے ہیں۔ کیا (اعمال خیر) لایا ہے ؎ یہاں ہے مال کی پرسش وہاں اعمال کی پرسش + ۱۲ مؤلف حقیر۔

؎۲ مَیں محمد مصطفٰے کا نواسا ہُوں۔ اور پھر عنقریب پیاسا قتل ہوا چاہتا ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

وہ نقرہ بے عیب کہ زر سے ہوئے پیدا ہے ذات مری۔ اور وہ زر حیدرؑ و زہراؑ
جیتے ہوئے اُن کے کوئی آنچ نہ آئی اصلا تم کرتے ہو کُشتہ پئے سیم و زر دُنیا

کُشتہ بھی جو ہم ہونگے تو اکسیر بقا ہیں
اب عیسٰئ دوران ہیں تو پھر خاک شفا ہیں

تیسرے مصرع میں ایک روزمرہ لطیف عین موقع پر نظم فرمایا ہے۔ آنچ آنا آفت آنے کے معنی پر اردو میں بولا جاتا ہے۔ اور چاندی اور سونے کو تپاتے ہیں۔ یہ آنچ آنیکی خصوصیت سیم و زر سے ہے۔ چوتھے مصرع میں کُشتہ کی لفظ عجیب لطیف آئی ہے۔ کُشتہ ایک تو مقتول کے معنی پر آتا ہے۔ دُوسرے چاندی کا کُشتہ ہوتا ہے۔ کُشتہ سے اکسیر بنتی ہے۔ پس کُشتہ ہو کر اکسیر ہو جانیکا ثبوت کس قدر عمدہ ہے۔ کہ بعد شہادت ہم خاک شفا ہونگے۔ خاک شفا تربت امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حیات و ممات میں ہم یکساں فیض رساں ہیں۔ اب اگر عیسٰئ عہد ہیں تو مرنے پر شہید راہ خدا ہو کر خاک شفا کا کام دینگے*۔

فصل ۴ صنائع لفظی و معنوی

صنائع لفظی و معنوی

جب مرزا صاحب کو سلیس نظم پر (اور زبان پر) مشق و قدرت ہوگئی۔ اور معلومات بھی بڑھ گئی۔ تو صنائع و بدائع کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس بات کا خیال رکھا۔ کہ ایسے اشعار بے تکلف (حتے الامکان) ہوں۔ اور اس میں ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اور اُن کا اس قسم کا کلام بھی اکثر شعرا سے بہتر ہے۔ یہ بات جب صاف نظر آتی ہے۔ جب دُوسروں کا کلام صنائع و بدائع مرزا صاحب

*۔ اور بھی اشعار رجز امام حسینؑ کا ماحصل مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے جس کو میں نے جلد دوم حیات دبیر میں نقل کیا ہے۔ وہ مقام دیکھنے کے قابل ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے کلام کے ساتھ پڑھا جائے[1] اب میں ایک ایک صنعت لکھ کر چند اشعار مرزا صاحب کے لکھتا ہوں سخن فہم غور فرمائیں +

طباق - اس صنعت کو تقابل - تضاد - مطابقت - تطبیق - تکافو بھی کہتے ہیں - اسی کی ایک شاخ صنعت مقابلہ ہے - یہ صنعت قرآن شریف میں بھی موجود ہے - تحسبھم ایقاظاً وھم رقود الآیہ[2] - یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کر دیں - جو آپس میں مطابق یا متقابل یا متضاد ہوں - اب ایسے اشعار مرزا صاحب کے سُنیئے :-

(۱) شجاع ازلی حسینؑ ابن علیؑ لڑنے کو میدان میں آتے ہیں - لشکریان یزید کہہ رہے ہیں :-

حق یہ ہے رگ و ریشہ میں ڈر بیٹھ گیا ہے + کیا پاؤں اٹھیں سن کو کہ جی بیٹھ گیا ہے

اٹھیں اور بیٹھ گیا میں تضاد ہے +

---

[1] مولوی شبلی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۷ پر گویا مانا ہے کہ مرزا صاحب میر صاحب سے ان اوصاف میں بڑھے ہوئے ہیں - مگر از بسکہ ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ کسی صنف کلام میں بھی مرزا صاحب کو ترجیح و تفصیل دی جائے - اس وہ یوں بات بناتے ہیں کہ میر صاحب کی اصل فطرت میں سلامت روی و اعتدال تھا اس لئے وہ خیال بندی و مضمون آفرینی میں بقول اُنکے حریفوں کے مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے دیکھئے یہاں خیال بندی و مضمون آفرینی کو جو شاعری کی روح رواں ہے خلاف اعتدال و فطرت بتا گئے - اب جبکہ میں نے اکثر صنائع قرآن شریف میں دکھا دئے ہیں دیکھوں انکو وہ خلاف فطرت بتاتے ہیں یا ضد اعتدال و سلامت روی قرار دیتے ہیں خصوصاً جبکہ کلام دبیر صنائع میں سلیس بھی ہے - تو اس کو وہ کیا کہینگے - اگر اب بھی نہ مانیں تو میں کہونگا - وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں - ع مقتضائے طبیعتش این ست + ۱۲ مولف حقیر -

[2] تو اُن کو جاگتا ہوا سمجھتا ہے اور وہ سو رہے ہیں - جاگنے اور سونے میں تضاد ہے - بعض بزرگوار ان صنائع کی نسبت دبیر کی ضد میں آکر فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں دربار فصاحت و بلاغت میں نامقبول ہو چکی ہیں جیسا کہ پروفیسر آزاد مرحوم نے بعض لوگوں کا قول نقل فرمایا ہے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا قرآن شریف سے بڑھکر مسلمانوں کے اعتقاد میں دربار فصاحت و بلاغت کوئی اور ہے - اور اگر نہیں ہے - اور مرزا صاحب نے صنائع و بدائع بے تکلف نظم فرمائے ہیں تو انکو ماننا پڑیگا کہ دربار بلاغت و فصاحت کے مرزا صاحب حاضر باش درباری ہیں - اور جو صاحب مسلمان ہو کر نہ مانینگے میں اُن کے لئے دُعا کرونگا کہ خدا قرآن شریف سے انکو ہدایت کرے - واضح ہو کہ جو شخص محض واقعہ کی تصویر دکھا دیتا ہے اور ان صنائع و بدائع سے اُس کا کلام خالی ہے وہ شاعر نہیں بلکہ تُک بند ہے - بیشک واقعات کو الفاظ میں دکھا دینا ایک خوبی ہے مگر جب کلام میں بلاغت کے اصول بھی پائے جائینگے جبھی وہ کلام بلیغ سمجھا جائیگا - ورنہ نہیں ۱۲ مولف حقیر -

(۲) رجز میں امام حسینؑ فرماتے ہیں۔

جب روز حساب آئیگا فریاد کروگے + بھولے ہوئے ہو خیر کبھی یاد کروگے

(۳) عید آئی ہے۔ اور حسنینؑ کے پاس پوشاک نہیں ہے۔ اُس موقع پہ کہتے ہیں۔

رنگین لباس سے تو یہ خود نا اُمید تھے + نیرنگ دیکھنا کہ نہ رخت سفید تھے*

(۴) رات اخیر ہوئی۔ صبح نمودار ہے۔

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا + پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہوگیا

(۵) دُنیا مقام عبرت ہے۔ ہر شخص مرنے کو پیدا ہوا ہے۔

جو مر گئے مٹی ہیں جو زندہ ہیں مریں گے + تجھ کو بھی یوں ہیں بعد ترے یاد کریں گے

(۶) شجاعت جناب امیرؑ اور بیر السلم میں جنوں پر فتح پانا۔

جنات پہ تو فتح نہ پائی تھی کسی نے + اس آگ کو پانی کیا کس طرح علیؑ نے

(۷) حبیب ابن مظاہر اسدیؓ کی بڑھاپے میں ثابت قدمی (میدان جنگ میں)

سر ہلتا ہے پر ہر کف پا رن میں جمی ہے + جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

(۸) جناب زینبؑ دربار یزید میں سفیر سلطان رُوم سے فرما رہی ہیں (امام حسینؑ کی نسبت)

حق پر ہوا ہے فرقہ باطل سے پوچھ لے + سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

(۹) حضرت عباسؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ خوف و رعب چھایا ہوا ہے۔

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحہ خیر + کہتے ہیں انا العبد لرز کر صنم و دیر

(۱۰) اے خانہ خراب قبر تیری خاطر + کھویا بھی جو نقد جان تو گیا خاک بسر +

(۱۱) آنے ہیں وہ دن لطف جوانی نہ ملیگا + ہم خاک میں مل جائینگے پانی نہ ملیگا +

(۱۲) اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر + جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا +

(۱۳) منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے + انصاف تو کہتا ہے خداوند۔ یُوں ہیں ہے +

* جن جن الفاظ میں مطابقت یا تضاد ہے۔ مَیں نے اُن پر۔ کے ہندسے بنادئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۴) حق عاشقی حق کا ادا شہ نے کر دیا + دشمن کو راہ دوستی میں خوش ہو کے سر دیا +

(۱۵) یکساں نہیں کھتا ہے فلک دور کسی کا + یاں آج تنزل ہے دور ترقی کل اور کسی کا +

(۱۶) ہے فاش ہر اک شامی بدذات کا پردہ + چھپ جانے کو دن ڈھونڈتا ہے رات کا پردہ +

(۱۷) لینا نہ منہ پہ ڈھال کر دینا جناب ہے + دینا نہ آبرو کہ یہ موتی کی آب ہے +

(ترقی و تنزل) رعب آمد حضرت عباسؑ کا بیان و دبدبہ

ایہام

ایہام - یہ بھی صنعت طباق کی ایک پھلی پھولی شاخ ہے - اس کی قسمیں ایہام التضاد و ایہام تناسب ہیں - ایہام کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں - یعنی ایسے دو لفظ آئیں جو بظاہر آدمی کو وہم میں ڈالیں - کہ یہ باہم ضد و متقابل یا متناسب ہیں - مگر اُن میں سے کسی ایک کے معنی مصنف نے دُوسرے لئے ہوں - قرآن شریف میں بھی یہ صنعت اس آیت میں موجود ہے - والشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان - نجم کے دو معنی ہیں - ایک ستارہ - دُوسرے وہ نبات جو ساق نہیں رکھتی - جیسے ساگ وغیرہ - اور جو نبات ساق دار ہے - اُس کو شجر کہتے ہیں - پس شمس و قمر کے ساتھ ساتھ نجم آنے سے یہ وہم ہوتا ہے - کہ نجم سے مراد ستارہ سے ہوگی - مگر یہاں نبات بے ساق کے معنی پر آیا ہے - یہ صنعت بھی مرزا صاحب کے یہاں ہے +

حضرت عباسؑ میدان کو آتے ہیں

(۱) عرشی فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے + ہشیار خبردار پرے[1] دور کنارے +

(۲) سرمہ ہے نجف کا یہ سخن گرد نہیں ہے + آمد[2] کے مضامین ہیں آورد نہیں ہے +

(۳) عبداللہ ابن عامر صحابی جناب رسول خداؐ کے گھر لڑکی (ہند) پیدا ہوئی ہے - وہ جناب فاطمہ زہراؑ کے قدم کے نیچے کی خاک خوش اعتقادی کے دامن میں باندھ کر گھر لے گیا - اور

[1] پرے کے ایک معنی لشکر کی ایک ٹولی - دُوسرے معنی پرے ہو یعنی پیچھے ہو جاؤ - جو ورے کی ضد ہے دہلی والے بولتے ہیں - عام اہل لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے - یہاں معنی آخر لئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] آمد کے دو معنی ہیں - ایک تو حضرت عباسؑ کے میدان جنگ میں آنے کے مضمون ہیں - دُوسرے آمد کے مضامین جو فی الفور ذہن میں آ جائیں - اس کی ضد آورد ہے - یہاں معنی آخر مراد ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

لڑکی کی آنکھوں میں بجائے سُرمہ لگائی - اُس روایت کو نظم کرتے ہُوئے لکھتے ہیں :-

اُس خاک کا سُرمہ جو دیا آنکھوں میں گھرا | سرچشم میں اک نُور کا چشمہ گیا لہرا
تھا خاک میں نورِ قدمِ فاطمہ زہرا | پارا ہُوا کاجل نہ کسی آنکھ میں ٹھہرا

یہاں مصرع چہارم میں صنعت ایہام ہے - ایک تو یہ معنی ہیں - کہ کاجل پارہ ہوگیا - اُڑ گیا - دُوسرے یہ کہ عورتیں کاجل پارتی ہیں یعنی ولیسی تیل چراغ میں جلا کر ایک سکورا اُس پر رکھکر کاجل اُس کے دھوئیں سے لیتی ہیں - اُس کو پارا ہُوا کاجل کہتی ہیں - یہاں یہی اصطلاح رکھی ہے - اس لئے صنعت ایہام ہے *

مراعات النظیر اور اُس پر ایک بحث

مراعات النظیر - اس صنعت کو توفیق - تناسب - ایتلاف - رعایت لفظی بھی کہتے ہیں - یہ صنعت بھی طباق کی گویا چھوٹی بہن ہے - فرق صرف اسقدر ہے - کہ اس میں ایسی چند چیزیں مذکور ہوتی ہیں - جو باہم ضد و مقابل تو نہ ہوں - مگر متناسب ہوں - صاحب حدائق البلاغہ نے ایہام متناسب کو اسی سے ملحق بتایا ہے - اس صنعت کا حسن یہ ہے - کہ بہت اُبھری ہُوئی رعایت نہ ہو - ورنہ پھر اُس کو ضلع جگت کہینگے - اُس میں ایک قسم کا ابتذال ہو جاتا ہے - اُردو کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ ولی دکھنی کے بعد جو دہلی وغیرہ میں شاعران اردو ہُوئے - اُن کو اس کا اور ایہام کا بڑا شوق تھا - حضرت سودا کے وقت میں بھی عام شاعروں کو یہ سودا تھا - حضرت سودا اور جناب میر مرحوم نے جو اس کا فیصلہ فرمایا ہے - اُس سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ دونوں قدرتی شاعر اس کی بھلائی اور بُرائی اور قابل استعمال مقدار متناسب کو خوب جانتے تھے - اور ذوق سلیم پایا تھا - چنانچہ حضرت سوداؔ فرماتے ہیں -

کاملِ فنِ سخن کہتے ہیں اُس کو اکمل | پرورش لفظ کی منظور ہو جس کو اوّل
پر نہ یاں تک کہ عبارت ہی کو کردیں مہمل | اعتقاد اُن کا ہے یُوں - وہ جو کہے ہیں اجہل
مُو نہ ہو پرورش شانہ میں تو ہو مُوسل

میر صاحب ایہام کے باب میں فرماتے ہیں[۱] "در شاعران سلف این فن رواج داشت اکنوں طبعہا مالوف باین صفت کم است۔ مگر بسیار شستگی و رفتگی بستہ شود۔ یعنی ایہام این ست کہ لفظے کہ براو بنائے بیت بود۔ آں دو معنی دارد۔ یکے قریب۔ دویم بعید۔ و بعید منظور شاعر باشد۔ و قریب متروک۔ اُس کے بعد انشا و مصحفی کے زمانہ میں بھی اس کا بدرجہ کم رہا۔ ناسخ رح کے زمانہ میں تو متانت اس قدر رواج پاگئی تھی۔ کہ اُبھری ہوئی رعایت لفظی اور ایہام وغیرہ کے پر جلتے تھے۔ آتش رح بھی سلجھے ہوئے شاعر تھے۔ ناسخ رح کے بعض شاگردوں میں پھر اس رعایت لفظی نے آکر جنم لیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اور بھی لکھنؤ کے شاعروں میں یہ رنگ اُچھلا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اس کو لکھنؤ کا ہی رنگ کہنے لگے۔ مگر بعض شعرائے لکھنؤ نے اس تہذیب و متانت سے اس رنگ کو اختیار کیا۔ کہ زمانہ (حالانکہ اس رنگ کے گویا خلاف ہے۔ مگر پھر بھی) اُن کا لوہا مانے جاتا ہے۔ جیسے گلزار نسیم مشہور و مقبول مثنوی یا صبا وغیرہ کی بعض غزلوں میں ہے[۲]۔ مَیں نے لکھنؤ کے بُڈھے بُڈھے اہل سخن سے اس رنگ کے عام پسند ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اُس زمانہ کے شعرا میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا تھا۔ کہ اردو کا مکمل لغت (مع مصطلحات) کلامِ شعرا سے طیار ہو۔ اور زبان اردو میں وسعت پیدا کی جائے۔ کہ ہر قسم کے روزمرے۔ محاورے۔ اصطلاحات۔ امثال کثرت سے نظم ہوں۔ ان سب کے

---

۱ اگلے شاعروں میں ایہام بہت رائج تھا۔ اب طبیعتیں اس سے کم مانوس ہیں مگر بہت خوبی و صفائی سے باندھا جائے۔ ایہام کی تعریف یہ ہے کہ جس لفظ پر بنائے بیت ہو اُس کے دو معنی ہوں ایک قریب فہم دُوسرے بعید فہم اور شاعر نے بعید الفہم معنی رکھے ہوں اور قریب الفہم کو چھوڑ دیا ہو ۱۲ مؤلف

۲ گلزار نسیم میں اس صنعت کے بیشمار رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں مزہ دار پھل لگے ہوئے ہیں ہر چند زمانہ میں دُوسری ہوا چلنے لگی اور لوگ ایسی صنعتوں کو تکلف بلکہ تکلیف دہ سمجھنے لگے مگر بحمد اللہ چشم بد دور گلزار نسیم خزاں سے محفوظ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی رعایت لفظی اُبھری ہُوئی نہیں ہے۔ اور نسیم باتیں ہی نہیں بناتے بلکہ رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ مضامین کے گلدستے پیش کرتے ہیں خواجہ حالی پانی پتی مدظلہ کے سوا ہر اہل سخن اُس کا ہوا خواہ ہے ملاحظہ ہو خواجہ حالی صاحب کا دیباچہ دیوان بحث شعر و شاعری پر ۱۲ مؤلف

واسطے رعایت لفظی وایہام سے بڑھ کر کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے اکثر شعرا ناسخ مرحوم کے انتقال کے بعد ادھر جھک پڑے۔ اور رعایت لفظی وایہام وغیرہ کے خوب گل کھلائے۔ گل چھرے اُڑائے۔ جناب امانت مصنف اندر سبھا کو اس صنعت کا بڑا شوق تھا۔ اُن کے قدم بقدم مشیر لکھنوی مرثیہ گو نے چل کر سرسیوں میں سرسوں کے پھول کھلائے ہیں۔ باغ نظم میں نئے گل بوٹے لگائے ہیں۔ جن کا مثل ونظیر آج رُوے زمین شاعری پر مجھ کو نہیں ملتا۔ جن بعض ذیعلم ومتین شعرا نے اُس کو اُبھرنے نہ دیا۔ اور مضمون کو مقدم رکھا۔ اُنہیں میں سے ہمارے ممدوح دبیر مرحوم ہیں +

اس میں شک نہیں۔ کہ اگر یہ رعایت لفظی وایہام خوبصورتی سے بندھ جائے۔ تو کلام میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک شعر بہادر شاہ ظفر مرحوم اخیر بادشاہ دہلی کا مجھے بہت پسند ہے۔ وہ یہ ہے۔ ؎

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑے کی طرح صاف جواب + اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

اس میں ایک محاورہ ٹکڑے کی طرح توڑ کے جواب دینے کا اور دوسرا گھر کے ٹکڑے کھا کر پلنے کا نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔ اور ٹکڑے کے لفظ میں صنعت مراعات النظیر ہے۔ یہ شعر ضرور قابل تعریف ہے۔ جو لوگ اس رنگ کو محض اس خیال سے ناپسند کرتے ہیں۔ کہ یہ لکھنؤ کا رنگ خاص ہے۔ اور وہ خود دہلی کے رنگ کے پسند کرنے والے ہیں۔ وہ زبان کا مذاق سلیم نہیں رکھتے۔ یا تعصب زبانی ومقامی سے کام لیتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر مرحوم

شعرا اور رعایت لفظی

حکایت ولطیفہ

(حکایت ولطیفہ) نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جس زمانے میں (عہد آخر محمد علی شاہ و عہد امجد علی شاہ مرحومین میں) لکھنؤ میں یہ رنگ اُچھل رہا تھا۔ مرزا صاحب نے تلوار کی شرر افشانی میں ایک مرثیہ میں یہ ایک بند کہا تھا۔ ؎

شامی کباب تھے یہ ہوئے جب شرر فشاں | اہل تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں
مصری۔ نہ بات کر سکے سب بولے الاماں | بُت بن کے گبرہ گئے پتھرائیں پتلیاں

زردار۔ زرد ہو کے گلِ اشرفی بنے
نصرانی۔ خاک ہو کے گلِ ارمنی بنے

لوگوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دئے۔ لکھنؤ میں بڑا شہرہ ہوا۔ حالانکہ مرزا صاحب کو نہ اس رنگ پر فخر و ناز تھا۔ نہ وہ اس کو دل سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ مگر ازبسکہ ہر رنگ میں کہتے تھے۔ اس طرز میں بھی کہدیا۔ اُس زمانے کے ایک مشہور شاعر تھے جو مرزا صاحب کے مقابلہ کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیاب نہ ہوتے تھے[1] اُنھوں نے بھی اسی طرز میں ایک بند کہا۔ اور لوگوں سے کہا۔ کہ میں نے ایک مرثیہ کہا ہے۔ جس میں اکثر صنائع و بدائع ہیں۔ اگر کوئی بڑی مجلس ہو۔ تو میں پڑھوں۔ مگر دبیرؔ و انیسؔ کے لکھنؤ میں ایسے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ کہ ان دونوں کے سوا کسی تیسرے ذاکر کے پڑھنے کی مجلس میں ویسا مجمع مشکل سے ہوتا تھا۔[2] آخر جب بڑی مجلس میں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ تو اُنھوں نے ایک بڑے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے پوچھا۔ صاحبو۔ اگر اجازت ہو۔ تو ایک اپنے نئے مرثیہ کے (رزم کے) چند بند غزل سے پہلے سناؤں؟ چاروں طرف سے (اُن کے شاگردوں اور طرفداروں کی) آوازیں بلند ہوئیں بسم اللہ۔ ضرور عنایت کیجے۔ اُنھوں نے چند بند پڑھ کر ایک بند کا صرف ایک مصرع (مندرجہ تحت) پڑھا۔ شامی کباب تھے جو لپسندِ قضا ہوئے۔ اس میں شامی کباب کی

---

[1] میں نام نہیں لونگا۔ کیونکہ کسی اُستاد کی منقصت کرنیکو میں ناپسند کرتا ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اور اگر مجمع کثیر ہوتا تھا۔ تو پھر انہیں دونوں (دبیرؔ و انیسؔ) کے کسی مشہور شاگرد کی مجلس میں۔ آغا میر اور شیخ امیر علی ببر صاحب کے شاگردوں میں۔ اور میر شرف الدین و میر محمد رضا و میرزا مغل مرزا صاحب کے شاگردوں میں لکھنؤ میں بہت اچھے پڑھنے والے ذاکر زمانہ شاہی میں مشہور تھے۔ میر مظفر حسین صاحب مدظلہ (جن کا ذکر خیر پہلے ہو چکا) مجھ سے فرماتے تھے کہ یہ مقبولیت میں نے میر محمد رضا ظہیر کے پڑھنے کی مجلس میں دیکھی۔ کہ اُسی محلہ میں میر صاحب یا مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اور وہیں قریب یہ پڑھ رہے ہیں۔ اور دونوں جگہ معقول مجمع ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

رعایت لفظی پسندے کے ساتھ تھی۔ اور وہ بزرگوار رُوئی کا لبادہ پہنے ہوئے تھے کچھ پہلے سے پھولے ہوئے تھے۔ کچھ اہلِ مشاعرہ کی تعریفوں سے اور بالیدہ ہوگئے۔ کہ اے سبحان اللہ۔ واہ وا۔ ماشاء اللہ۔ کیا کہنا۔ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ ایسی ایسی آوازیں بلند ہوئیں۔ انہیں آوازوں میں ایک شخص نے آوازہ کسا۔ کہ "چھوڑ دے بغل سے بھیڑ کا بچہ"۔ ایسی پھبتی پھبی۔ اور ایسا قہقہہ ہوا۔ کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے بعض شاگرد بولے۔ ہائیں یہ کون تھا۔ کوئی بولا۔ اِدھر سے آواز آئی۔ کوئی بولا اُدھر سے۔ مگر تحقیق نہ ہوسکا۔ کہ یہ کون ذات شریف تھے۔ وہ شاعر کچھ ایسے غصّہ ہوئے۔ کہ معمولی غزل بھی اُنہوں نے نہ پڑھی۔ اور مشاعرہ بھی برخاست ہوگیا +

المختصر مرزا صاحب کے کلام میں رعایت لفظی اُبھری ہوئی بہت کم ملیگی۔ گویا نہیں ملیگی۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جن میں رعایت متانت کے ساتھ ہے۔

واللہ ہات دُونگا نہ۔ فاسق کے ہات میں	سر جائیگا پہ فرق نہ آئیگا بات میں
ہر مورچہ لرزاں ہے۔ سلیماں کی ہے آمد	فرعونیوں پہ موسئے عمراں کی ہے آمد
جن سیر کو نکلے تھے پرستے سے مڑے ہیں	پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اُڑے ہیں
ہر عُہدے پہ سرگرم خوصیں ہوئیں آکر	مُنہ ہات دُھلانے لگی اک شک بہاکر
اک جامہ سے باہر ہوئی پوشاک پہنا کر	اک تکیہ بزانو۔ ہوئی مسند کو بچھا کر

آئینہ دکھا کر۔ اُسے حیران ہوئی کوئی
سر گوندھ کے بی بی کا۔ پریشاں ہوئی کوئی

دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں	پوشیدہ ہیں پانی میں مگر۔ کانپ رہے ہیں
نظارہ غنیمت رُخ پر نور کا جانا	موسئے کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا
مشہور زباں نبی عرش نشیں ہیں	واللہ کسی بات میں ہم بند نہیں ہیں

(۱) رجز نامہ میں
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً
(۴) ہندے حال میں
(۵) خوف نامہ
(۶) ایام عصر
(۷) رجز امام حسین علیہ السلام

* جن الفاظ میں رعایت لفظی ہے۔ ان پر خط کھچا ہوا ہے + ۱۲ مولف حقیر۔

عکس

خود پیاسے ہیں پہ چاہیں جسے آب بقا دیں جس کو مرض الموت ہو ہم اُس کو شفا دیں

عکس۔ اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں۔ پھر اُن دونوں کو اُلٹ پلٹ دیں۔ یعنی دُوسرے کو پہلے لے آئیں اور اوّل کو ثانی کر دیں۔ یہ صنعت قرآن شریف کی اس مشہور آیت میں ہے۔ یخرج الحي من الميتتِ و يخرج الميتة من الحي [1] مرزا صاحب اس صنعت میں فرماتے ہیں۔

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے • دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

ناظرین انصاف سے دیکھیں۔ الفاظ انصاف و دل صاف کو کس صفائی سے عکس و تبدیل کیا ہے۔ صنعت کا کمال دکھایا ہے [2]۔ صنائع و بدائع کے پسند کرنے والوں پر منحصر نہیں۔ عام

---

[1] لفظی معنی یہ ہوئے کہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو خدا نکالتا ہے۔ مرادی معنی یہ مشہور ہیں۔ کہ عالم سے جاہل کو اور جاہل سے عالم کو خدا پیدا کرتا ہے ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس موقع پر اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ایسی صنعت لطیف کو ایک مسلمان عالم بلکہ شمس العلماء وہ کون؟ مولوی شبلی صاحب یعنی اس شعر کو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں جن کی رگ غصّہ مرزا صاحب کے محاسن کلام دیکھ کر فوراً استادہ ہو جاتی ہے۔ اور فوراً یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عیب لگاؤں۔ ملاحظہ ہو موازنہ کا صفحہ ۲۶۵ و ۲۸۴۔ دُوسرا اتہام یہ لگایا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے اس شعر کو اُلٹا ہے ؎ عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے۔ اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ میر صاحب کا شعر مقدم ہے۔ اس سے زیادہ میں اس جگہ لکھتا۔ مگر مرزا صاحب مجھے اپنا شعر پڑھ کر منع فرما رہے ہیں ؎ برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے۔ آئینۂ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ اس صنعت عکس میں مرزا صاحب سے مولوی شبلی صاحب برعکس و برخلاف ہیں۔ مگر مرزا صاحب کا آئینۂ دل اُن سے بھی صاف ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھا۔ کہ مرزا صاحب نے مولوی صاحب کو بخش دیا۔ مگر میں مؤدبانہ و مخلصانہ مولوی صاحب کو مشورہ دیتا ہوں۔ کہ زندگی کا اعتبار نہیں۔ قرآن شریف میں یہ صنعت ہے۔ اور اسکو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں۔ اعتراض اُنکا جناب احدیت تک پہنچتا ہے۔ جلد توبہ کر کے خدا سے اپنی صفائی حاصل کر لیں۔ میں نے دوستانہ عرض کیا۔ اب مولوی صاحب کو ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے ؎ حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس۔ در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید ۱۲ مؤلف حقیر۔

طبیعتوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور کیسی سچی بات کہی ہے۔ کہ جس شخص کا دل صاف نہ ہوگا۔ انصاف کیا خاک کریگا۔ اور جس کی طبیعت میں انصاف نہ ہوگا کبھی اُس کا دل صاف نہ ہوگا۔

رجوع

رجوع۔ یہ صنعت اس طور پر ہے۔ کہ خود ہی شاعر پہلے ایک بات کہتا ہے۔ پھر خود ہی اُس کی تردید کر کے دوسری بات کہتا ہے۔ اس طرح وہ مدح میں ترقی کرتا ہے۔ مرزا صاحب سراپائے جناب علی اکبرؑ میں فرماتے ہیں:۔

بینی کی ثنا مثلِ قلم زیبِ ورق ہے — انگشتِ یدِ قدرتِ حق کہئے تو حق ہے
ابرو کے شرف کا سرِ بینی پہ سبق ہے — یہ ناخنِ انگشتِ یدِ قدرتِ حق ہے

دل شیعوں کا چسپیدہ نہ کیوں اس سے سدا ہو
ممکن نہیں ناخن سے کبھی گوشت جدا ہو*

خورشید جبیں کا سرِ بینی ہے یہ اظہار — خورشید یوں ہیں نیزے پہ کل ہوگا نمودار
تو یہ کہاں نیزہ کہاں۔ بینیٔ خوش اطوار — چشم علی اکبر ہے درِ رحمتِ غفار

دربان کہوں ابرو کو یہاں میں تو بجا ہے
بینی مبین حاجب ابرو کا عصا ہے

* پہلے تو بینی کو قلم سے مثال دی پھر دستِ قدرتِ حق کی انگشت بتا کر ابرو کو ناخن سے تشبیہ دی پھر نیزہ سے تشبیہ دیکر پیشانی کو آفتاب بتا کر یہ گریہ خیز مضمون پیدا کیا کہ کل ہی آفتاب (سر علی اکبر ہمشکل محبوب خدا) نیزے پر علم ہوگا جس طرح مشہور ہے۔ کہ قیامت میں سورج نیزے پر ہوگا۔ پھر اس ترقی دیکر آنکھ کو رحمت خدا کا دروازہ بتایا۔ اور بھووں کو دربان اور دربان کا عصا بینی کو بنایا پھر اس مضمون سے ترقی دیکر یہ مضمون فرمایا کہ ناک دونوں آنکھوں کے درمیان میں مثل تکیے کے ہے۔ اور مردم بیمار (پتلیاں) اِدھر اُدھر ہیں مگر یہ معمولی بیمار نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی محبت کی شراب میں ایسے مست و مخمور ہیں کہ بیہوشی میں بھی خدا کے سوا کسی کا تکیہ (بھروسہ) نہیں کرتے۔ اور پلکوں کے سوا نام کو بھی بستر نہیں رکھتے ایسے آزاد ہیں اس کے بعد ان تمام مضامین پر ترقی کر کے فرماتے ہیں کہ یہ قلم ہے نہ نیزہ۔ نہ عصا ہے نہ تکیہ بلکہ دو عالم کا نور سمٹ کر ایک جگہ ہو گیا ہے اس لئے غش ہونیکا مقام ہے تجلی نور دیکھکر حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو غش آ گیا تھا۔ نور دیکھ کر غش آنا ایک مشہور و معمولی بات ہے۔ اس لئے غش ہونیکا مقام کہا۔ دونوں آنکھیں عالم نور ہیں اور دونوں آنکھوں میں سے ناک میں راستہ ہے پس گویا دو عالم چشم کا نور سمٹ کر بینی میں آ گیا ہے ہمشکل محمد مصطفےٰ صلعم کی مدح واقعی سب حسینوں سے الگ اور ایسی ہی اعلےٰ ہونی چاہئے۔ یہ خاص طرز مرزا مرحوم کا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بینی کا کھلا بیچ میں آنکھوں کے یہ اسرار	ہے بیچ میں اک تکیہ دو جانب ہیں دو بیمار
بیمار ہیں مخمور مئے الفت غفّار	بیہوشی میں بھی غیر یہ تکیہ نہیں زنہار

پلکوں کے سوا نام کو بستر نہیں رکھّا
سونا کہاں تکئے پہ کبھی سر نہیں رکھّا

پھر مدحت بینی میں مری عقل رسا ہے	نیزہ ہے نہ تکیہ ہے نہ خامہ نہ عصا ہے
اب ہم سے محبّان علیؑ پوچھیں یہ کیا ہے	ہشیار ہو ہشیار یہ غش ہونے کی جا ہے

بینی کی زیارت کرو آداب سے ہٹ کر
اک جا ہوا ہے۔ نور دو عالم کا سمٹ کر

(۲) صنعت رجوع میں ایک یہ بند بھی مدح سراپائے ہمشکل محبوب خداؐ میں قابل صاد ہے۔

تاروں کا ہے دعوےٰ کہ یہ رخ بدر دجےٰ ہے	پر بدر ہے منکر۔ یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذرّوں کا اشارہ ہے کہ یہ شمس ضحےٰ ہے	خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے

پروانہ و بلبل میں جدا بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

لف ونشر۔ لف کے معنی لپیٹنے کے اور نشر کے معنی بکھیرنے کے ہیں۔ یہ صنعت اس طور پر ہے۔ کہ اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ پس اگر منسوبات نمبروار لائیں۔ تو اُس کو لف ونشر مرتب کہتے ہیں۔ اور یہ اعلےٰ قسم ہے۔ ورنہ غیر مرتب کہینگے۔

خدائے سخن فردوسی طوسیؒ کا ایک مشہور قطعہ ایرانیوں میں لاجواب مانا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند	بشمشیر وخنجر وبگرز وکمند

دریدؔ و بریدؔ و شکستؔ و بستؔ یلاں را سر و سینہ و پا و دست ✗

فایدہ اس کا ظاہر ہے۔ کہ بہت بڑا مضمون تھوڑے لفظوں میں آ گیا۔ یہ صنعت نظم و نثر دونوں میں آتی ہے۔

اب اردو کے خدائی سخن دبیر کی نظم اس صنعت میں سُنئے۔ اور انصاف فرمائیے کہ کس کی نظم بہتر ہے۔ یہ میں عرض کرونگا۔ کہ ایجاد و تقدم کا فخر تو فردوسی کو ہے۔ مگر وہ ایک معمولی پہلوان کی مدح کرتا ہے۔ جو اُسی (فردوسی) کا بڑھایا ہوا ہے چنانچہ خود کہتا ہے

منش کردہ ام رستم داستاں وگرنہ یلے بود در سیستاں

اور دبیر کے ممدوحؑ معمولی پہلوان نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کا زور خداداد ایسا ہے۔ کہ ویسے بہادر خدا کی خدائی میں نہیں ہوئے۔ واقعہ کربلا زبان حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ دبیر کے ممدوح کو خدا نے بڑھایا ہے۔ بہرحال کلام دبیر ایسے شجاع ازلی ولی ابن ولی جانِ محمدؐ دلبندِ علیؑ کی مدح میں ہونے سے ضرور فردوسی کے کلام پر ترجیح و تفضیل پانیکا حق رکھتا ہے۔ یا اُن کے بھائی (ابو الفضل العباسؑ) یا فرزند (علی اکبرؑ) کی مدح میں ہے۔ تو وہ کلام بھی مرتبہ میں قریب قریب اُسی مدح امامؑ کی ہے۔ یا اور شہدائے کربلا کی ثنا میں ہے جب بھی دُنیا کے معمولی لوگوں سے بدرجہا بہتر و اعلےٰ ہے۔ اس راہ سے کلام دبیر کلام فردوسی سے بہتر ہے۔ اور جو صفائی اور بیساختہ پن مرزا کے کلام میں ہے۔ اُس سے بھی ضرور مرزا کے حق میں افضلیت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے۔ کہ فردوسیؒ نے صرف ایک قطعہ کہا۔ مرزا نے لف و نشر کے دفتر کے دفتر لکھ دئے ہیں

(۱) اشجع عالم امام زماں امام حسینؑ جہاد راہ خدا کے واسطے آرہے ہیں۔ اُس آمد کی ہیبت جو عالم کی کیفیت ہے۔ اُس کی تصویر دیکھئے۔ اس تصویر دیکھنے کے واسطے تھوڑی دیر

✗ میں نے لف و نشر الفاظ پر نمبر لگا دئے ہیں۔ تاکہ سمجھنے والے نمبر ملا کر سمجھ لیں یعنی تلوار سے سر پھاڑ (کاٹا) خنجر سے سینہ کاٹا۔ گرز سے پاؤں توڑے۔ کمند سے ہاتھ باندھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے لئے دُوسرے عقیدہ رکھنے والوں کو بھی مصنّف کی عقیدت کی عینک لگا لینا چاہئے۔ کہ جو امامؑ کو خدا کا جانشین زمین پر سمجھتے ہیں۔ اور ہر شئے کو امام کا تابع جانتے ہیں۔ جیسے صوفی غوث کو سمجھتے ہیں۔ اور اُس زمانہ سنہ کا غوث صوفی بھی امام حسین علیہ السلام ہی کو غوث سمجھتے ہیں۔

لف و نشر مرتب

لے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم
وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم
جس طرح سے آندھی میں جُدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں۔ خوں سے۔ اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اُڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

آمد امام

(۲) امام حسینؑ میدان جنگ میں تشریف لاتے ہیں۔ عالم پر ہیبت طاری ہے۔

یاں بخت وہاں عمر ادھر عقل اُدھر ہوش
خوابیدہ و برباد و پراگندہ و روپوش
یاں ناطقہ واں حافظہ خاموش و فراموش
بے نور ادھر چشم تو بے بہرہ اُدھر گوش
واں شیر فلک جھکتا ہے تسلیم کی خاطر
یاں گاو زمیں اُٹھتی ہے تعظیم کی خاطر

تیغ ذوالفقار

(۳) جہاد میں امام حسینؑ کی شمشیر شرر بار (ذوالفقار) علم ہے۔

ایمان و کفر و توبہ و عصیان دم جہاد
یہ زندہ اور وہ مردہ یہ خوشدل وہ نامراد
کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیر خوش نہاد
جوہر۔ کمند۔ لوگ سناں۔ خود وہ برق و باد
دشمن کو قید آب و خورش سے چھڑا دیا
کھینچا۔ گرایا مارا۔ جلایا۔ اُڑا دیا

لہ صرف اول کے دو مصرعوں میں لف و نشر مرتب ہے۔ چرخ کو سکتہ۔ دشت کو گرد۔ کہسار (پہاڑ) کو رعشہ اور سمند کو تلاطم مصنف نے قرار دیا ہے۔ باقی چاروں مصرع میں نے اس خیال سے لکھ دئیے ہیں۔ کہ سخن فہم ناظرین تشبیہ و مضمون کا لطف اُٹھائیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

سلہ ایمان زندہ ہو گیا۔ کفر مردہ۔ توبہ خوشدل۔ گناہ نامراد ہو گئے۔ کمالات متضاد جمع تھے۔ جوہر تلوار کا یہ تھا کہ دشمن کو کھانے

سراپائے حضرت عباسؑ

(۴) حضرت عباسؑ کا نئے انداز سے سراپا لف ونشر میں - اور فقط ایک بند میں -

طیار مرقع ہو - اگر نورِ خدا کا ہو زیبِ رقم اوج اگر عرش عُلا کا
قالب جو بنے شاہ شہیداں کی ولا کا اور عطر کھنچے صاف گلِ مہر ووفا کا
مداح علمدار کے قدرت حق ہے
عباس کا یہ سر ہے - یہ تن ہے - یہ عرق ہے

(۵) جناب رسول خدا صلعم کا خاص گھوڑا عقاب نام جس پر ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ (شہید) سوار ہو کر جہاد کو جا رہے ہیں - اُس کی مدح -

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب
خورشید و سحاب فلک و انجم و مہتاب سوزاں و خروشاں و سراسیمہ و بے خواب
بازار گل و موج و صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے وہ آب ہے - وہ گرد ہے اس سے

بدحواسی

(۶) آمد علی اکبرؑ سے لشکر مخالف میں جو انتشار اور بدحواسی ہے - اُس کی تصویر اور عام چیزوں پر اُس کا اثر شاعرانہ -

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) پینے کی تمیز سے چھڑا دیا کہ وہ مر گیا کھانے پینے کی فکر نہ رہی - تلوار کمند کا کام دیا کہ دشمن کو کھینچا - اور نوک سناں کا کام دیا کہ گر کر مارا - اور بجلی کی طرح جلایا - آندھی کی طرح اُڑا دیا - اللہ اللہ کتنا بڑا مضمون ایک بند میں صفائی سے لائے ہیں +

ایک بات

اب ایک بات اور سن لیجئے - فردوسیؒ کے قطعہ میں ہر ایک چیز کے دو منسوبات تھے - اب تک مرزا صاحب کے کلام کے نظائر میں ایک چیز کا ایک ہی منسوب آیا ہے - یہ ممکن ہے - کہ کوئی شخص کہے - کہ فردوسی کا کمال بڑھا ہوا ہے - اس لئے اب میں مرزا صاحب کا ایک بند ایسا سُنانا چاہتا ہوں جس میں ایک ایک چیز کے گویا پانچ پانچ منسوبات ہیں - اور پھر لف ونشر مرتب ہے - غیر مرتب نہیں ہے - یہ اور کمال ہے - کیوں نہ ہو - مرزا صاحب پنجتن پاک کے مداح ہیں - اس لئے منسوبات بھی پانچ پانچ نکلے - وہ بند نمبر ۷ پر میں لکھتا ہوں سُنئے اور انصاف فرمائیے - کہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کا یہ قول کہ " تمام شاعروں سے فردوسی و جامی اور فردوسی و جامی سے دبیر و انیس بہتر ہیں " کس قدر صحیح ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

تیغیں وہ کھونے لگے جن کی بندھی تھی دھاک — موجوں نے خنجر اپنے چھپائے بزیر خاک
سیمرغ و شیر و کرگدن و گرگ خشمناک — پر بستہ۔ دل شکستہ۔ جگر خستہ۔ سینہ چاک
سہمے ہوئے پروں میں ستمگر تڑپتے تھے
بے پر تھے مرغ قبلہ نما پر تڑپتے تھے

(۷)

دو نیزے	دو رہوار	دو شمشیریں	دو صفدر
دو شمعیں	دو پروانے	دو دریا	دو شناور
دو بجلیاں	دو صاعقے	دو موجیں	دو کوثر
دو ابر تھے	دو رعد	دو باراں تھے	دو اختر
دو سرو	دو گلشن	دو مہِ نو	دو فلک تھے
دو سانپ	دو طاؤس	دو شاہیں	دو ملک تھے

عون و محمد پسران زینبؑ کی مدح میں یہ بند ہے۔ اب اس کے ساتھ شمع کو پروانے سے دریا کو شناور سے موج کو کوثر و دریا و شناور سے ابر کو رعد باراں سے اختر کو فلک اور مہ نو سے سرو کو گلشن سے سانپ کو طاؤس و شاہین سے اور پھر پردار جانوروں سے فرشتوں کو کہ وہ بھی پر رکھتے ہیں جو جو نسبت ہے وہ غور و انصاف سے دیکھئے۔ یہ بھی دیکھئے۔ کہ کتنے بڑے مضامین کس قدر مختصر و مناسب الفاظ میں کس بے تکلفی سے نظم کر دئے ہیں۔ اب جو چاہے۔ اس کو گورکھ دھندہ کہدے۔ چاہے بھول بھلیاں۔ مگر یاد رہے۔ کہ عام شعرا اور خصوصاً ایسے معترض ایسی نظم کرنے سے عاجز ہیں۔ ورنہ کہدیں۔ تو ہم جانیں۔ اور آئندہ ان تبرکات کو اردو میں آپ ڈھونڈینگے۔ تو شاید ملیں۔ کیونکہ اب زمانہ کی ہوا بدل گئی ہے۔ دماغ نہ ایسے قوی ہوتے ہیں۔ نہ ایسی محنتیں اب ہو سکتی ہیں*

جمع

صنعت جمع۔ شاعر یا ناثر چند چیزیں ایک حکم میں جمع کر دے۔ جیسے قرآن کی آیت کریمہ۔ المال والبنون زینۃ الحیٰوۃ الدنیا۔ یعنی مال و اولاد۔ زندگی دنیا کی زینت ہے۔ پس مال و اولاد کو ایک حکم زینت میں جمع فرما دیا ہے۔ دیکھئے اس بارہ میں مرزا صاحب کے یہاں

کیسے خوش ذائقہ پھل اور خوشنما خوشبودار پھول ہیں۔ میں چند نمونے دکھاتا ہوں۔ مثل مشہور ہے۔ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی۔ عام طور پر بہت مثالیں آپ کو جا بجا جلد دویم میں ملینگی*

مدح امام حسینؑ

(۱) نقاش و نقش و کاتب و خط و بانی و بنا
بود و نبود و ذات و صفت ہستی و فنا
آدم۔ ملک۔ زمیں۔ فلک۔ گرد۔ کیمیا
دنیا و دیں۔ حدوث و قدم۔ بندہ و خدا

سب شاہد کمال شہ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں

اس کمال کو دیکھئے۔ کہ ہر مصرع میں چھ چیزیں ٹانکے ہیں۔ نہ کم ہیں نہ زیادہ۔ اور پھر بے تکلف۔ جب تک زبان پر پوری قدرت اور طبیعت میں آمد نہ ہو۔ شاعر ایسی نظم نہیں کہہ سکتا*

مدح امام حسینؑ

(۲) باران و قطرہ۔ باغ و گل و معدن و گہر
صحرا و ذرہ۔ برج و نجوم۔ آتش و شرر
طور و کلیم و آب بقا۔ خضر نامور
ظلمات و نور و شہر و بیابان و خشک و تر

شاہد ہیں سب۔ کہ صاحب اعجاز ہیں حسینؑ
جاں آفریں کے عاشق جاں باز ہیں حسینؑ

باران و قطرہ اور باغ و گل اور معدن و گہر اور اسی طرح تمام الفاظ ہیں جو قدرت نے مناسبت رکھی ہے۔ وہ غور سے دیکھئے۔ اور پھر ٹیپ میں جان آفریں کے ساتھ جاں باز کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہی وہ الفاظ ہیں۔ جو دبیر کے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتے۔ اور انہیں باتوں نے دبیر کو دبیر منوایا ہے۔ پہیں منکروں کے سر نیچے ہوتے ہیں*

(۳) ذیل کے بند میں بہت سی چیزوں کو اس ایک حکم میں شامل کر دیا ہے۔ کہ سب میں ایک ایک عیب ہے۔ مگر رخ ممدوح (حضرت عباسؑ) بے عیب ہے۔

سورج کو چھپاتا ہے گہن آئینہ کو زنگ
داغی ہے قمر۔ سوختہ دل لالہ خوش رنگ
دیکھو گل و غنچہ وہ پریشاں ہے یہ دل تنگ
کیا اصل در و لعل کی وہ پانی ہے یہ سنگ

اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا

ان چیزوں کے علاوہ دنیا میں اور کوئی چیز قابل تشبیہ نہیں ہے۔ ناظرین اس کو بغور دیکھیں ۱۲ مؤلف حقیر

بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا

کمال یہ کیا ہے۔ کہ دُنیا بھر کی اعلےٰ درجہ کی چیزیں ہر قسم کی بیان کر کے سب کے عیب بیان فرما کر چہرہ ممدوح کو بے عیب اور سب سے بہتر ثابت فرمایا ہے۔

(۴) مدح رخ امام حسینؑ میں بہت سی چیزوں کو ایک دُوسرے انداز بیان سے جمع کیا ہے قریباً دُنیا بھر کے تمام منوّر اور قیمتی چیزیں آ گئی ہیں۔

شمع[1] و چراغ[2] و آئینہ[3] و صبح[4] و آفتاب[5]　　باغ[6] و بہار[7] و یاسمن[8] و لالہ[9] و گلاب[10]
ناہید[11] و بدر[12] و مشتری[13] و قطب[14] و ماہتاب[15]　　آب حیات[16] - لعل بدخشاں[17] - دُرِ خوش آب[18]
یوسفؑ[19] - اور اُن کے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف - یہ رُوئے ضیا بار اک طرف

اُنیس[19] چیزیں جمع کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ سب سے رُوئے انور بہین[20] (بہتر) ہے۔

(۵) یہ دو بند بھی مدح حضرت عباسؑ میں صنعت جمع میں مجھے بہت پسند ہیں۔

(۱) ہر کلیہ میں جزو یہ ہیں چیدۂ تقدیر　　مردوں میں علیؑ[1] تیغوں میں کرار کی شمشیر[2]
فرقان[3] کتابوں میں اور ارکان میں تکبیر[4]　　عباسؑ[5] علمداروں میں سرداروں میں شبیرؑ[6]
سقائے[7] حرم سا کوئی سقا نہیں دیکھا
اور ایسا علمدار بھی حقا نہیں دیکھا

(۲) شبیرؑ کے بازو[1] بھی ہیں اور زورِ کمر[2] بھی*　　رشتہ[3] میں برادر بھی ہیں اُلفت[4] میں پسر بھی
خادم[5] بھی مصاحب[6] بھی دل[7] و جاں[8] بھی جگر[9] بھی　　اللہ[10] کی شمشیر شہ دیں کی سپر[11] بھی

* زورِ کمر کے لفظ میں ایک باریک کنایہ شریت کا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت عباسؑ قتل ہوئے۔ تو امام حسینؑ فرماتے تھے اس وقت میری کمر ٹوٹ گئی۔ ہر موقع پر بین ورقت کا پہلو نکالنا یہ مرزا صاحب کا خاص کمال ہے ٹیپ میں کمال کیا ہے شمشیر و سپر تک تو عام خیال پہنچتا ہے۔ مگر آگے پھر خیال میں نہیں آتا کہ کیا کہینگے مرزا مرحوم نے ترقی یہ کی۔ کہ جب تیروں سے بدن چھن گیا۔ تو خود زرہ کی صورت بھی بن گئے۔ لہذا تلوار ڈھال کے علاوہ زرہ بھی ہیں ۲ اس میں بھی بین کا کنایہ ہے کہ حضرت عباسؑ پر تیروں کی بوچھاڑ ہوئی تھی ۱۲ مؤلف حقیر

تفریق

ثابت یہ ہوا رن میں جو تیر دل سے چھنتے ہیں
شبیرؑ کی خاطر زرہ حفظ بنتے ہیں

صنعت تفریق - دو امروں میں جو ایک طرح کے ہوں - فرق ظاہر کرنے کو صنعت تفریق کہتے ہیں - مرزا صاحب اس صنعت میں کہتے ہیں -

(رباعی مناقب میں)

(۱) رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر | حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر | وہ دیتا ہے رو رو کے، یہ خنداں ہو کر[1]

صفائے قلب اور آئینہ میں فرق

(۲) آئینہ کے آئین پہ میں نے جو کیا غور | منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور | پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور
جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے[2]

(۳) آئینہ اور روئے انور جناب عباسؑ میں نہایت عمدہ فرق بتاتے ہیں -

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی | صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی

---

[1] شعرا فیاض ممدوح کو ابر، بحر کرم، سحاب کہتے ہیں - مرزا صاحب کہتے ہیں، ابر بھی موتی دیتا ہے - مگر میرے ممدوح میں اور ابر میں فرق یہ ہے کہ وہ رو رو کے دیتا ہے - ابر کے برسنے کو رونا قرار دیا - اور حضرت ممدوح ہنس ہنس کے دیتے ہیں - یہ وہ مضامین ہیں جن کی بدولت دبیر دبیر مشہور ہوئے + ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] شعرا دل کو اور بعض سینہ کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں - شاید طالب آملی کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے "کفر است در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن" مگر مرزا صاحب دل اور آئینہ میں ایک عجیب و غریب تفریق بیان فرماتے ہیں وہ یہ کہ آئینہ منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ اور ہے - یہ بری صفت ہے - مگر میرا دل دونوں طرف چمک دمک و صفا و جلا میں یکساں ہے - پس اس کی تشبیہ آفتاب سے درست ہے - جو دونوں طرف یکساں چمک اور روشنی رکھتا ہے + ۱۲ مؤلف -

طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی — واں خاک نے صیقل۔ یہاں قدرت نے جلا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اُس رُخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

(۴) یاقوت اور لب حضرت عباسؑ میں تفریق۔

اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے — شیریں رقموں میں رقم اس لب کی جدا ہے
یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے — یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے
چوسا ہے یہ لب مثل رُطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا۔ کس روز؟ علیؑ نے

(۵) اسپ جناب رسول خدا صلعم کی مدح جس پر روز عاشورا امام حسینؑ سوار تھے۔

صانع نے گوندھ گوندھ کے ہیکل میں جو لگائے — آئینے آفتاب کے اتنے کہاں سے آئے
لائے تو سُم کی آنکھ میں وہ کس طرح سمائے — اور نعلبند چارہ نو کہاں سے لائے
سانچہ بنا جو بدر کا۔ تو شکل سُم بنی
خورشید کی کرن جو ہوئی جمع دُم بنی

تقسیم — **تقسیم**۔ جمع و تفریق کے بعد تقسیم بھی ایک صنعت ہے *۔ اس میں اور لف و نشر میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کہ لف و نشر میں اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ سُننے والا خود بخود ہر ایک شے کو منسوب الیہ کی طرف منسوب و تعیّن کر لیتا ہے۔ اور تقسیم میں کہنے والا چند چیزیں بیان کرتا ہے۔ یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعیّن بیان کرتا ہے۔ اور اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ کہ کسی شے کی

لطیفہ — * مجھے علم معانی و بیان کے عالموں اور شاعروں سے تعجب ہے۔ کہ جمع و تفریق و تقسیم تک تو صنعتوں کو لیا۔ مگر بیچاری ضرب کو چھوڑ دیا۔ لا الہ الا اللہ کہکر ایک ضرب اس پر بھی لگائی ہوتی۔ اور ایک صنعت کا نام ضرب بھی رکھ دیا ہوتا +۱۲ مؤلف حقیر

تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

اس صنعت تقسیم میں مرزا صاحب عزاداران امام حسینؑ کی مدح فرماتے ہیں:

پابندی طاعت پہ ہے اس مشغلہ کو فوق — سجادؑ کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دلدلؑ کے بنانیکا کسی شیعہ کو ہے ذوق — عباسؑ کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ۔ زہراؑ کے خلف کا
تابوتؑ اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

(اب ان سب کی تقسیم دیکھئے۔ ہر ایک کے ثواب کو اپنے عقیدہ کے موافق بیان فرماتے ہیں)۔

تابوتؑ اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت — دلدلؑ کے بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائیؑ کے انعام میں کوثر کی حکومت — دولتؑ ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابدؑ کے لئے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرہ حفظ خدا ہے

جمع وتفریق کو اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو ساتھ ساتھ لاتے ہیں۔ اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں یعنی چند چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے اُن کا فرق بیان کر دیں یا اُن کو تقسیم کر دیں۔ یا دونوں باتیں کریں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں:۔

(حضرت عباسؑ کی مدح میں)

پیدا ہوں جو ایسے چمنستانِ جہاں لاکھ — افلاک کروڑ اور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کے ہر اک قطرے سے طوفاں ہوں عیاں لاکھ — گھر گھر ہوں مُسن خضر سے۔ یوسف سے جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دُور کی شکلیں
سب نُور کے رخسار ہوں سب نُور کی شکلیں

کیا مُنہ جو نقابوں سے حسیں مُنہ کو نکالیں — عیسےٰ قسم انجیل کی بے ساختہ کھالیں
توریت کو موسےٰ یدِ بیضا پہ اُٹھالیں — فرقان مبیں فرق پہ خاصانِ خدا لیں

انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کہ یونہیں ہے
اِنّوں میں کوئی ثانیِ عباسؑ نہیں ہے

صنعت تجرید۔ یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ کے قصد سے اُسی شے کی مانند دُوسری چیز حاصل کریں اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے۔ کہ شاعر اپنے آپ کو دُوسرا شخص قرار دے کر اپنے نفس سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے کوئی شاعر خالی نہیں ہے۔ کیونکہ فی زمانا مقطع میں ہر شاعر اسی طرح خطاب کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے نفس سے خطاب کرتے ہیں:-

آغاز ترا خاک تھا۔ ہے خاک ہی انجام ‌ ‌ ‌ دیکھ اپنی بدی خُوب۔ بد و نیک سے کیا کام
گر مُہر نہیں دل پہ۔ تو نخوت کا نہ لے نام ‌ ‌ ‌ نازاں نہ ہو دُنیا پہ۔ نہ کر شکوۂ ایام
ارشاد کیا۔ طُور پہ مُوسیٰؑ سے خدا نے
اچھا وہ ہے۔ جو سب سے بُرا آپ کو جانے
(یعنی اپنے نفس کو)

(پھر اپنے نفس سے خطاب ہے)

بالوں کی سفیدی سے سرِ مُو نہیں رنجور ‌ ‌ ‌ دھوپ آگئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستور
ہُشیار کہ نزدیک رہا اب سفر دُور ‌ ‌ ‌ ہاں ڈھونڈ کفن مُشکِ جوانی ہُوا کافور
اے مُلکِ عدم کے سفری زادِ سفر لے
مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے *

مبالغہ مقبول مقبول کی قید اس لئے لگا دی ہے۔ کہ اگر وہ طبیعتیں جن کو مذاق سلیم حاصل ہے قبول نہ کرینگی۔ تو پھر وہ صنعت نہ رہیگی۔ اس صنعت میں تو مرزا صاحب ایسے مشہور و مقبول ہیں کہ جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رمسہ نے ایک سائل کے جواب میں اُن کے

* واقعی یہ چار دن سخت دشوار گذار گھاٹیاں در پیش ہیں۔ خدا آسان کرے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

مشہور بیت کی شرح (عشرۂ کاملہ) میں لکھ کر مدح فرمائی ہے۔ اور نافہموں کو سمجھایا ہے۔ وہ بیت یہ ہے،

اس رخش کے مُنہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا ✤ چلنے میں یہ سرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

مَیں نے جناب مفتی صاحب کی عبارت اس کتاب میں ایک دُوسرے موقع پر لکھی ہے۔ اس لئے یہاں طُول نہ دُونگا۔ مبالغہ سے یہ مراد ہے۔ کہ کسی شے کی صفت کو شدّت یا ضُعف میں اُس حد تک پہنچائیں۔ کہ عادتاً یا عقلاً بعید و محال ہو۔ اگر عقلاً ممکن ہو۔ تو اُس کو اغراق۔ اور عقلاً و عادتاً ممکن ہو۔ تو تبلیغ کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں مقبول ہیں۔ اور اگر عادتاً یا عقلاً دونوں طرح محال ہو۔ تو پھر اُس کو غلو کہینگے۔ یہ جب مقبول ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی ایسا لفظ لائیں۔ جو کلام کو صحت کے قریب کر دے۔ یا خیالات نازک و لطیف پیدا کریں[1]۔

(۱) مرزا صاحب کے کلام میں سے اب چند مثالیں اس کی پیش کرتا ہُوں۔ عقاب نام اسپ خاصۂ جناب رسالتمآب صلعم کی مدح میں فرماتے ہیں۔ جس پر بروز عاشورا سنہ ۶۱ھ علی اکبرؑ سوار تھے۔

چلنے میں یہ شمشیر ہے پلّے میں یہ ہے تیر ✤ لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں ہے تدبیر

چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر ✤ جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر

مضموں ہیں بہت۔ پر کوئی دلچسپ نہیں ہے[2]،

اسرار ہے۔ اعجاز ہے۔ یہ اسپ نہیں ہے۔

---

[1] اس نئی روشنی میں مبالغہ اکثر آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اور اکثر لوگ مذمت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ایشیائی شاعری بیچاری اسکی بدولت بدنام ہے۔ مگر وہ بزرگوار یورپ والوں کی اندھا دھند تقلید میں نہیں سوچتے۔ کہ مبالغہ سے کلام میں اثر و زور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جنکو کروڑوں آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں۔ مثلاً بائبل کی یہ مشہور آیت کہ تجھ کو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں سُجھائی دیتا۔ دُوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے۔ اس بحث کو مفصّل مَیں نے مولوی شبلی صاحب کے جوابات اعتراضات میں لکھا ہے ✤ ۱۲ مؤلّف۔

[2] یہ روزمرّہ ہے کہ تلوار چلے۔ اور تیر کا پلہ مشہور ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ چلنے میں (گھوڑا) گویا تلوار ہے۔ پلہ میں تیر ہی سیر کی طرح جاتا ہے۔ لڑنے میں تقدیر ہے۔ یہ بھی روزمرّہ ہے۔ کہ کہتے ہیں فلاں شخص کی تقدیر لڑ گئی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تدبیر بگڑ گئی۔

(۲) یہ بند اسپ جناب امام حسینؑ کی مدح میں ہے۔ یہ گھوڑا بھی جناب محمد عربی صلعم کا وفادار گھوڑا ہے۔ جس کو عام لوگ ذوالجناح کہتے ہیں۔ اور لسان الملک مرزا محمد تقی خاں سپہر مرحوم صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق مرتجز اس کا نام معلوم ہوتا ہے۔

لڑنے میں یہ ہے عقل۔ بگڑنے میں جہالت
بڑھنے میں ہے حرص۔ تو گھٹنے میں قناعت
جانے میں حواس آنے میں عاشق کی طبیعت
مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت
ہر سُو جو نسیم اس کے طرارے کی بھی ہے
سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے

مذہب کلامی ۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ کسی کلام کو دلیل کے ساتھ بیان کریں۔ اور اگر تمثیل یعنی قیاس فقہا کے ساتھ کلام ہوگا۔ تو اُس کو **مذہب فقہی** کہینگے۔ قرآن شریف میں یہ آیت اول الذکر صنعت میں ہے۔ لوکان فیہما الھۃ الا اللہ لفسدتا یعنی اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے۔ تو زمین و آسمان فاسد ہو جاتے۔ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد حضرت اوج مدظلہٗ کا مطلع یاد آگیا۔ کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

فساد حکم و عمل میں جُدا جُدا ہوتے + خلل خدائی میں پڑتا جو دو خُدا ہوتے

اب مرزا صاحب کا کلام اس صنعت میں سُنئے۔

(۱) ہوتی تھیں صفیں آبِ دمِ تیغ سے بے دم
پانی جو کھڑے ہوکے پیو ہوتا ہے سن کم
حل کرتی تھی۔ ہر مسئلہ تیغ شہِ عالم
ہے خون نجس اُس میں یہ آلودہ تھی ہر دم

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۲) یہاں یہ غرض ہے کہ یہ اسپ اس طرح لڑتا ہے جیسے مقدر اور غصہ میں قوی بگڑتا ہے جیسے تدبیر فوراً بگڑ جاتی ہے جیسے خواب چھپا ہوا ہوتا ہے اس طرح پوشیدہ ہے اور تعبیر خواب کی مانند ظاہر ہوتا ہے۔ جانے میں رسولوں کی دُعا ہے کہ کہیں رُکتی ہی نہیں۔ اور آنے میں تاثیر اجابت دعا ہے کہ انبیاؑ کی دُعا پر فوراً تاثیر قبول نازل ہوتی ہے۔ ایسے چار مصرعوں پر ٹیپ لگانا بہت مشکل تھا۔ مگر واہ وا کیا خیال بلند اور دماغ قوی پایا ہے۔ فرماتے ہیں ان سب چیزوں سے بڑھکر یہ ہے کہ یہ اسرار و اعجاز ہے۔ اسرار گو جمع ہے مگر واحد کے معنی پر اردو میں مستعمل ہے۔ اسرار و اعجاز نے اُوپر کے تمام مضامین کو صحت کے قریب کر دیا۔ کہ اسرار و معجزہ سے ہر نا ممکن ممکن ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ح

پر اس پہ نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
یعنی کہ نجس آبِ رواں ہو نہیں سکتا*

امام حسین علیہ السلام لشکریان یزید کو وعظ فرماتے ہیں

(۲) باطل ہے سوا حق کے بد و نیک کا سجدہ ہے ایک جبین فرض ہے بس ایک کا سجدہ

اس میں یہ استدلال ہے۔ کہ اگر کئی خدا ہوتے۔ تو ایک انسان کے ماتھے بھی کئی ہوتے۔ پس ایک پیشانی ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ایک ہی خدا ہے۔ اُسی ایک کو سجدہ کرو۔ اُسی کو مانو +

فصل ۲ حسن تعلیل

حسن تعلیل۔ اس صنعت کی تعریف یہ ہے۔ کہ کسی وصف کے واسطے ایسی علت و مناسبت کا دعوے کریں۔ جو درحقیقت اُس کی علت نہ ہو۔ مگر اس کا لطف یہ ہے۔ کہ ثابت کردیں۔ باقی اس کی تعریف معانی و بیان کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیے +

واضح ہو۔ کہ شاعری کی جان یہی صنعت ہے۔ حافظ و صائب کو اسی صنعت کی بدولت لاجواب شاعر مانا جاتا ہے۔ مولوی روم کی مثنوی اسی صنعت کے سبب سے ممتاز و مقبول ہے۔ غرضکہ ہر شاعر کامل کے یہاں یہ صنعت بکثرت ہے۔ جس شاعر کی قوت دماغی جس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ اُسی قدر اُس کے کلام میں لطف تخیل و حسن تعلیل زیادہ ہے۔ شاعری کی معراج کمال گویا یہ صنعت ہے۔ اسی صنعت کے سبب دبیر مرحوم کو ملک نے لاجواب شاعر مانا ہے۔ اسی مقام پر اور شعرا مرزا مرحوم سے نیچے نظر آتے ہیں۔ جن کو خدا نے شاعر پیدا کیا ہے۔ وہ (شاعر) نازک خیالیاں اسی صنعت کے لباس میں دکھاتے ہیں۔ اس کتاب کی جلد دوم میں اس کی ہزاروں مثالیں (غالباً) آپ کو ملینگی۔ یہاں دو چار مثالیں لکھتا ہوں۔ کہ طول نہ ہو +

* کیا اچھا استدلال ہے۔ فرماتے ہیں۔ آپ دم تیغ تو آبِ رواں کا حکم رکھتا ہے۔ گو دشمنوں کا خون نجس ہے مگر آبِ رواں سے مل کر آبِ رواں کو نجس نہیں کرسکتا۔ اُوپر کے مصرعوں میں ایک مشہور مثل بیان کی ہے۔ کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے عمر گھٹتی ہے۔ لشکری کھڑے کھڑے تیغ کا پانی پی رہے تھے عمریں گھٹتی جاتی تھیں۔ مرتے جاتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱) عبرتِ عالم و بے ثباتیِ زمانہ۔

گُل پانچ روز باغ میں گُل میہماں ہے | سبزہ۔گُل بہار کی رخصت کا پان[1] ہے

(۲) انکسار و فروتنی کی مدح۔ اور قلم کے کاغذ پر جُھکنے کی وجہ (حسن تعلیل)۔

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے | جُھک کر شرفا اور نُجبا ملتے ہیں سب سے[2]

(۳) خلق و مروّت و انکسار کی معراجِ کمال۔

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو | مانندِ غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو[3]

(۴) صبح عاشورا امام حسینؑ نے علم رسالت پناہ صلعم نکال کر نصب فرمایا ہے۔ ابھی تک کسی کو دیا نہیں۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔

کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں | اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

(۵) حضرت عباسؑ علمدار کی شہادت کے بعد علم امام حسینؑ گھر میں لاتے ہیں۔

ڈیوڑھی پہ علم غرقِ بخوں آیا کہ محشر | ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لرز کر

(۶) ذوالفقار آبدار میں سے دشمنوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حُسن کا | جو بن ٹپک رہا تھا جوانی کے حُسن کا

(۷) ذوالفقار نے اُن بے حیاؤں کی ناک بھی اُڑا دی۔

---

[1] رخصت کا پان چلتے وقت مہمان کو دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ باغ میں سبزہ نکلا۔ کہ گویا بہار کو رخصت کا پان پہنچا۔ اب بہار رخصت ہے۔ یہ مضمون عرب و عجم کے یہاں تو کیوں ہوتا۔ کہ وہاں پان کا رواج ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک میرا علم ہے کسی ہندی شاعر نے بھی نہیں کہا ہے۔ بالکل نیا اور نازک خیال ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] فرماتے ہیں۔ قلم جو کاغذ پر جُھکتا ہے یہ ادب کی افراط و زیادتی سے (کہ جو انکسار ہوا) جُھکتا ہے جیسے شریف و نجیب سب سے جھک کر ملتے ہیں۔ ویسے کاغذ سے قلم جُھک کر ملتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] ہوا اُڑ کر غبار کو پریشان کر دیتی ہے۔ گویا دشمن ہے۔ مگر غبار اپنی دشمن (ہوا) کی بھی تعظیم کرتا ہے۔ اسی طرح میں دشمن سے بھی خلافِ مروت و حیا نہیں کرتا اور آئے بھی تعظیم دیتا ہوں۔ یہ بیت گویا مرزا مرحوم کے حسن اخلاق کا آئینہ یا فوٹو ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

عبرت عالم — فروتنی — مروت — تماشہ — تماشہ — ہتھ پنجہ — ضعف خوفناک — تلوار

چہرے سے ہینی صفِ لشکر بھی دُور کی — بُت خانے سے شباہت منبر بھی دُور کی

(۸) حضرت حرؑ جری کے جسم پر جو زرہ ہے۔ اُس کی نسبت حسن تعلیل۔

رزہ حرؑ

دل صاف سینہ صاف۔ بدن صاف واہ واہ — تن پر زرہ بتاتے ہیں گو صاحب نگاہ

پر عقل کہہ رہی ہے کہ سب کو ہے اشتباہ — حرؑ کی صفائے قلب ہے اس بات پر گواہ

دل حرؑ کا مضطرب غم شاہ زمنؑ میں ہے

یہ دل کا پیچ و تاب نمایاں بدن میں ہے

یہ عجیب بات کہی ہے۔ کہ زرہ نہیں ہے۔ بلکہ دل کا پیچ و تاب صفائی قلب کی بدولت نظر آرہا ہے۔ دور سے دیکھنے والے اُس کو زرہ سمجھتے ہیں۔ رعب دلاور کی وجہ سے پاس کون جاکر دیکھ سکتا ہے۔

باغ میں فوّارہ جاری ہے

فوّارہ

(۹) فوّارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا — پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اُٹھا تھا

گرمی کی شدت میں فوّارہ کی حسن تعلیل

گرمی فوّارہ

(۱۰) فوّارہ کہنہ حوض میں گرمی سے کل پڑی — پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

گرمی کا سماں

گرمی اور دھوپ

(۱۱) چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھپ رہی ہے دُھوپ درختوں کی چھاؤں میں

شب عقد جناب امیرؑ

شب عقد جناب امیرؑ

(۱۲) ناگاہ وہ شام آئی کہ جو صبح سے لے باج — غازۂ رخ نوروزِ کا عیدین کی سرتاج

حُسن شب قدر و شب بدر و شب معراج — تھی رات بھی نازاں کہ علیؑ کی ہے برات آج

کثرت وہ ستاروں کی شب جلوہ فگن پر

مشاطوں کا جھرمٹ تھا شب عقد دلہن پر

سج دھج تھی عروس شب شادی کی نرالی — پھولی شفق شام کے لالے کی جو لالی

ہلکی سی لب بام فلک اُس نے جمالی — پازیب بھی اور کان کے مُندے بھی ہلالی

موباف زری نظم کیا کہکشاں کو
مضموں یہی چوٹی کا ملا اہلِ زباں کو[1]

تاکید المدح بمایشبہ الذم۔ یعنی مدح میں ایسی تاکید کی جائے۔ کہ مذمت کے مشابہ معلوم ہو۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

(۱) بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہلِ ہنر ہوں[2]

(۲) میں کون ہوں صاحب علم کلک جہانگیر نوبت زن نہ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر خاکِ قدم محتشم و مقبل شبیر[3]

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے۔ خداوند یوں ہیں ہے

ف ۱ یورپ میں ایسے نامور و مشہور شعرا کے کلام میں چھانا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلے پہل کون کون سے محاورے اور الفاظ نظم کئے اور خوش سلیقگی و صفائی سے نظم کئے ہیں یا نہیں ہمارا ملک ابتک ایسے جزئیات سننے کا مشتاق ہے نہ کوئی شخص ایسی سر دردی کرنیکو طیار ہے ورنہ دبیر مرحوم کے ایسے محاوروں اور الفاظ کو کوئی شخص جمع کرے تو معلوم ہو کہ جس کثرت سے اس قادر الکلام شاعر نے الفاظ و محاورے (عمدگی و روانی سے) نظم فرمائے ہیں شاید کسی اور شاعر نے نظم کئے ہوں ایسی ایک بند میں دیکھ لیجئے سیج دھج بنالی لالی ہلکی سی جھیلی پازیب ادھر بندے موباف چوٹی عروس کے سامان آرائش کے کتنے الفاظ کس حسن خوبی سے جمع کر دئے اور پھر ابتذال نہیں پیدا ہوا۔ اب چوٹی کے لفظ میں صنعت ایہام ہے۔ ایک تو یہ مراد ہے کہ چوٹی کیواسطے موباف زری کاہکشاں کو بنایا۔ دوسرے یہ کہ چوٹی کا مضمون ملا یعنی اعلیٰ درجہ کا مضمون ہاتھ آیا ۱۲ مؤلف

ف ۲ آسمان جو میرا دشمن ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں ایک بڑا عیب ہے۔ بظاہر سننے والا یہ سمجھا کہ شاعر اپنا عیب بیان کرتا ہے پھر جب اس عیب کی تشریح کی تو یہ کی کہ میں صاحب ہنر ہوں لہذا یہ مذمت نما مدح ہوئی کہ صاحب ہنر ہونا فی الحقیقت عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ مگر دشمنی فلک کا باعث یہی ہنر ہے اسی کی بدولت زمانہ دشمن ہو رہا ہے پس گویا مجھ میں یہی بڑا عیب ہے ۱۲ مؤلف حقیر

ف ۳ یہ چوتھا مصرع اس صنعت میں ہے۔ کہ خاک قدم ایک ناقص چیز ہے۔ بظاہر مذمت پائی گئی۔ مگر جب الفاظ مابعد پر غور کیا۔ تو معلوم ہوا کہ اہلبیت محمد صلعم کے مقبول مداحوں (محتشم و مقبل) کی خاک قدم شاعر خاکسار اپنے آپکو کہ رہا ہے۔ یہ در اصل مدح میں تاکید ہو گئی مولوی شبلی صاحب اسکو بے ربط فرماتے ہیں۔ یا تو انکی ناواقفی انکی عذر خواہ ہے۔ یا مقتضائے طبیعت عالی ہے۔ (پہلا مصرع حذف کر کے پڑھئے) عیب نما بہ ہنرش در نظر مفصل یہ بحث تردید اعتراضات مولوی شبلی صاحب میں ملاحظہ فرمائیے ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) معصوم کی صفت میں کہتے ہیں۔

قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی　　لیکن نہ ہے نہ ہوئیگی قدرت گناہ کی[۱]

(۴) حضرت علی اکبرؑ رجز میں فرماتے ہیں

جز دست گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے　　تجبہ کرم حق پہ ہے۔ بستر نہیں رکھتے[۲]

(۵) مدح سخاوت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

ہوتے جو نہ تیس روزے واجب تو علیؑ　　اک روز بھی اُمت کو نہ بھوکا رکھتے[۳]

(۶) منقبت جناب امیرؑ میں کہتے ہیں۔

کیا زہد ہے کیا فیض کہ رغبت سے کبھی　　روزے کے سوا کچھ نہ علیؑ نے رکھا[۴]

استتباع

استتباع۔ اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔

(۱) منقبت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت　　لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت

گردوں نے بلندی لی۔ زمیں نے زر و دولت　　یوسفؑ نے لیا حسن۔ سلیماںؑ نے حشمت

پر ان کی قناعت ہے فزوں حد بیاں سے

جز نامِ خدا۔ آپ لیا کچھ نہ زباں سے[۵]

---

[۱] طاقت و قدرت نہ ہونا بظاہر ایک نقص ہے مگر گناہ کی قید لگا دی کہ گناہ کرنیکی قدرت نہیں ہے۔ یہ مدح ہو گئی + ۱۲ مؤلف

[۲] زر رکھنا سخی کیواسطے گویا عیب ہے مگر اس کے ساتھ کہدیا کہ جز دست گدا۔ تو یہ اعلی درجہ کی مدح ہو گئی۔ کہ یہ سخی فقیر کے ہاتھ میں زر رکھتے ہیں اور کہیں نہیں رکھتے + ۱۲ مؤلف

[۳] دوسرے کو بھوکا رکھنا بظاہر بری بات ہے۔ مگر روزے کی قید سے مدح ہو گئی۔ کہ روزے کی وجہ سے تیس روز بھوکا رکھا + ۱۲ مؤلف

[۴] کچھ پاس رکھنا سخی کیواسطے گویا عیب ہے مگر روزہ کے استثنا نے اسکو مدح کر دیا۔ کہ بس روزہ ہی رکھا اور کچھ نہ رکھا۔ اور یہ بیت صنعت استتباع میں بھی آسکتی ہے جس صنعت کا اس کے بعد بیان ہے۔ کہ مدح عبادت میں سے مدح سخاوت بھی نکلتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۵] نام خدا کے سوا کچھ زبان سے نہ لیا پس صفت قناعت میں سے صفت عبادت نام خدا لینے کو نکالا۔ اس میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ علیؑ خدا کا نام ہے۔ نام خدا کا بس لیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۲) امام حسینؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ فوج یزید پر ہیبت و ابتری طاری ہے۔

درہم ہیں یوں پرے۔ کہ قرار اب محال ہے
درہم کا شہ کے دستِ کرم میں جو حال ہے[۱]

(۳) حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں۔

دُنیائے دنی ان کا نشانِ کفِ پا ہے
لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جُدا ہے[۲]

عقبےٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو۔ کیا ہے؟
وہ اک رہ باریک ہے۔ یہ راہ نُما ہے

لو سُن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے
بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

ادماج۔ یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے۔ کہ ایہام میں ایک لفظ ذو معنیین ہوتا ہے۔ اور ادماج میں تمام کلام سے دُوسرے معنی نکلتے ہیں۔ اور ادماج عام ہے۔ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔

ادماج

مرزا صاحب اس صنعت میں اُس موقع پر فرماتے ہیں۔ کہ جب شمر نے عونؑ و محمدؑ پسران جناب زینبؑ کو دو علم پیش کر کے ملانا چاہا ہے ؎

بہکا اُنہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
کہ اُن سے یہ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں[۳]

تعجب۔ یعنی کلام میں کسی فائدہ یا غرض کے واسطے تعجب ظاہر کریں۔ اور ایسے تعجب سے اکثر شاعر کی غرض مبالغۂ مدح ہوتی ہے +

تعجب

ف۱ اس میں شجاعت کی مدح ہے کہ ہیبت آمد سے پرے درہم و برہم ہو رہے ہیں اور تشبیہ یہ دی کہ جیسے امام حسینؑ کے دست کرم میں آ کر درہم بے قرار رہتا ہے۔ کہ وہ جناب کسی کو دیدیں۔ اس سے ایک دُوسری مدح سخاوت کی نکلی درہم و درہم میں تجنیس خطی بھی ہے۔ یہ مزید برآں ہے + ۱۲ مؤلف

ف۲ دُنیا کو انکی کف پا کا نشان بتایا پھر اُسی میں سے دُوسری مدح نکالی۔ کہ وہ ایسا نشان ہے جو کف پا سے جُدا ہے واقعی نشان کف پا سے ہر قدم پر جُدا ہوتا رہتا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ دُنیا انکی بدولت قائم ہوئی ہے تاہم یہ دُنیا سے ہمیشہ الگ رہتے ہیں (ٹیپ میں) پانچویں مصرع میں حق خدا کے معنی پر ہے۔ چھٹے میں حق، باطل کی ضد ہے۔ اختلاف معنی کے سبب سے قافیہ ایطا کی تعریف سے نکل گیا اور جائز ہو گیا + ۱۲ مؤلف حقیر

ف۳ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ انکو بہکا جو تجھکو نہ جانتے ہوں۔ دُوسرے معنی یہ نکلے کہ انکو بہکا جو تجھکو شقی نہ سمجھتے ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر

آمد جناب علی اکبرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں

(۱) نورِ نظرِ شاہ جو گھر سے نکل آیا — حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا
(۲) ہنستے تھے آہ روئے پہ ابنِ بتولؑ کے — کیسے یہ کلمہ گو تھے جناب رسولؐ کے

فصل ۹ صنائع لفظی

صنائع لفظی

اُوپر جتنی صنعتیں بیان ہوئیں۔ اُن کا تعلق معانی (مضامین) سے تھا۔ اب جو صنعتیں بیان کرونگا۔ اُن کا تعلق الفاظ سے ہوگا۔ علمائے معانی و بیان کا ارشاد ہے۔ کہ ہر شاعر و ناثر صنائع لفظی پر معانی کو مقدم رکھے۔ ایسی صنعت نہ ہو۔ کہ الفاظ تو پیارے معلوم ہوں۔ مگر مطلب خاک نہ نکلے۔ اب دیکھئے۔ کہ ان مشکل صنائع میں مرزا صاحب کس قدر کامیاب ہوتے ہیں۔ اور اُن کی نظم کس قدر بامعنی ہوتی ہے۔ ان صنائع میں بیساختہ پن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ عموماً آورد ہوتی ہے۔ مگر جن شعرا کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ اور طبیعت تیز اور دماغ سلیم ہے۔ اُن کے کلام میں باوصف ایسے صنائع کے بھی کبھی کبھی روانی و بیساختہ پن قائم رہتا ہے۔ ہمارے مرزا صاحب ایسے کاملوں کے سرتاج ہیں۔ وزیر صاحب مرحوم لیپو جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسمہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ اکثر مرزا صاحب کے بے نقط مرثیہ (ع مہر علم سرور اکرم ہوا طالع) کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ فیضی نے سواطع الالہام تفسیر قرآن بے نقط لکھی۔ مگر جابجا ٹھوکریں کھائیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کو ولد الاعمےٰ لکھا ہے۔ لفظ اعمےٰ ایک نبی معصوم (یعقوبؑ) کی نسبت سوءِ ادب ہے۔ مرزا صاحب کا مرثیہ ان لغزشوں سے پاک ہے*۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اب چند صنعتیں (لفظی) سُنئے:۔

* اس حکایت کو میں نے دوسرے مقام پر بھی اس کتاب میں لکھا ہے ۲۰۔ مؤلف حقیر۔

تجنیس

صنعت تجنیس۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) دو لفظ ایسے لائیں۔ جو صورت میں ایک ہی ہوں۔ مگر معنی مختلف ہوں۔ (۲) دونوں الفاظ کے اجزا میں مشابہت ہو۔ (۳) قریب المخرج الفاظ ہوں۔ (۴) تجنیس قلب کہ ایک لفظ کو اُلٹیں۔ تو دوسرا لفظ پیدا ہو۔ اس صنعت کی لے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی۔ کہ پورے مصرع یا فقرہ کو اُلٹیں۔ اور وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دُوسرا فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ اس کو مقلوب مستوی کہتے ہیں تجنیس کی ایک قسم تجنیس تام ہے جو قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ یوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعۃ[1]۔ اس میں ساعۃ کے لفظ اول قیامت کے معنی پر دُوسری گھڑی بھر کے معنی پر ہے۔ اسکی مثالیں مرزا صاحب کے کلام میں بہت ہیں حسب ذیل پیش کرتا ہوں:۔

زاری بمعنی

(۱) رباعی ذیل میں ایک لفظ زاری کو تین جگہ تینوں قافیوں میں لائے ہیں۔

رباعی

مومن کو ہر اک لکاسے بے زاری ہے | واجب غم شہ میں گریہ و زاری ہے
جز ماتم نور عین زہرا رونا | آنکھیں کہتی ہیں ہر دم آزاری ہے[2]

(۲) رجز میں حضرت عباسؑ فضیلت جناب امیرؑ کی بیان فرماتے ہیں۔

جب قبلہ کو ہم نے رُخ امید پھرایا | مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا[3]

---

[1] ظاہری الفاظ کے معنی یہ ہیں "جس روز قیامت قائم ہوگی۔ گنہگار قسم کھائینگے۔ کہ نہ ٹھیرے وہ مگر ایک گھڑی" + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] پہلے مصرع میں بیزاری نفرت کے معنی پر۔ دُوسرے میں زاری رونے کے معنی پر۔ چوتھے میں ہر دم آزاری آدمیوں کو دُکھ دینے کے معنی پر ہے۔ مگر اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ اپنی آنکھوں کو آزاد دینا کیونکہ مردم کے دُوسرے معنی پُتلی کے بھی ہیں۔ یہ دُوسری صنعت ہے جس کو ایہام کہتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] پہلے مصرع میں منہ پھرایا کے معنی منہ کو پھیر لئے ہیں۔ دُوسرے میں پھر آیا کے معنی پلٹ آنیکے ہیں۔ رجعت خورشید کے مشہور معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بیت ذوقافتین بھی ہے۔ ایک قافیہ امید و خورشید دُوسرا پھرایا۔ پھر آیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

لفظ بار چار معنی پر

(۳) ذیل کے چاروں مصرعوں میں (قافیہ میں) بار کا لفظ ہر جگہ ایک نئے معنی پر ہے اور پھر تکلف یہ ہے کہ بے تکلف نظم ہے۔ حضرت عباسؑ کی مدح میں ہے۔

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سرِ دربار — دُربار ہیں دُربار علیؑ ہوتے ہیں پربار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھربار — عارض ہیں قمربار لبِ لعل گہربار

یہ والی۔ اقلیمِ ولایت کا ولی ہے
تصویر تو لاکے حسینؑ ابنِ علیؑ[1] ہے

تجنیس خطی

تجنیس خطی بھی اسی کی شاخ ہے۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ وَھُوَ یُطعِمُنِی وَیَسقِین وَاِذَا مَرِضتُ فَھُوَ یَشفِین[2] اس میں یسقین و یشفین میں تجنیس خطی ہے۔ کہ ایک طرح لکھا جاتا ہے۔ فقط نقطوں کا فرق ہے۔ قرآن ناطق جناب امیرؑ کا ایک خطبہ بھی اس صنعت میں مولوی ظہیر الدین صاحب بلگرامی کی کسی کتاب شاید ظہیر الانشا میں میری نظر سے گذرا ہے۔ مگر اس وقت وہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ ورنہ لکھ دیتا۔ اور نہج البلاغہ میں وہ خطبہ مجھے نہیں ملا۔ شاید نہج البلاغہ کے علاوہ جو خطب ہیں۔ اُن میں ہو۔ مرزا صاحب کا اس صنعت میں ایک بند لکھتا ہوں۔

جبیب ابن مظاہر پیغام عقد جناب امیرؑ لیکر والد ماجد حمیدہ (حمیدہ کا نام ام البنین ہے) کے پاس گئے ہیں۔ اُس موقع پر والد حمیدہ جناب امیرؑ کے اوصاف حمیدہ میں کہتے ہیں۔

---

[1] دُربار مصرع اول میں ایک مستقل لفظ لائے۔ پھر دوسرے میں دُربار لائے۔ جو کتابت میں دربار سے مشابہ ہے اس میں تجنیس خطی ہے۔ پھر پربار لائے جس کے معنی ہر دفعہ کے ہیں تیسرے مصرع میں گھربار زبان اردو کا ایک ٹکسالی لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں مکان اور تمام سامان و اسباب مکان کا چوتھے مصرع میں گہربار لائے جس میں اور گھربار میں تجنیس خطی ہے اور گہربار کے معنی موتی برسانے والا ٹیپ میں والی ولایت ولی تولا کے الفاظ میں صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق ہے جو حقیقت میں تجنیس ہی کی سرسبز و خوش نما شاخیں ہیں۔ ناظرین! دیکھئے بار میں ہر کس قدر سلیس نظم ہے ع یہ نظم مسلسل ہے کہ موتی کی لڑی ہے صل علے محمد و آل محمدؐ ۱۲ مولف حقیر۔

[2] وہ (خدا) مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں۔ تو مجھے شفا دیتا ہے ۱۲ مولف حقیر۔

بولا صدف عقل کا وہ دُرِ یگانہ — آدم کے پسر ہیں بشر فخرِ زمانہ
میں تم ہوں وہ یم ہیں میں خرابہ وہ خزانہ[1] — تجنیس سہی فرق تلفظ بھی ہے یا نہ

اشتقاق و شبہ اشتقاق — صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق بھی صنعت تجنیس کی گویا مُنہ بولی بہنیں ہیں۔ اشتقاق یہ کہ دو لفظ ایسے لائیں۔ جن کا ایک مادّہ ہو۔ اور شبہ اشتقاق یہ کہ ایک مادہ تو نہ ہو مگر بظاہر ایک مادّہ معلوم ہوتا ہو۔ صنعت شبہ اشتقاق میں یہ آیت قرآن مجید پائی جاتی ہے۔ قال انی لعملکم من القالین[2]۔ اس میں قال اور قالین میں شبہ اشتقاق ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

(۱) بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق — ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق

اس میں طاقت و طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔

شبہ اشتقاق و ذوقافتین — (۲) بند ذیل کے اوّل کے چاروں مصرعوں میں یہ صنعت اور اس کے ساتھ صنعت ذوالقافتین دیکھئے شمشیر حسینی کی مدح (جہاد امام حسینؑ) کے بیان میں کہتے ہیں۔

یاں سب کو تھا یقین وہاں تھی وہیں نہ تھی — واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی — لاکھوں کے قتل کر نیکو ہاں تھی نہیں نہ تھی
اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھے جہاں زمیں نہ تھی آسماں نہ تھے
(شبہ اشتقاق)

(۳) حضرت حُرِّ دلیر کی آمد سے لشکرِ دشمن میں انتشار ہے۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہرچند اولاد آدم ہونیکے رشتہ سے میں مثل آپ کے ہوں۔ مگر کہاں وہ کہاں میں۔ تم یم نہیں ہو سکتا۔ خرابہ خزانہ کا مرتبہ نہیں پا سکتا۔ ہرچند تجنیس خطی ہے مگر تلفظ کا فرق ہے۔ یہ اُس کا جواب ہے کہ صبیب ابن مظاہر نے کہا تھا۔ کہ جناب امیر علیہ السلام ایسے ہیں فروتن کہ منقولہ ہے یہ ہردم۔ ہر بندہ حق سب بنی آدم ہیں وہی ہم۔ پیدا کیا کعبہ میں یہ قدرت ہے خدا کی بخشی جو امامت یہ عنایت ہے خدا کی ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] کہا کہ میں تمہارے اعمال کے سبب سے تمہارے دشمنوں (بغض رکھنے والوں) میں سے ہوں ۱۲ مؤلف حقیر

تشبیہ اشتقاق

کھولا کسی نے جینے سے ہو کر بہ تنگ تنگ — گوشے میں کوئی رکھ کے کمان و خدنگ ونگ

بے وقفہ ہوش اُڑ گیا اور بے درنگ رنگ — یہ کیا تھا منزلوں ہوئے پائے پلنگ لنگ

گو مکر و حیلہ۔ ظالموں کی آب وگل میں تھا

اُس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل میں تھا

مقلوب

صنعت مقلوب ۔ ایک لفظ کو لوٹنے سے دُوسرا لفظ پیدا ہو۔ یہ بھی ان اقسام تجنیس کی ایک قسم ہے۔ اور سب سے زیادہ مشکل صنعت مقلوب مستوی ہے۔ کہ ایک فقرہ یا مصرع کے اُلٹنے سے وُہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ سب سے پہلے قرآن شریف میں یہ صنعت ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) **ربّک فکبّر**۔ (۲) **کلٌ فی فلک** میں الگ الگ حرف لکھتا ہوں۔ آپ چاہے دہنی طرف سے پڑھیں۔ چاہے بائیں طرف سے۔ وہی فقرہ پڑھا جائیگا۔ ر ب ک ف ک ب ر۔ ک ل ف ی ف ل ک

مقلوب مستوی قرآن شریف میں ہے

اس صنعت میں امیر خسروؒ کی ایک بیت بہت مشہور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ ؎

(۱) شکر بترازوے وزارت برکش — (۲) شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش

(۱) ش ک ر ب ت ر ا ز و ی و ز ا ر ت ب ر ک ش — (۲) ش و ہ م ر ہ ب ل ب ل ب ل ب ہ ر م ہ و ش

مقلوب مستوی امیر خسرو

بعض بے درد جو خود ایسی نظم کہنے سے عاجز ہیں۔ اس بیت پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ اس میں بہ تکلّف جب معنی پہناؤ۔ جب مطلب شعر کا نکلتا ہے۔ صاف نہیں ہے۔ مَیں کہتا ہوں۔ کہ گو بتکلّف معنی حاصل ہوں۔ مگر پھر بھی کمال شاعری ہے۔ دُوسرا کہنے بیٹھے جب حقیقت کھلتی ہے۔ اب ہمارے اردوئے معلّے کے خسرو معانی کی بیت فارسی دیکھئے۔ اور انصاف سے فرمایئے۔ کس قدر صاف و بامعنی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے۔ تو جب تک اُس سے کہا نہ جائے۔ کہ یہ مقلوب مستوی ہے۔ اُس کا خیال بھی شاید نہ پہنچے۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

بیت دبیرؒ

(۲)	(۱)
امید آباد بد آبادی ما	امید آشنایان شادی ما
ا م ی د ا ب ا د ب د ا ب ا د ی م ا	ا م ی د ا ش ن ا ی ا ن ش ا د ی م ا

یہ تو کلیات فارسی جناب مرحوم میں سے بیت عرض کی۔ اب اردو میں اس صنعت کو کلام مرحوم سے دکھاؤں۔ سُنا ہے۔ کہ ایک خاص مرثیہ صنائع مشکلہ میں فرمایا ہے۔ جو ابھی تک محفوظ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح سن کی زمیں ہے۔ استاذی حضرت اوج مدظلہ نے اس کتاب کی عزت بڑھانے کے لئے میری عرض کرنے پر چند بند اُس میں سے مرحمت فرمائے ہیں۔ (اس عنایت کا شکریہ نہیں ادا ہو سکتا) اُس میں سے ذیل کا بند لکھتا ہوں:۔

(۲) امام حسینؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

چلّاتے ہیں مُحرم لئے جاروب پلک کی — ہاں جھاڑو جلوہ گاہ شہ ارض و فلک کی
تسلیم کو خلق آئی ہے فردوس تلک کی — ہیں فرش سرِ راہ صفیں حور و ملک کی
آقائے اُمم عرش معلّےٰ کا شرف ہے
یہ فرش باداب۔ اک آقا کا شرف ہے (صنعت مقلوب)

(ی ہ ف ر ش ب ا د ا ب ا ک ا ق ا ک ا ش ر ف ہ ے)

یہ مصرع قلب ہونے پر جوں کا توں باقی نہیں رہتا۔ مگر ایک ایسا مصرع پیدا ہوتا ہے۔ جو معنی دیتا ہے یعنی ع یہ فرش اک آقا کا آداب شرف ہے۔ اور جب مصرع آخر الذکر کو ہم قلب کرینگے۔ تو مصرع اول الذکر ع یہ فرش باداب اک آقا کا شرف ہے پیدا ہوگا*

* جو لوگ ایسی صنعتوں کو گورکھ دھندا کہدیتے ہیں۔ وہ اگر ایسے دو چار مصرع کہدیں جب تو ہم بھی اُنکی ہاں میں ہاں ملانیکو طیار ہو جائیں۔ بلکہ مداری کا کھیل کہدیں۔ اور جب وہ ایسی صنعتیں کہنے سے عاجز ہیں۔ تو انکی یہ مثل سمجھی جائیگی کہ کھسیانے کا گھسی گرا۔ اُس نے کہا نہ تجھے اُبالا ہی بھاتا ہے۔ خود عاجز ہیں۔ اہل کمال پر فضول اعتراض کرتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) اب میں اسی مرثیۂ غیر منقسم میں سے ایک مصرع ایسا بھی پیش کرتا ہوں جس کو اُلٹنے سے وہی مصرع حاصل ہوتا ہے۔ وہ بند مندرجہ ذیل کا چھٹا مصرع ہے۔ امام حسینؑ لشکریان یزید کو (رجز میں) وعظ فرما رہے ہیں۔

دو مال رہِ حق میں یہ سودا برضا ہے | لو نقدِ عمل صاف کہ صرّاف خدا ہے
اس نقد کا سکّہ شہِ مرداں کی ولا ہے | کیا زیست کا دم بھرتے ہو اک دم میں فنا ہے

پُرزے نہ کرو مصحفِ اسلام ہمارا
آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا (مقلوب مستوی)

ارام ہ م ارا ہ ے ی ہ ا رام ہ م ارا

(۴) مقلوب کل اوّل بھی اسی کی ایک قسم ہے جس کو مقلوب مجنح بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو لفظ ایک مصرع کے اوّل یا آخر میں ہے۔ اُس کا معکوس دُوسرے مصرعوں میں ہے۔ اس صنعت میں بند مندرجہ تحت ملاحظہ فرمائیے:۔

(اُسی مرثیہ غیر منقسم میں رزم کے موقع پر کہتے ہیں)

راہ ایسی سیہ بختی لشکر سے ہوئی تار | رات ایک طرف ظلمت دوزخ تھی نگوں سار
راس آئی نہ یہ جنگ ہوئے جینے سے بیزار | راز اس میں یہ تھا تیغ گلے کا ہوئی تھی ہار

ہے صنعت مقلوب کل اوّل تو بجا ہے
آخر ولد القلب ہر اک اہل جفا ہے

× چاروں مصرعوں میں حسب ذیل الفاظ معکوس ہیں:۔

(۱) راہ کا اُلٹا ہار۔ ہار کا معکوس راہ
(۲) تار کا اُلٹا رات۔ رات کا معکوس تار
(۳) سار کا اُلٹا راس۔ راس کا معکوس سار
(۴) زار کا اُلٹا راز۔ راز کا معکوس زار

مقلوب مستوی

مقلوب کل اوّل یا مقلوب مجنح

26.4.73

ردّ العجز علے الصدر۔ یہ صنعت علم عروض کی بعض اصطلاحات سمجھنے پر سمجھ میں بخوبی آتی ہے۔ شعر کو بیت (گھر) کہتے ہیں۔ جس کے دو مصرع (کنواڑ) ہوتے ہیں۔ پہلے مصرع کے پہلے جزو کو صدر اور پچھلے (آخر) کو عروض۔ اور دُوسرے مصرع کے پہلے جزو کو ابتدا اور آخر جزو کو عجز (اور ضرب) کہتے ہیں۔ باقی جو الفاظ دونوں مصرعوں میں رہ جاتے ہیں۔ اُن کو حشو (بھرتی) کہتے ہیں۔ اب یہ بھی سمجھ لیجئے۔ کہ جو لفظ آخر مصرع میں آئیں۔ اگر وہی مصرع ثانی کے اوّل میں لائیں۔ تو اُس کو بھی ردّ العجز علے الصدر کہتے ہیں۔ (بعض کتب معانی و بیان میں اس کا نام معاد بھی ہے۔ مگر مشہور اُسی نام سے ہے) حالانکہ اس کو ردّ العجز علے الابتدا کہنا چاہئے تھا۔ مگر غالباً جو موجد اوّل نے نام رکھ دیا۔ وہی ابتک چلا آتا ہے۔ سچ ہے۔ باپ گورے بچّے کا بھی نام گلّو رکھ دے۔ تو سب کلّو ہی کلّو کہینگے۔ اور یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ آخر مصرع اوّل کے دو تین لفظوں میں سے ایک لفظ بھی دُوسرے مصرع کے شروع میں آجائیگا جب بھی یہ صنعت ردّ العجز علے الصدر کہلائیگی

اس کی مثالیں کلام دبیرؔ میں سے حسب ذیل پیش ہیں:۔

(۱) پہلوان کی لڑائی میں سے ایک بند لکھتا ہُوں۔

خنجر کو جو کاٹا تو وہ۔ ٹھہری نہ سپر پر ٹھہری نہ سپر پر تو وہ۔ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامن زیں پر
تھی دامن زیں پر۔ تو نہ مرکب تھا زمیں پر*

(۲) تین بند ذیل مسلسل امام حسینؑ کی رجز میں فرمائے ہیں۔

کوثر کی آبرو ہوں میں رضواں کی آبرو رضواں کی آبرو ہوں میں سلماں کی آبرو

*۔ الفاظ کی بندش میں کیا صفائی ہے۔ کہ تلوار گویا چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس بے تکلّفی سے کہنے پر جب شاعر قادر ہوجائے جب ایسی صنعتیں کہنے کا لطف ہے ۔ ۱۲ مؤلف۔